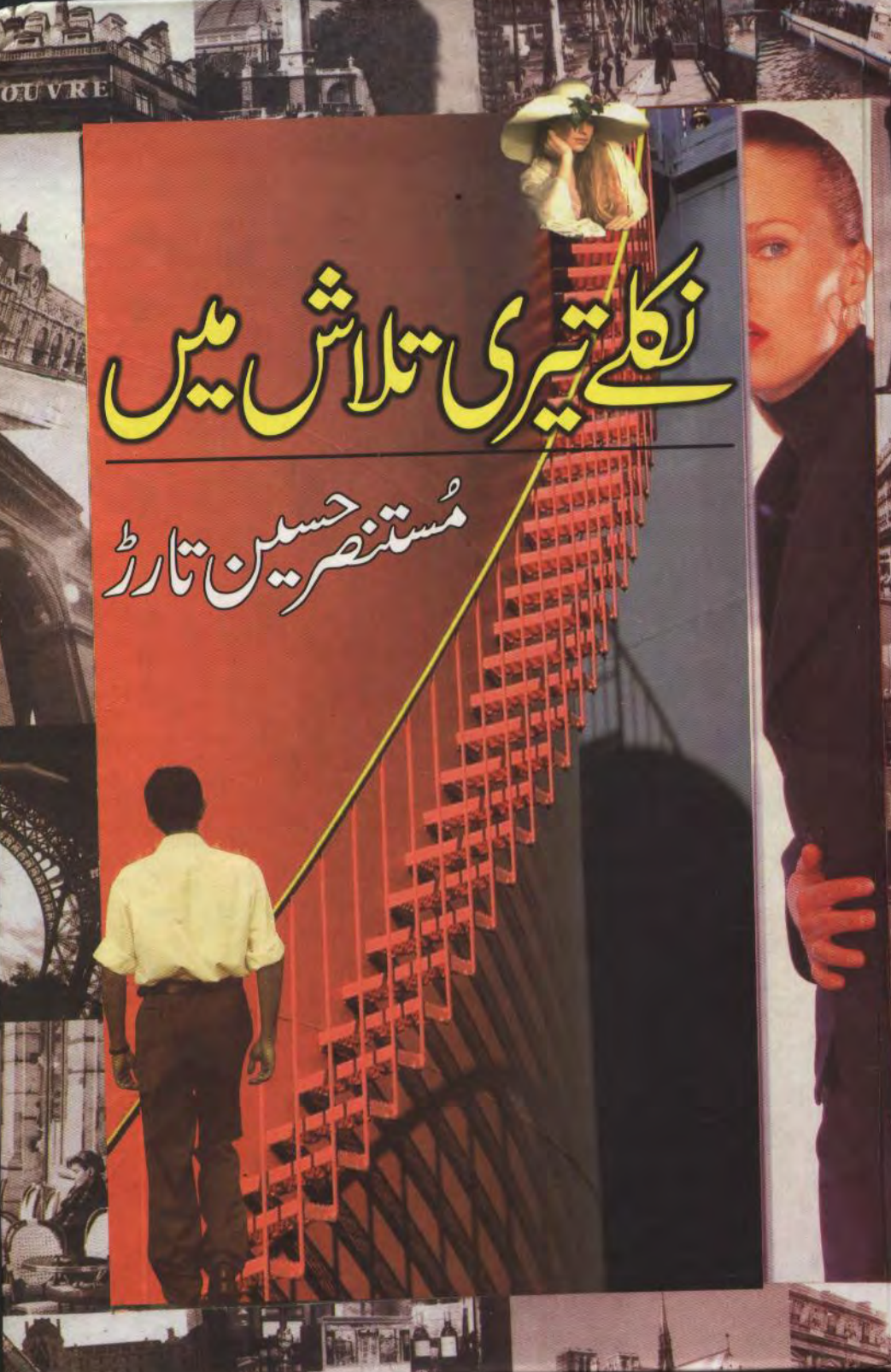


نکلے تیری تلاش میں

مُستنصر حسین تارڑ



کوئجاں وانگ مولیاں دیس چھڈے
اَساں ذات صفات تے بھیس کہیا!

(وارث شاہ)

66

80

87

94

97

103

113

119

135

ارضِ روم میں خزاں

”استانبول۔ استانبول۔“ ریلوے گاڑی ہر کیمین کے دروازے پر دستک دیتا ہوا جا رہا تھا۔ مشہور زمانہ اوریینٹ ایکسپریس انزبروک۔ لب لی آنا۔ بلغراد اور صوفیہ سے ہوتی ہوئی اب اپنے آخری سٹاف یعنی استنبول کے سٹیشن میں داخل ہو رہی تھی۔ میں یورپ میں چھ ماہ سیاحت کے بعد واپس وطن لوٹ رہا تھا۔ میری جیب میں صرف لاہور تک کا کرایہ تھا اور بس..... سوچ رہا تھا، کسٹم سے جلد فراغت ہو جائے تو فوراً ارضِ روم جانے والی گاڑی پکڑ لوں۔ وہاں سے سرحد پار ایران ہے اور پھر افغانستان اور آخر میں میرا پیارا ملک پاکستان جسے دیکھنے کے لیے اب میں ترس گیا تھا۔

کسٹم روم میں پہنچے تو آفیسر نے حکم دیا۔ ”اپنا تمام سامان کھول دو۔“

”میرے پاس دو کیمروں اور چند کپڑوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔“

”میرا وقت ضائع نہ کرو اور تمام سامان کھول دو۔“

اُس نے میرے سوٹ کیس کا ڈھکنا اٹھا کر اس میں یوں سردے دیا جیسے وہ ایئر کنڈیشنڈ ہوا اور باہر کڑا کے کی گرمی پڑ رہی ہے۔

”ہا!“ اُس نے فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ ”لڑکیوں کے کپڑے۔“

”بھائی یہ میری چھوٹی بہنوں کے لیے ہیں۔“ میں نے لجاجت سے کہا۔

”ان کی اجازت نہیں۔“ اس نے کپڑوں کی ایک گٹھڑی بنا کر اپنے پاس رکھ لی اور

مجھے رسید لکھ دی۔ میرے کچھ پلے نہ پڑا کہ کپڑے ضبط ہو گئے ہیں یا ان پر کسٹم ادا کرنا ہوگا۔

”جناب میں اس رسید کا کیا کروں؟“ میں نے نہایت مسکین شکل بنا کر پوچھا۔ مجھے رہ کر اپنے لگے بندھے پیسوں کا خیال آ رہا تھا۔ اگر یہاں ایک دو دن بھی رہنا پڑ گیا تو واپسی کے بجٹ کا ناس ہو جائے گا اور میں لاہور پہنچنے کی بجائے یورپی پیسوں کی طرح تبریز کے بازاروں میں بھیک مانگتا پھروں گا۔

”کل آؤ۔“ کسٹم آفیسر اب ایک پتی کی جامہ تلاشی لے رہا تھا۔

”لیکن میری گاڑی آدھ گھنٹے بعد جا رہی ہے اور میرے پاس پیسے۔۔۔۔۔“

”کل۔“ اس نے گرج کر کہا۔

کل آیا تو کوئی قومی تعطیل تھی۔ تین چار روز خوار ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ کسٹم ان چار کپڑوں کو بذریعہ ریل ارض روم روانہ کرے گا اور وہاں سے ایران کی سرحد تک کسٹم کا ”معمور“ مجھے چھوڑنے جائے گا۔ مجبوری ہے، قانون یہی کہتا ہے۔ اس سے قبل سیاح یورپ سے مختلف اشیاء خصوصاً زنانہ کپڑے لاکر ترکی میں بیچ دیتے تھے اور دام کھرے کر کے سرحد پار کر جاتے تھے۔ چنانچہ اس کی روک تھام کے لیے یہ قانون بنا دیا گیا۔ پہلے ارادہ کیا کہ سب کچھ چھوڑ کر وطن کا رخ کروں، راستے میں پیسے ختم ہو گئے تو پھر کیا ہوگا؟ ساتھ ہی اپنی بہنوں کے گول مٹول چہرے یاد آ جاتے کہ وہ منہ اٹھا کر پہلے میرا اور پھر اپنے ولایتی کپڑوں کا انتظار کر رہی ہوں گی۔ ان کے لٹکے ہوئے چہرے کون دیکھے!

میں نے کپڑوں کا کرایہ ادا کیا اور رسید لے کر ہوٹل آ گیا۔ سامان باندھا اور سیدھا سٹیشن کی طرف چل دیا۔ پُل غلط کے اس طرف بسوں کا اڈہ تھا۔ ارض روم تک بس اور ریل کے کرائے میں خاصا فرق تھا۔ میں نے اپنی باقی ماندہ پونجی کا حساب کیا اور کنڈیکٹر سے پوچھا: ”ارض روم؟“ کہنے لگا: ”بالکل ڈائریکٹ۔ تمام رات سفر کر کے صبح انقرہ، کل شام ترازان۔ وہاں شب ببری کے بعد پرسوں شام ہم ارض روم پہنچ جائیں گے۔“

میں ٹکٹ خرید کر بس میں سوار ہو گیا۔ پہلے میٹھی گولیاں بیچنے والا آیا، پھر اخبار والا۔ اس کے بعد ایک تنکھی موٹھیوں والا سمارٹ سانو جوان بس کے اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سوٹ پیس تھا۔

”حضرات!“ اس نے مسافروں کو مخاطب کر کے بڑی سنجیدگی سے کہا: ”میں کپڑا بیچنے

والا نہیں ہوں۔ ابھی ابھی مجھے ایک فرانسیسی سیاح ملا تھا۔ بچارے کی جیب کٹ گئی تھی۔ مجھ سے اس کی حالت زار دیکھی نہ گئی اور صرف انسانی ہمدردی کے تحت اس سے یہ نہایت ہی نفیس اور سو فی صد خالص اونی سوٹ صرف دو سو لیرے میں خرید لیا۔ چونکہ مجھے اس کی ضرورت نہیں، اس لیے جن صاحب کو درکار ہو، وہ خرید لیں۔ میں منافع نہیں لے رہا ہوں۔“ اس نے سوٹ کو گال سے لگا کر گڑا۔ ”بالکل نرم اور سو فی صد خالص اونی۔“ مجھ سے اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے مسافر نے کپڑے کو چھوا اور نہایت تحارت سے بولا: ”اونہ! سو فی صد اونی۔ بہت خوب، یہ تو مکسڈ ہے۔“ موٹھیوں والے کو غصہ آ گیا: ”آپ میری بے عزتی کر رہے ہیں۔ میں نے صرف جذبہ ہمدردی کی خاطر اسے خریدا ہے۔“

”اونہ! جذبہ ہمدردی۔ اگر تم میں اتنا ہی جذبہ ہے تو میری مدد کرو اور سوٹ پچاس لیرے میں فروخت کر دو۔ آخر ایک فرانسیسی کے مقابلے میں ایک ترک تمہاری ہمدردی کا زیادہ حقدار ہے۔“ مسافر نے باقی لوگوں کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھا۔ کچھ لوگ ہنسنے لگے۔ میرے ساتھ بیٹھا ہوا موٹا آدمی کہنے لگا: ”جذبہ ہمدردی کی بات کر کے پھنس گیا ہے۔“

موٹھیوں والا اس دوران مراقبے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور بڑی سنجیدگی سے اس مسافر سے کہنے لگا: ”مجھے میری ماں نے نہیں جنا اگر یہ سوٹ میں پچاس لیرے میں ہی فروخت نہ کروں۔“ مسافر کا ہاتھ فوراً اپنی جیب میں گیا لیکن اس سے قبل کہ وہ رقم نکالے، موٹھیوں والے نے گرج کر کہا: ”لیکن تمہارے ہاتھ فروخت نہیں کروں گا کیونکہ تم نے جذبہ ہمدردی کی تضحیک کی ہے۔“ مسافر نے جھٹ ساتھ بیٹھے ترک دیہاتی سے کہا: ”کم بخت پھنس گیا ہے۔ فوراً سوٹ خرید لو۔ اس کے بس سے باہر قدم رکھتے ہی میں تمہیں دس لیرے زائد ادا کر کے یہ سوٹ لے لوں گا۔“

دیہاتی نے جو اب تک منہ کھولے یہ تماشا بڑے غور سے دیکھ رہا تھا، فوراً جیب سے پچاس لیرے نکالے اور سوٹ خرید لیا۔ بیٹھے بٹھائے دس لیرے بنا لینے میں آخر کیا حرج ہے۔ ہر ایک سوٹ کو نہایت غور سے دیکھ رہا تھا۔ ساتھ والے موٹے آدمی نے کپڑے کو ناک سے رگڑا اور پھر انگلیوں میں مسل کر کہنے لگا: ”سو فی صد اونی! یہ تو نر اسوتی کپڑا ہے۔ بیس لیرے کا بھی نہ ہوگا۔ کہاں گیا وہ مسافر؟“ اس کی سیٹ خالی تھی۔ معلوم ہوا کہ دونوں ساتھی تھے اور سب کو بے وقوف بنا گئے ہیں۔

بس کا وقت روانگی تین بجے تھا، لہذا پورے چھ بجے چلی اور سیدھی باسفورس میں ٹھہرے ہوئے سینٹر میں گھس گئی۔ ہم یورپ سے ایشیا جا رہے تھے۔ بدیس سے دیس۔ صبح کے دھندلکے میں انقرہ آیا۔ دوسرے روز بحیرہ اسود کے کنارے سمسن اور اسی شام ترازان جو ایشیائے کوچک میں یونانی سلطنت کا آخری حصار تھا۔ اسی جگہ یونانی دیو بالا کا ہیرو جیسٹن اپنے ساتھیوں سمیت آگوجہاں میں لنگر انداز ہوا تھا۔ وہ ”سنہری کھال“ کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ پرانی سرخ چھتیں، تنگ گلیاں، باغات جن میں انار کے شگوفے کھلے ہوئے ہیں، سارے شہر کا رنگ شوخ سرخ اور نیلگوں بحیرہ اسود۔ رنگوں کا حسین امتزاج۔ پرے سرسبز پہاڑ تھا جہاں یونانی ایکسٹانفون اپنی دس ہزار فوج سمیت خیمہ انداز ہوا تھا۔ ارد گرد کے جنگل میں شہد کی بہتات تھی۔ چنانچہ اکثر سپاہی کچھ زیادہ ہی کھا گئے اور اپنے حواس کھو بیٹھے۔ ترازان میں پیسوں کی کمی کے باعث رات بحیرہ اسود کے کنارے چھپروں کے ایک ویران جھونپڑے میں گزری اور دوسری صبح اسی بس سے میں ارض روم کے لیے روانہ ہو گیا۔

بس گیلی سڑک پر پھسلتی چلی جا رہی تھی۔ موڑ اور کھائیاں، اتھاہ گہرائی اور پھر پرے وادی میں بل کھاتی ندی، پارے کی سفید لکیر، صاف شفاف اور خشک پانی، ہلکی بارش اور دھند، خشکی اور سبزہ۔ ہمیں ”ترازان“ چھوڑے دو گھنٹے ہو چکے تھے لیکن بحیرہ اسود کی سیلی خوشبو ابھی تک فضا میں بسی ہوئی تھی۔ ندی کے کنارے سفید بھٹریں برف کے گالوں کی طرح لڑھک رہی تھیں۔ چرواہے نے بارش سے بچنے کے لیے اپنا بوسیدہ کوٹ سر پر کھسکا لیا اور سوچا، اب کے ندی میں ضرور طغیانی آئے گی۔

ڈرائیور نے سینٹرنگ سے ملحقہ خانے سے ایک بوتل نکالی اور سڑک پر سے نظریں ہٹائے بغیر پیچھے بیٹھے ہوئے مسافر کو تھادی۔ بوتل مجھ تک پہنچی تو اس میں تھوڑا سا لیموں کا پانی ابھی باقی تھا جسے میں نے ہتھیلی پر انڈیل کر منہ پرل لیا۔ ترکی کی بسوں میں لیموں کا پانی اس وقت مہیا کیا جاتا ہے جب پہاڑی راستے کے سفر کے دوران مسافروں کی طبیعت خراب ہونے کا احتمال ہو اور ہم پچھلے ایک گھنٹے سے درہ ذی بانا میں گزر رہے تھے۔

میں خشکی اور سمندر کے راستے ہزاروں میل کی مسافت کے بعد اب وطن واپس جا رہا تھا۔ سیاح کی واپسی! مجھے ڈر سا لگ رہا تھا۔ میرے ذہن میں عجیب عجیب وسوسے جنم لے

رہے تھے۔ یہ بس اگر ساڑھے چھ ہزار فٹ بلند درہ ذی بانا کے کسی موڑ پر گھومنے کی بجائے سیدھی چلی جائے تو؟ سیاح ہو کر ڈرتے ہو، میں نے اپنے آپ کو ملامت کی۔ اتنے ہی دلیر تھے تو وہاں مال روڈ کے کسی خوبصورت ریسٹوران میں بیٹھ کر چائے پیتے۔ باسی پیٹریاں کھاتے اور بڑی ہی محفوظ قسم کی زندگی گزارتے۔ یہاں کیا کر رہے ہو؟ اور پھر اب تو تم افق کے اس پار تک ہو آئے۔ سینکڑوں جگہ سورج ابھرا اور ڈوبا۔ کبھی برف پوش چوٹیوں کو منور کر کے، کبھی چٹیل میدانوں میں شفق کی سرخ چادر بچھا کے اور کبھی کالے بھور جنگلوں میں کرچی رنگ بھر کر۔

بس نے ایک نرخطر موڑ کاٹا اور میرے ذہن میں پھر وسوسوں کے زہریلے ناگوں کے پھن لہرانے لگے جنہیں میں اپنے سفر کے دوران کہیں بھی کچلنے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ اگر یہاں کوئی حادثہ ہو جائے تو؟ افغانستان کے صحراؤں میں بھی تو ایک حادثہ ہوا تھا۔ سڑک کے نیچے ریت پر بس اونڈھی پڑی تھی اور کچھ دور ہلاک ہونے والوں کے لاشے پڑے تھے۔ ان میں زیادہ تر یورپی سیاح تھے جنہیں موت ان ویرانوں میں کھینچ لائی تھی۔ کیا مجھے بھی موت ترکی کے ان پہاڑوں میں کھینچ لائی تھی! میں بھی اگر اس اجنبی دیس میں مر جاؤں تو؟ میری ماں تو وہاں باورچی خانے میں بیٹھی مر جائے گی اور میرا باپ..... وہ مجھ تک کیسے پہنچیں گے؟ میرا سر چکرانے لگا اور مجھ پر غنودگی طاری ہو گئی۔ ”کیسے پہنچیں گے؟ کیسے پہنچیں گے؟“ میرے خوابیدہ ذہن نے بار بار درہایا اور پھر میرا واہمہ ایک بھیانک قتل کے روپ میں میرے ذہن میں ابھرنے لگا۔ میری بس کا حادثہ ہو چکا ہے اور میرے ماں باپ سفر کی سختیاں جھیلتے ہوئے پاکستان سے ترکی آرہے ہیں۔

سڑک بالکل سیدھی اور سہل تھی۔ بس دو پہر کی گرم ہوا کو چیرتی، چھوٹے بچے کی طرح غوغاں کرتی جا رہی تھی۔ باپ کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ سفید بال، تنومند جسم، سرخ و سپید چہرہ جس پر عمر صرف چند جھریوں کی صورت میں اثر انداز ہوئی تھی۔ ماں..... مشرقی اقدار کی پابند ایک عورت جس نے اب تک گھر سے باہر قدم نہیں رکھا تھا۔ سفید چادر میں ملبوس، خاموش۔ دونوں میاں بیوی چپ چاپ سڑک کی طرف دیکھ رہے تھے جو بس کے بانٹ کے اندر دفن ہو کر ان کا سفر کم کر رہی تھی۔ بس میں اور بھی مسافر تھے جن کی موجودگی ان کے لیے نہ ہونے

کے برابر تھی۔ اجنبی زبان اور اجنبی چہرے۔

بس کابل سے ہرات جا رہی تھی۔ غزنی کے دوسری طرف سڑک پر ایک سفید فام سیاح ہاتھ بڑھائے کھڑا تھا۔ بال بڑھے ہوئے، کپڑے میلے چمکے، کاندھے پر سامان کا تھیلا لیکن آنکھوں میں چمک۔ ڈرائیور نے بریک پر پاؤں رکھا اور اس سے چند گز ادھر ہی بس کو روک لیا۔ وہ بھاگا آیا اور سامان کا تھیلا کھڑکی کے راستے اندر پھینک کر پھرتی سے بس میں سوار ہو گیا۔

”کہاں جاؤ گے؟“ کنڈکٹر نے اس کے میلے کپڑوں کو دیکھ کر ناک سکیڑتے ہوئے پوچھا۔

”تم کہاں جاؤ گے؟“ اس نے کنڈکٹر کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے عجب شان بے نیازی سے کہا۔

”ہرات۔“

”تو پھر میں بھی ہرات ہی جاؤں گا۔“ ٹکٹ خرید کر اس نے جیب سے نقشہ نکالا اور اپنا روٹ دیکھنے میں لگن ہو گیا۔

ماں کی نظریں اس پر لگی تھیں۔ اس کے چہرے کی اضطرابی کیفیت اور آنکھوں کی چمک نے اسے بہت کچھ یاد دلایا تھا۔ ہاں اسے بھی تو یونہی گھومنے کا شوق تھا۔ وہ کہا کرتا تھا: ”ماں جب اللہ میاں نے مجھے بنایا تھا..... تو میرے خمیر میں جنون اور آوارگی کچھ زیادہ ہی بھری تھی۔ بس مجھے وہ جنون ہی چین نہیں لینے دیتا۔ میرے پاؤں ایک ہی جگہ رہنے سے زمین میں دھنس جاتے ہیں..... مجھے دل دلیس پسند نہیں۔“ اور میں کہتی: ”بیٹے تمہارے دوسرے دوست بھی تو ہیں! کتنی کامیاب زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کو ایسا کیوں محسوس نہیں ہوتا؟“

وہ ناراض ہو کر کہتا: ”امی جان یہ سب تو کنویں کے مینڈک ہیں۔ صبح کام پر گئے، شام مال روڈ کے بے مقصد چکر لگائے اور گھر آ کر ٹیلی ویژن کے سامنے اوگھتے رہے۔ بس یہ ہے آپ کی کامیاب زندگی۔ دنیا بہت وسیع ہے امی! اپنے آپ کو ایک کونے میں نہتی کر لینا کہاں کی کامیابی ہے۔“

بس ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ ڈرائیور نے باہر نکل کر سرسری طور پر انجن کا معائنہ کیا۔ ”بس خراب ہو گئی ہے، آگے نہیں جاسکتی۔“ یہ کہہ کر اس نے شلوار کے نیپے سے ایک سگریٹ

نکالا اور سگاکر زمین پر ایسے بیٹھ گیا جیسے اس کا اس بس سے کبھی کوئی تعلق نہ رہا ہو۔ ایک مسافر نے چھت پر چڑھ کر سامان اتارنا شروع کر دیا۔ ان دونوں کا فقط ایک ہی سوٹ کیس تھا۔ وزنی اور بے جان جیسے پتھر کا ہو۔

مرد پہلے تو سوٹ کیس کا بندھے پر رکھ کر چلتا رہا مگر تھوڑی دور چلنے کے بعد اس کی ہمت جواب دے گئی اور اس نے اسے ہینڈل سے پکڑ کر اپنے پیچھے گھینٹنا شروع کر دیا۔ اس سے کچھ فاصلے پر عورت چل رہی تھی۔ ہوا کچھ تیز ہو چلی تھی اور ساتھ ریت بھی اڑ رہی تھی۔ کانٹے دار جھاڑیاں غباروں کی طرح ادھر ادھر اُچھل رہی تھیں۔ عورت کی سفید چادر ہوا میں پھڑ پھڑا رہی تھی۔ کفن میلا ہو چلا تھا۔ تھوڑی دیر میں ساری فضا ریت آلود ہو چکی تھی۔ بیابانی، ریت اور تیز ہوا میں اڑتی ہوئی جھاڑیاں۔ اس ویرانی میں دو پیکر، مرد عیسے کی طرح اپنی صلیب گھینٹتا ہوا اور عورت بین کرتی مریم۔

مرد کے چہرے پر ریت کے ذرے اور پسینے کے قطرے بھریوں کو بھر رہے تھے۔ میں اسے کہتا تھا: ”بیٹا تم میں بڑا بننے کی خواہش نہیں ہے۔ تم ایک اچھی کتاب پڑھ لیتے ہو تو سمجھتے ہو کہ دنیا مل گئی۔ تمہاری آنکھیں افق کے اس پار ہی دیکھتی ہیں مگر تمہیں اپنے گرد و پیش کی خبر نہیں ہوتی۔ پڑھنا لکھنا اور صرف آوارہ گردی تو کوئی بات نہ ہوئی۔“

وہ کہتا: ”ابا جان آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ مجھ میں بڑا بننے کی خواہش ہے لیکن یہ بڑائی میرے دل میں ہے، میرے احساس میں ہے۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں؟“ مرد کی آنکھیں ڈبڈب آئیں۔ ہاں وہ لاکھوں میں ایک تھا۔ میرا بیٹا، میرا دوست اور پھر میں اسے کہتا: ”بیٹے، باہر کی دنیا خطرات سے پُر ہے۔ تم انجانے صحراؤں کو ناپو گے، اجنبی شہروں میں گھومو گے۔ خدا نخواستہ اگر کوئی حادثہ ہو جائے تو.....“

”ادھنہ حادثہ!“ وہ مسکرا کر کہتا: ”ابا جان حادثہ کہاں نہیں ہو سکتا۔ یہیں ہمارے گھر کے سامنے سڑک پار کرتے وقت بھی تو ہو سکتا ہے۔“

لیکن وہ حادثہ وہاں گھر کے سامنے سڑک پر نہ ہوا بلکہ ترکی میں ترازان اور اراض روم کے درمیان ذی ہانا پاس کی بل کھاتی ہوئی سڑک پر ہو گیا۔

ترکی سفارت خانے کے نمائندے کو وہ گھر ڈھونڈنے میں بالکل وقت نہ ہوئی۔

پاسپورٹ پر پورا پتہ درج تھا۔ ان دنوں گھر میں سب لوگ بڑی بے تابی سے اس کی واپسی کے منتظر تھے۔ دستک ہوئی تو ماں نے میلے کپڑوں کا ڈھیر ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا: ”تمہارے بھائی جان آ گئے۔“ ایک پیاری سی گڑیا پچھلے کمرے سے نکلی، صحن کو پھلانگی لپک کر دروازے تک پہنچی اور ٹھٹک کر واپس آ گئی: ”ماں، دروازے پر کوئی انگریز کھڑا ہے۔“

ماں نے انگلی پر سے اپنی سفید چادر اتاری اور سر پر اوڑھ کر دروازے کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔

”میں ترکی کے سفارت خانے کی طرف سے آیا ہوں۔“ اس انگریز نے نظریں جھکا کر کہا: ”مجھ پر ایک ناگوار ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ کا لڑکا ترکی میں ارض روم کے قریب بس کے حادثے میں ہلاک ہو گیا ہے۔ میری ساری ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔ یہ رہا اس کا پاسپورٹ اور سامان کی رسید جو آپ سفارت خانے سے حاصل کر سکتے ہیں۔“

بھائی جان نہیں آئے تھے۔

اگر وہ گھر کے سامنے سڑک پار کرتے ہوئے مرتا تو میرے پاس ہوتا۔ میں اس کا منہ دیکھ لیتی۔ اس کے بین تو کرتی اور اب..... پولیس آئی ہوگی پاسپورٹ لے کر، اسے لاوارث قرار دے کر وہیں کہیں دفن کر دیا ہوگا۔ اس کا بیٹا جسے اس کی ایک پڑھی لکھی سہیلی نے یونانی دیوتا سے تشبیہ دی تھی۔ وہ تھا بھی خوبصورت، ستواں ناک، بڑی سی آنکھیں، پتلے ہونٹ، مردانگی کا بھرپور انگ۔ شاید اسی لیے وہ واپس چلا گیا۔ اس کے اندر جو دیوتا تھا، وہ اسے وہیں لے گیا جہاں کسی زمانے میں دیوتا بستے تھے۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد انہیں ایک اور بس مل گئی۔ سفر جاری رہا۔ ہرات، مشهد، تہران اور اب وہ ایران اور ترکی کی سرحد پر تھے۔ کسٹم آفیسر نے ان کے پاسپورٹ چیک کئے اور فارم دیا۔ ”مہربانی کر کے اس پر اپنے سامان کی تفصیل درج کر دیجئے۔“

مرد نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے فارم پُر کر دیا۔ آفیسر نے کاغذ پر نگاہ ڈالی اور پھر دونوں کو شک کی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا: ”بس..... پتھر کی ایک رسل۔ کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟“

عورت نے سوٹ کیس کھولا۔ سفید سنگ مرمر کی ایک رسل۔

”اس کو باہر نکال کر دکھائیے۔“

رسل کے ایک طرف عربی رسم الخط میں کچھ تحریر تھا۔ آفیسر نے منہ بنالیا۔ جانے کیا چیز اٹھائے پھر رہے ہیں۔ اس نے انہیں ایک اور فارم دیا: ”مجبوری ہے صرف کاغذی کارروائی۔ آپ اس فارم پر حلفیہ طور پر لکھ دیں کہ آپ اس سامان..... اس پتھر کی رسل کو ترکی میں فروخت نہیں کریں گے۔ یہ لازمی ہے۔“

”میں اپنے بیٹے کی قبر کا کتبہ بیچوں گی؟“ عورت نے دکھ سے کہا۔

”تم خاموش رہو۔“ مرد کے لہجے میں تھکاوٹ تھی۔ ”آفیسر ہم اس کو فروخت نہیں کریں گے لیکن یہ آپ کی سر زمین میں ہی رہے گا۔ ہم تو آئے ہی اس لیے ہیں۔ ہم اسے بڑی دور سے لائے ہیں۔ وہاں سرکلر روڈ پر دکائیں ہیں۔ میں نے اپنے نئے گھر کی تختی بھی وہیں سے بنوائی تھی اور پھر یہ کتبہ بھی۔ دونوں پر ایک ہی نام ہے۔ ہم بہت تھک چکے ہیں۔“

کسٹم آفیسر خاموش کھڑا تھا: ”ارض روم جانے والی بس آپ کو گیٹ کے باہر ملے گی۔“

انہیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ مری سے تنہا گلی جا رہے ہوں۔ پُرچ سڑک، ہوا میں خنکی اور نیچے وادی میں سبزے کی تہیں۔ پہاڑیوں پر بکھرے ہوئے یونانی کلیسا اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ پچھلے زمانوں میں یہاں یونانیوں کی حکومت تھی۔ یونانی جو دیوتاؤں کے پجاری تھے۔

”ہاں ابھی ایک ماہ بھی نہیں ہوا۔“ ڈرائیور نے استفسار پر بتایا۔ ”مجھے یاد ہے، حادثہ یہاں سے چند میل کے فاصلے پر ہوا تھا۔ اس روز ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اور دھند بھی تھی۔ ایک موٹر پر بس سیدی گھرے کھڈ میں جا گری۔ خدا کا شکر ہے کہ تمام مسافر بچ گئے صرف ایک سیاح ہلاک ہوا تھا۔ اللہ معافی دے۔“ اور ساتھ ہی اس نے اگلے خانے سے ایک بوتل نکال کر منہ کو لگالی۔

اس کا آخری خط استنبول سے آیا تھا: ”دیکھا امی حضور! آپ تو خواہ مخواہ فکر کرتی تھیں۔ میں آدمی دنیا گھوم آیا اور کہیں خراش تک نہیں آئی۔ اب تو آپ کے اور میرے درمیان صرف ایک ملک رہ گیا ہے۔ میرا انتظار شروع کر دیجئے۔ وہ ایک ملک درمیان میں ہی رہا۔ وہ تو میرے پاس نہ آیا۔ مجھے ہی اس کے پاس جانا پڑ گیا۔“

”پاشا“ ڈرائیور نے مرد سے مخاطب ہو کر کہا: ”یہاں سے وہ بس نیچے گری تھی۔“

”بھائی بس یہیں روک لینا۔“ مرد نے سیٹ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”لیکن بس یہاں تو نہیں رکتی۔“

”ہماری بس یہیں رکتی ہے۔“ اس نے سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے کہا: ”اس ہلاک

ہونے والے سیاح کی قبر کہاں پر ہے؟“

”وہ نیچے۔ اس ندی کے کنارے لیکن آپ کیوں پوچھتے ہیں؟“

”ہمیں ملاقات کے لیے جانا ہے۔“

عورت اور مرد نے گھائی سے نیچے اترنا شروع کر دیا۔ وہ بڑی تیزی سے اتر رہے تھے اور جلد ہی ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ مرد نے سوٹ کیس کا ندھے سے اتار کر نیچے رکھ دیا اور گردو نواح کا جائزہ لیا۔ کچھ دور پر برف کے گالوں ایسی سفید بھڑیں ندی کے کنارے چر رہی تھیں اور ان کے پاس کھڑا چرواہا دونوں کی طرف شک کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے پاس چلے گئے اور پوچھا: ”بھائی یہاں ایک ماہ قبل ایک حادثہ ہوا تھا بس کا؟“ چرواہے نے سر ہلادیا۔

”اس میں ایک سیاح بھی ہلاک ہوا تھا۔“ چرواہے نے سر زور سے ہلایا۔

مرد نے دونوں ہتھیلیوں کا پیالا سا بنا کر پوچھا: ”اس کی قبر تھی۔ تمہیں معلوم ہے کہاں

ہے؟“

”قبر۔ ہاں تھی۔ پچھلے دنوں اس وادی میں سیلاب آیا تو بہہ گئی۔ اس جگہ پر تو اب یہ ندی

بہتی ہے۔“

”بہہ گئی!“ عورت نے ہسٹریائی ہو کر کہا: ”لیکن میانی صاحب میں تو اتنی ساری

قبریں ہیں، ان کو کچھ نہیں ہوتا اور اس پوری وادی میں صرف ایک قبر بہہ گئی۔“

”تم خاموش رہو۔“ مرد نے آہستہ سے کہا اور ساتھ ہی سوٹ کیس کھولا، پتھر کی سل

باہر نکالی اور اسے سیدھا کر کے ندی کے درمیان میں پھینک دیا: ”اس کی قبر بہہ نہیں گئی۔ ندی اس کی قبر ہے۔“

سل پر خنک اور شفاف پانی بہہ رہا تھا۔ ندی میں ہمیشہ پانی بدلتا رہتا ہے۔ ایک دفعہ جو پانی گزر جائے دوبارہ نہیں گزرتا۔ اس کی جگہ نیا پانی لے لیتا ہے۔

”اس کی جگہ نیا پانی لے لیتا ہے۔ اس کی جگہ۔۔۔۔۔“ میرے نیم خوابیدہ ذہن نے دہرایا۔

میں نے ایک ٹھہر جھری لی۔ توبہ توبہ میں بھی کتنا بزدل ہوں۔ خدا نہ کرے میرے عمر

رسیدہ ماں باپ میری قبر کا کتبہ اٹھائے یوں ٹھوکریں کھاتے پھریں۔ یہ سب وابہ ہیں۔ میں نے

اپنے آپ کو تسلی دی اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ نیند کا اثر زائل ہو چکا تھا۔

ڈرائیور نے اب گنگنانا شروع کر دیا تھا۔ ہم دڑوں اور گھائیوں سے نکل کر میدانی

علاقے میں آ چکے تھے۔ بس کی رفتار بھی اب قدرے تیز ہو چلی تھی۔ میرے ساتھ والی سیٹ پر

ایک درمیانی عمر کا موٹا جرمن بیٹھا تھا۔ تانبے کے پتلے فریم کی عینک لگائے، ہاتھ میں ”تاریخ ایشیا

کوچک“ کی ایک ضخیم کتاب۔ ”جس خطے سے ہم گزر رہے ہیں، یہاں تاریخ بکھری پڑی ہے۔“

دبیزیشیوں کے پیچھے اس کی نیلی آنکھیں چمک رہی تھیں: ”قدیم یونانی سلطنت کی سرحدیں یہاں

تک تھیں۔ سلجوق سلطان الپ ارسلان نے انہی وادیوں میں یونانیوں کے دانت کھٹے کیے۔

سلطان محمد ثانی نے ترابزان کا محاصرہ کیا تو شہنشاہ ترابزان داؤد کو پیغام بھیجا کہ بھائی دو ہی راستے

ہیں یا اپنی سلطنت ہمارے حوالے کر دو اور اپنی جان و مال بچا لو یا سلطنت کے ساتھ جان و مال سے

بھی ہاتھ دھو بیٹھو۔ داؤد سیانا تھا۔ اس نے پہلی تجویز قبول کر لی۔ شہر سلطان کے حوالے کر دیا اور اپنا

خزانہ سمیٹ کر رومانیہ چلا گیا جہاں سلطان نے اسے ایک قلعہ الاٹ کر دیا۔ ترابزان شاہ راہ ابریشم

کا آخری شہر تھا۔ وہ چھوٹی سی چمکتی ہوئی ندی دریائے فرات ہے جس کا منبع انہی پہاڑوں میں

واقع ہے۔ معاف کیجیے گا۔ آپ بورتو نہیں ہو رہے؟“ اس نے کتاب بند کرتے ہوئے پوچھا۔

”جی بالکل نہیں۔ آپ بیان جاری رکھیے۔“ آدمی دلچسپ معلوم ہوتا تھا۔

”میں نے جرمنی سے استنبول تک تو ریل میں سفر کیا اور وہاں سے ترابزان تک بحری

جہاز میں آیا۔ بڑا دلچسپ سفر تھا۔ آپ کو شاید معلوم ہو (میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی) کہ مارکو پولو

چین کی سیاحت کے بعد ترابزان سے ہی وینس کے لیے سدھارا تھا۔ وہ شہنشاہ چین کے حکم سے

شہزادی کو خاتون کو ایران لایا تھا جہاں شاہ ایران اس سے شادی کے منتظر تھے لیکن سفر نے طوالت

اختیار کر لی اور کو خاتون ایران پہنچی تو شاہ ایران انتقال فرما چکے تھے اور اب ان کا بیٹا تخت نشین تھا۔

بہر حال شہزادی کو واپس چین بھجوانے کی بجائے چھوٹے شاہ صاحب نے خود ہی شادی رچا لی۔

شاہ جی منگول نسل کے تھے اور ان دنوں ایران میں خالص منگول نسل شہزادیاں نایاب تھیں۔ مارکو پولو کو انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ شام کا راستہ چونکہ ڈاکوؤں سے انا پڑا تھا، اس لیے مارکو پولو سیدھا ترازان آیا اور بحری جہاز کے ذریعے اپنے وطن وینس چلا گیا۔ ترازان کی جس سرائے میں مارکو پولو نے قیام کیا، اس کے کھنڈرات اب بھی موجود ہیں۔ معاف کیجیے گا، میں واقعی باتیں زیادہ کر رہا ہوں۔“ اس نے جیب سے رومال نکال کر عینک کے شیشے صاف کئے اور عینک دوبارہ لگالی۔

”میں تو تہران تک جا رہا ہوں، آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”میں جانیں آ رہا ہوں۔ میرے اور میرے گھر کے درمیان صرف ایک ملک رہ گیا۔ وہاں کبھی میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں تھک گیا ہوں۔ مجھے سفر سے نفرت ہو گئی ہے۔ اب ساری عمر گھر سے باہر قدم نہیں رکھوں گا۔“

”ہاں۔“ جرمن مسکرا کر بولا۔ ”گھر واپس آنا ہمیشہ خوبصورت ہوتا ہے لیکن تمہارے یہ احساسات عارضی ہیں۔ سفر کے اختتام پر ہمیشہ تھکاوٹ کا احساس ہوتا ہے۔ آج سے چند ماہ بعد جب تم پھر دنیا کے جھیلوں میں پڑ جاؤ گے تو یہی لمحے تمہیں حسین لگیں گے اور پھر سفر تو دیوانگی ہوتی ہے۔ فصل گُل آتے ہی غود کر آتی ہے۔ مجھے دیکھو بوڑھا ہو چلا ہوں لیکن دیوانگی نہیں جاتی۔ میرے بچے مذاق اڑاتے ہیں۔ کہتے ہیں اچھا تو پھر ڈیڈی سنا ہے مشرق بڑا پراسرار ہے۔ ہر جگہ جیب کٹ جاتی ہے۔ مکھیوں کی بہتات ہوتی ہے اور لوگ حشیش بیچ کر گزارہ کرتے ہیں۔ سفر میں صعوبتیں تو ہوتی ہی ہیں لیکن ہماری نئی نسل ایک بہتر گھر اور بہتر کار سے پرے تو کچھ سوچ ہی نہیں سکتی۔ ارض روم آنے والا ہے، میں ذرا اپنا کیمرا اور کتابیں وغیرہ سنبھال لوں۔ جنگ کی طرح سفر سے قبل بھی مطالعہ نہایت ضروری ہے۔“

شام کے دھندلے اور بارش کے باوجود ارض روم کے قدیم مکانوں کی دیدہ زیب سرخ چھتیں چمک رہی تھیں۔ شیفٹہ مدرسے کے دو مینار دُھند میں بھیانک لگ رہے تھے۔ اڈے کے ساتھ ہی ”پلاس اوتلی“ کا بورڈ آویزاں تھا۔ اندر جانے پر معلوم ہوا کہ سیدھا سادا ”پیس ہوٹل“ ہے۔ خیال تھا کہ دوسرے روز استنبول سے کسٹم والوں کی بھیجی ہوئی کپڑوں کی پوٹلی مل جائے گی تو فوراً تہران روانہ ہو جاؤں گا۔ صبح اٹھا اور سیدھا اسٹیشن کے ”گم رخ“، یعنی کسٹم ہاؤس کا رخ کیا۔ آفیسر نے کپڑوں کی رسید پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور کہا: ”کل۔“

”کل؟“ میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا ”لیکن میں تو ارض روم میں زیادہ عرصہ نہیں ٹھہر سکتا۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔“

”سب یہی کہتے ہیں۔“ اس نے اکتاہٹ سے کہا۔ ”میں کچھ نہیں کر سکتا۔ استنبول سے یہاں تک سامان آنے میں کم از کم ایک ہفتہ لگتا ہے۔ کل پھر پتا کر لینا۔“

میں مایوس ہو کر باہر آ گیا۔ بارش ابھی تک ہو رہی تھی۔ دوسرے دن بھی ٹکاسا جواب ملا۔ میں روزانہ صبح اسٹیشن پر چلا جاتا اور استنبول سے آنے والی گاڑی کا انتظار کرتا۔ گاڑی آ جاتی مگر میرا سامان نہ آتا۔ سارے دن میں صرف ایک ہی گاڑی آتی اور شام کو واپس استنبول روانہ ہو جاتی۔ اس دوران اسٹیشن پر خوب رونق رہتی۔ روزگار کی تلاش میں یورپ جاتے ہوئے پاکستانی اور پھر وہاں سے مایوس ہو کر لوٹنے والے پاکستانی، انگریز، امریکی، جرمن، ہسپانیہ کی تلاش میں، ارض روم ”شاہراہ حشیش“ کا بڑا اہم جنکشن ہے۔ یہاں سے تہران، کابل، لاہور، دہلی اور پھر پیٹوں کی جنت کھٹمنڈو جہاں چرس کی خرید و فروخت اور استعمال پر کوئی پابندی عاید نہیں۔ دم میں ہے دم رہے نہ غم، نروان ہی نروان، ہری اوم ہری کرشنا۔

گاڑی چلی جاتی تو اسٹیشن بھائیں بھائیں کرنے لگتا۔ میں باہر نکلتا اور ہوٹل واپس آ کر کپڑے بدلے بغیر ہی بستر پر لیٹ جاتا۔ صبح چائے کے ساتھ دہی کھا کر بغیر شیشیو کیے پھر اسٹیشن کی طرف چل پڑتا اور کسٹم آفیسر کا ایک اور ”کل“ جواب میں سن کر تھکے ہوئے قدموں سے واپس لوٹ آتا۔ اکتوبر کا آخر تھا۔ اسٹیشن سے شہر تک جانے والی سڑک کے دونوں طرف شاہ بلوط کے درختوں کے خزاں رسیدہ پتے سرخ ہو کر گر رہے تھے۔ اس روز کچھ زیادہ ہی سردی تھی۔ کاکیشیا سے آنے والی سرد ہوائیں خنک تر ہو چلی تھیں۔ چند روز میں سردی شدید تر ہو جائے گی اور پھر..... اور پھر وہ شہر کا رستہ دیکھ لے گی۔

میں نے صبح سے صرف ایک پیالی دہی اور چند انگور کھائے تھے۔ دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ڈالے، ہوا اور بارش سے بچاؤ کے لیے سر نہبوڑے میں آج پھر اسٹیشن سے مایوس لوٹ رہا تھا۔ میرے بوٹوں میں پانی چپک رہا تھا۔ گیلیفٹ ہاتھ پر شاہ بلوط کے سرخ پتے گرتے اور خوبصورت نقش بنا کر پھسل جاتے۔ میں نے جیب میں اپنا آخری لیرا سختی سے بھیج لیا اور میری بند ہتھیلی نے ٹھنڈے سکے کی ساری خشکی جذب کر لی۔ شیفٹہ مدرسے کے کٹوٹے ہوئے مینار کے سائے

میں بیٹھے بوڑھے فقیر نے مجھے دیکھ کر صدادی: ”سفر بخیر“ اور میں نے اپنی بھینچی ہوئی مٹھی اس کی جھولی میں کھول دی۔

میں شیفٹہ مدرسے کے قدیم آہنی دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ شہزادی ہندی خاتون کا تعمیر کردہ یہ مدرسہ گئے زمانے میں علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ لمبی عباؤں اور اونچی قباؤں والے طالب علم دُور دراز سے آتے اور مستطیل صحن کے گرد بنی ہوئی نیم تاریک کوٹھڑیوں میں سما جاتے۔ دینی و دنیاوی علوم کے چراغ جلتے اور ان کی روشنی سمرقند و بخارا تک پھیل جاتی۔ میں نے اندر جھانکا۔ سامنے ایک نیم شکستہ گنبد تلے ایک سلجوق شہزادی سوئی ہوئی تھی۔ سلجوق طرز تعمیر کا ایک شاہکار۔ ساری عمارت خاموشی کے ایک تالاب کی مانند تھی۔ کتنا سکون تھا۔ بخ ہوا کا ایک تھپیڑ آیا اور میں مدرسے کی ٹوٹی ہوئی دیوار سے اور چمٹ گیا۔ بارش بھی تیز ہو چلی تھی۔ سڑک بالکل خالی ہو چکی تھی۔ فقیر نے اپنی جھولی سیٹی اور نشیون جانے والی سڑک پر چل دیا۔ وہاں بارش سے بچاؤ ہوگا۔ اب سڑک اور فٹ پاتھ مکمل طور پر سنسان تھے۔ آسمان پر گھنے اور سیاہ بادلوں کے راج نے شہر کو نیم تاریکی میں ڈبو دیا تھا۔ دیوار کی شکستہ اینٹوں میں سے پانی رِس رِس کر میرے قدموں تلے جمع ہو رہا تھا۔ سردی اور بھوک کی شدت سے میرا سر چکرانے لگا۔ میں کہاں ہوں؟ یہاں کیا کر رہا ہوں؟ میرے کانوں سے ہنسی کی لہر اور ڈھول کی تھاپ مگرائی۔ دھیمی اور سحر انگیز دھن، سلا دینے والی دھن، درویشوں کے ناچ کی دھن، لمبے چٹھے اور تر بوش پہنے ہوئے درویش، درویشوں کا روحانی ناچ۔ ایک متحرک دائرہ اور وی آنا کے والز کے قدم۔ ایک دو تین اور گھوم جاؤ۔ ایک دو تین اور..... لے تیز ہو چلی تھی۔ مجھ پر وجد طاری تھا۔ میں کون ہوں؟ میں بھی تو درویش ہوں۔ میرے پاس بھی تو کچھ نہیں۔ ارضِ رُوم، مولانا رُوم، دمام مست قلندر علی دا پہلا لہبر لیکن سہون شریف میں تو اتنی سردی نہیں ہوتی۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے دھیمی اور سحر انگیز موسیقی کی لہریں مجھے اپنے دوش پر بٹھائے لُق و لُق صحراؤں، بلند و بالا پہاڑوں اور گنگناتی ندیوں کو پاٹ کر اس چمکیلے دن کی طرف مائل پرواز ہیں جو میرے سفر کا حسین آغاز تھا۔

ہندو کش کے سائے میں

”آریو گونگ ٹوکا بول سر؟“ پاکستانی بس کے گورے چٹے کند کُنڑ نے شُستہ انگریزی میں ہم سے پوچھا۔

”آہوجی۔“ علی نے بوکھلا کر خالص موچی دروازے کے لہجے میں جواب دیا۔
”تو پھر اپنا سامان بس کے نیچے بنے ہوئے کمپارٹمنٹ میں رکھ دیجیے اور سیٹ نمبر گیارہ اور بارہ پر تشریف رکھیے۔“

بس آرام دہ تھی۔ لاہور سے بذریعہ خیبر میل جب پشاور پہنچے تو سٹیشن پر ہمیں ایک تانگہ ڈرائیور جمع گاڈل گیا۔ ”افغانی کرنسی قصہ خوانی بازار سے دستیاب ہوگی اور کابل کے لیے گورنمنٹ کی بس آٹھ بجے روانہ ہوتی ہے۔ میں آپ کو وقت سے پہلے پہنچا دوں گا۔ کرایہ چار روپے۔“ ہم نے کہا منظور اور تانگے میں سوار ہو گئے! چنانچہ کرنسی تبدیل کروائی اور عین وقت پر اڈے پر بھی پہنچ گئے۔

دوڑے خیبر کی پُرچ سڑک پر بس لڑھکتی ہوئی طورخم جا رہی تھی۔ سرحد کے اس پار افغانستان تھا۔

چند برس پیشتر تیز رفتار جیٹ ہوائی جہاز کے ذریعے لندن سے واپسی ہوئی۔ میں شیشے کی دبیز کھڑکی سے ناک چپکائے ان فاصلوں کو پاٹنے کی کوشش کر رہا تھا جو مجھ میں اور ہمارے نیچے تیزی سے سرکتی ہوئی دنیا کے درمیان حائل تھے۔ ہسپانیہ کا گہرا نیلگوں ساحل، سنہری دھوپ میں چمکتے ترک گاؤں اور سرزمین ایران کا حسن پلک جھپکتے نظر سے غائب ہو گئے۔ یہ تمام

خوبصورتیاں میری پہنچ سے باہر تھیں۔ جہاز کا سفر زمین سے تمام ناطے منقطع کر دیتا ہے اور مجھے یہ جدائی پسند نہ تھی۔ میں نے سوچا، میں دوبارہ واپس آؤں گا لیکن ششے اور ایلومینیم کے ساختہ اڑن کھٹولے میں قید ہو کر نہیں بلکہ دھرتی کے سینے کے ساتھ لگ کر تاکہ مجھے وسعتوں اور فاصلوں کا احساس ہو، صرف خلاؤں کا نہیں۔

وطن واپس آیا تو رہٹ کے آگے جتے تازہ دم نیل کی مانند پہلے پہل تو خوب ”گیڑے“ لگائے۔ گلے میں بندھی گھنٹیوں کی سُریلی آواز نے مسحور کئے رکھا۔ دن فکر روزگار میں کٹتا اور شام مال روڈ کے ایک ککڑے پر مڑ گشت کرتے یا ٹیلی ویژن کے سامنے جمائیاں لیتے۔ زندگی جامد ہو کر رہ گئی تھی اور مجھے شدت سے اپنے گلے میں ”پنجابی“ اور آنکھوں پر چڑھے ”کھوپوں“ کا احساس ہونے لگا۔ میں ایک جگہ چکر کاٹ رہا تھا۔ میرا جی چاہا کہ رسہ تڑوا کر بھاگ نکلوں۔

میرا دوست محمد علی کبھی کبھی میرے پاس آ بیٹھتا اور میں اسے سنہری وادیوں اور جھلمل جھلمل کرتی نیلی جھیلوں کی کہانیاں سنا تا جواب ایک خواب ہو کر رہ گئی تھیں۔ میں نے ایک روز اس گھٹن اور سکوت سے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ لوہے کے ڈنگ آلود صندوق میں سے اپنا پرانا خیمہ، سامان کا تھیلہ، کھانا پکانے کی اشیاء اور یورپ کے نقشے نکالے۔ اب میرا وقت انہی نقشوں پر سُرُخ لکیریں کھینچنے اور مختلف ممالک کی تاریخ و ثقافت کے بارے میں کتب کی ورق گردانی میں صرف ہونے لگا۔ میرے ذہن میں سفر کا ایک دھندلا سا خاکہ ابھرنے لگا۔ خشکی کے راستے استنبول، پھر وہاں سے شمالی اور وسطی یورپ کے ممالک کی سیاحت کے بعد ہسپانیہ۔ محمد علی کی سیاحت سے کوئی لمبی چوڑی دلچسپی نہ تھی لیکن صرف ”ولیت“ دیکھنے کے چاؤ نے اسے میرا ہم سفر بننے پر مجبور کر دیا اور اب ہم اپنی پہلی سرحد عبور کرنے والے تھے۔

طورخم پرواجی سی چیکنگ ہوئی اور ہم افغانستان میں داخل ہو گئے۔ بس میں بڑی بین الاقوامی قسم کی رونق تھی۔ امریکن بوڑھیاں، ایک جاپانی جوڑا، فرانسیسی آوارہ گرد اور افغانی سکھ جن میں علی بے حد دلچسپی لے رہا تھا۔ جلال آباد پہنچے تو یوں محسوس ہوا جیسے طورخم کی بجائے گنڈاسنگھ والا کا بارڈر پار کیا ہے۔ یہاں افغانوں کی ڈھیلی ڈھالی پگڑیوں کی نسبت سکھوں کی کلف لگی پگڑیوں کی بہتات تھی۔ شہر کا تمام کاروبار سکھوں کے ہاتھ میں ہے۔ ایک ملک سے دوسرے ملک کی سرحد

پار کرتے ہی انسان ایک دم نئی تہذیب و ثقافت اور جغرافیائی تبدیلیوں سے دوچار نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اس ملک میں کچھ فاصلہ طے نہ کرے۔ اسی طرح جلال آباد تک ماحول ہمارے صوبہ سرحد جیسا ہی ہے مگر یہاں سے پرے اصلی افغانستان شروع ہو جاتا ہے۔ جلال آباد کے آگے بلند چٹانوں اور تنگ دروں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جگہ جگہ خطرناک موڑ اور گھاٹیاں ہیں۔ دائیں طرف نورستان کی برف پوش چوٹیاں ہیں جن کے پہلو میں بہتا ہوا دریائے کابل اپنے ہم نام شہر تک ساتھ دیتا ہے۔ افغان حکومت کی ان تھک کوششوں اور غیر ملکی ماہرین کی نگرانی میں ویرانوں کو مرغزاروں میں بدلنے کی کوشش کے آثار ہر جگہ نمایاں ہیں۔

یہ مارچ کا آخر تھا۔ سڑک پر گوجی خانہ بدوشوں کے قافلے پنجاب اور سرحد میں موسم سرما بسر کر کے نئے افقوں کی تلاش میں شمالی افغانستان کی طرف رواں تھے۔ گوجی جو ہمیشہ موسم بہار کے ساتھ سفر کرتے ہیں۔ افغانستان کی کل آبادی کا کم از کم پندرہ فی صد حصہ ان خانہ بدوشوں پر مشتمل ہے۔ آج ہم بھی ان کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔

کابل پہنچے تو شام کا سرمئی اندھیرا ہر سو پھیل چکا تھا۔ ہوٹل کی تلاش میں زیادہ وقت نہ ہوئی۔ ہم نے سامان کمرے میں رکھا اور باہر آ گئے۔ شہر نو میں چند جدید عمارات اور کشادہ سڑکیں تھیں، لیکن بھورے رنگ کی وسطی پہاڑی کے پرے صدیوں پرانا کابل تھا۔ ہمارا ہم سفر دریائے کابل اب شہر کے درمیان میں بہہ رہا تھا۔ مسجد کے سامنے والے پل کے پہلو میں بنی ہوئی میڑھیوں سے نیچے اتر جائے تو دریا کی ہمہ گیر افادیت عیاں ہو جائے گی۔ ایک طرف لمبے برشوں کی مدد سے ازبک قالینوں کو دھوا جا رہا ہے، ساتھ ہی ایک خان صاحب وضو کر رہے ہیں، کالے چنے میں ملبوس ایک خانہ بدوش لڑکی ٹین کے کنستریٹ میں گھریلو استعمال کے لیے پانی بھر رہی ہے۔ اس سے ذرا پرے چند حضرات گرد و پیش سے بے خبر اسے ’فلش سسٹم کے اصول‘ کے تحت استعمال کر رہے ہیں۔ بہتا پانی ہمیشہ پاک رہتا ہے۔

شاہ امان اللہ کی ملکہ نے اپنی چادر اتار دی تو شاہ کو سلطنت سے ہاتھ دھونے پڑے مگر وہ پرانے وقتوں کی بات ہے۔ اب آپ کو ہر جگہ منی سکرٹ اور اونچی ایڑھی کے جوتوں میں ملبوس خواتین نظر آئیں گی۔ چادر سکرٹ کر جدید وضع کے کٹے ہوئے بالوں پر ”سکارف“ کی شکل میں رونما ہے۔ اگر کوئی خاتون ذرا پرانی وضع کی ہیں تو پھر سکرٹ اور بلاؤز کو شل کاک نما سفید برقعے سے

ڈھانپ لیا جاتا ہے لیکن اس طرح کہ چلتے وقت عریاں پنڈلیوں اور ٹانگوں کی دعوتِ نظارہ عام ہو جائے۔ روایتی لباس پہننے والوں کی تعداد دن بہ دن کم ہوتی جا رہی ہے۔ مجھے ذاتی طور پر نئی روشنی کے تحت جدید اصلاحات سے پر خاش نہیں لیکن یہ اصلاحات زندگی کے ایسے شعبوں سے متعلق ہونی چاہئیں جہاں مثبت نتائج برآمد ہو سکیں۔ اپنے روایتی لباس کو خیر باد کر کے مغربی نکلے تری کی زینت بن کر لینا احساسِ کمتری کی علامت ہے، ترقی کی نہیں۔

خیبر ریسٹوران کا سیلف سروس کیفے یہاں پر سیاحوں کی آماجگاہ ہے۔ کاؤنٹر پر ٹرے لے کر کھڑے ہو جائیے اور مختلف انواع کے کھانوں میں سے اپنے لیے انتخاب کر لیجئے۔ رات کا کھانا ہم نے یہیں کھایا۔

کھانا کھا کر باہر نکلے تو ہوا میں خشکی کا احساس ہوا۔ ہم مسجد والے پل سے دریائے کابل کو عبور کر کے بلندی کی طرف چلے گئے۔ چھٹکی ہوئی چاندنی میں شہر نوکی روشنیاں مدھم مدھم پرگئیں تھیں۔ مغرب کی طرف رومانوی کوہ بابا کی برف پوش چوٹیاں چمک رہی تھیں۔ اتنی نزدیک کہ ہاتھ بڑھائیں تو چھو لیں۔ اتنی عظیم اور خوبصورت جیسے فن گندھارا کا کوئی شاہکار مجسمہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی مشرق سے شمال تک ایک ناقابلِ تسخیر خشک اور بلند سلسلہ کوہ کی برف پوش دیوار کھڑی تھی۔ اسے افغانوں نے ”ہندوکش“ کے نام سے پکارا۔ ایک ایسا پہاڑ جو ہندوؤں کے لیے پیامِ اجل تھا۔ ہندوؤں نے اسے صرف ”کوہ ہندو“ کا نام دیا اور ایرانیوں کی قدیم زبان میں اسے ”پاروپانیسادا“ (Paropanisadae) کہتے تھے۔ وہ پہاڑ جس کی فلک بوس چوٹیاں عقابوں کی بلندی پر واز سے بھی اونچی ہیں۔ اس کی ازلی برفوں میں تاریخ کے کئی باب دفن ہیں۔ زمانہ قدیم میں یونان کی ٹیٹا نما پہاڑیاں دیوتاؤں کا مسکن سمجھے جاتی تھیں لیکن جب ایک چرواہا کوہِ اُپس کی چوٹی پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو وہاں نور کے ہالوں کی بجائے خشک پتھروں کے ڈھیر تھے۔

مقدونیہ کے سکندر کو بھی دیوتاؤں کی تلاش تھی۔ اُپس کا طلسم ٹوٹا تو اس کی نگاہیں مشرق سے ابھرتے سورج پر جم گئیں۔ سکندر نے قدیم کتابوں میں پڑھا تھا کہ شاہ دارا کے ایران کے اس پار پہاڑوں کا ایک ایسا سلسلہ ہے جسے آج تک کوئی بھی تسخیر نہیں کر سکا۔ اس نے سوچا، دیوتا ضرور وہیں بستے ہوں گے لیکن اسے یہاں آ کر بھی مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اگر وہاں خشک پتھر تھے تو یہاں ازلی برفوں کی تھیں۔

کابل ہمیشہ سے اس نکلے کا مرکز نہیں رہا۔ ہزاروں سال قبل ان پہاڑوں کے دوسری طرف جڑواں شہر کنیش اور کپشا آباد تھے۔ سکندر آیا تو یہاں اس نے ایک یونانی شہر کی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد کشان نے اسے جمن اور جیہوں کے درمیان پھیلی ہوئی سلطنت کا صدر مقام قرار دیا۔ انہی کشان کے زمانے میں بدھ مت ہندوستان اور وسط ایشیا کے راستے چین تک پھیل گیا۔ وادی بامیان میں مہاتما بدھ کے سینکڑوں فٹ بلند ہیبت ناک مجسمے اسی دور کی عکاسی کرتے ہیں۔ بدھ اور یونانی تہذیب کے ملاپ نے ”فن گندھارا“ کو جنم دیا جو مشرق کی روحانیت اور مغرب کے فنی کمال کا حسین امتزاج تھا۔ ان شہروں سے پرے بدخشاں کی رومی سرحد کے ساتھ دریائے جیہوں جسے آمو اور آکسس کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے، ایرانی اور طورانی تہذیبوں کے درمیان سرحد بن کر بہتا ہے۔ جیہوں جس کے دامن میں پلٹ آباد تھا، جسے ”شہروں کی ماں“ کا درجہ دیا گیا تھا۔ جسے چنگیز اور تیمور کے قہر نے شکستہ میناروں، اجڑے معبدوں اور ٹوٹی ہوئی دیواروں کے ایک ڈھیر میں بدل دیا۔ پلٹ جو مولانا روم کی جائے ولادت تھا۔

سیاحت کے دوران کبھی ایسا دورا ہا بھی آ جاتا ہے جہاں سے دونوں راہیں خواب و خیال کی طلسمی وادیوں میں اترتی ہیں اور سیاح کے لیے اپنی منزل کا تعین کرنا بے حد دشوار ہو جاتا ہے۔ ہم دوسری صبح قندھار جا رہے تھے لیکن میرادل چاہتا تھا کہ کاش میں پلٹ بھی دیکھ سکوں۔

”بخیر مے ردی مومنان“ کسی نے غرا کر کہا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک ہٹا کٹنا فقیر ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا۔ ہم قندھار جانے والی قادری سروس کی بس میں سوار تھے۔

”کچھ نہ کچھ ضرور دے دو۔ پردیس میں فقیروں سے بھی ڈرنا چاہیے۔“ علی نے فقیر کا قد کاٹھ مد نظر رکھتے ہوئے کہا۔ میں نے ایک سکہ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا اور سوچا اللہ کرے اس فقیر کی دعا سچ ہی ثابت ہو۔

بس پرانے اور نئے کابل کے جھیلوں سے نکلی اور غزنی کی شاہراہ پر گامزن ہو گئی۔ افغانستان نے اپنی جغرافیائی پوزیشن کی آڑ لے کر دنیا کے تمام ملکوں سے بے پناہ امداد حاصل کی ہے۔ شمال میں روسی صنعت اور ذرائع نقل و حمل کی توسیع میں مصروف ہیں۔ مشرق میں امریکی زراعت کو ترقی دینے میں کوشاں ہیں۔ تعلیم کے میدان میں سویڈن اور جرمنی آگے آگے ہیں۔

کے لندن اور نیو یارک کی قسمت میں بھی نہیں ہے اور یہ سب کچھ صرف محمود کی ذات سے تھا۔ سلطان محمود نے سینکڑوں محلات اور مسجدوں کے علاوہ یہاں ایک عظیم الشان لائبریری بھی تعمیر کرائی۔ اس کے دربار میں امراء اور وزراء کے شانہ بہ شانہ شاعر، ادیب اور تاریخ دان بھی جلوہ افروز ہوتے۔ ان دنوں غزنی افغانستان کے صحراؤں میں ایک آبادار موتی کی طرح چمکتا تھا جس نے اپنی تابناک روشنی سے بغداد کو بھی ماند کر دیا تھا۔ سلطان محمود کا دارالسلطنت بے شک بے مثال تھا۔ محمود کو سمنات کے براہمنوں نے صرف ایک بت کی خاطر بیس کروڑ روپے کی مالیت کے جواہرات بطور نذرانہ پیش کرنا چاہے اور محمود کا جواب ان تمام متعصب تاریخ دانوں کے منہ پر تھپڑ ہے جو اسے صرف لیرے کا نام دیتے ہیں۔ سلطان نے کہا: ”تمہاری وجوہات اپنی جگہ پر درست اور صائب ہیں لیکن محمود کبھی بھی تاریخ میں ”بت فروش“ کے نام سے نہیں پہچانا جائے گا۔“ سمنات کے کٹڑے غزنی، مکہ اور مدینہ تک بھیجے گئے۔ ایڈورڈ گین کے الفاظ میں: ”اس نذر مسلمان کو موسم کی سختیاں، پہاڑوں کی بلندیاں، دریاؤں کی وسعتیں، صحرا کی بیابانیاں، دشمن کی کثیر تعداد اور مقابلے میں ہاتھیوں کے لشکر کبھی بھی ہراساں نہ کر سکے۔ بے شک غزنی کا محمود مقدونیہ کے سکندر سے بھی عظیم تھا۔“

بقول فلپ ہتی: ”اس نے اپنے دارالسلطنت کو شاہانہ عمارات سے سجایا۔ ایک عظیم مدرسے کی بنیاد رکھی۔ اپنے دربار میں شاعروں اور عالموں کو عالی مرتبے دیئے۔ عرب تاریخ دان اور ”کتاب بینی“ کا مصنف العطی۔ سائنس دان اور تاریخ دان البیرونی اور فارسی کا عظیم شاعر فردوسی ان میں سے چند ایک تھے۔“

ہندوستان، ایران اور طوران کے سلطان۔ ایک لاکھ پیدل فوج۔ پچھن ہزار گھڑ سواروں اور تیرہ سو ہاتھیوں پر مشتمل فوج کے سپہ سالار میں تکبر نام کو نہ تھا۔ دربار میں غزنی کے خزانے میں جمع دولت اور ہیرے جواہرات کی نمائش کی گئی تو وہ دنیا کی بے ثباتی اور خدا کے خوف سے رو دیا۔ جس کے دربار میں رعایا کے ایک فرد نے دہائی دی کہ اسے سلطان تیری فوج کے ایک ترک سپاہی نے میرے خاندان کی بے حرمتی کر کے ہمیں گھر سے نکال دیا ہے تو محمود اپنی تلوار بے نیام کر کے اس کے ساتھ ہولیا۔ گھر میں داخلے سے قبل سلطان نے تمام شعبیں گھل کرنے کا حکم دیا اور مجرم کو تارکی میں ہی تہ تیغ کر دیا۔ شعبیں روشن ہوئیں تو سجدے میں گر گیا اور پھر فیادی سے

کابل سے قندھار تک سڑک امریکیوں کی تیار کردہ ہے اور قندھار سے ہرات تک روسیوں نے بچھائی ہے۔ اتنی خوبصورت سڑکوں پر افغان جس قسم کی ڈرائیونگ کا مظاہرہ کرتے ہیں، وہ ناقابل برداشت ہے۔ بیس پچیس میل فی گھنٹہ سے زیادہ رفتار کبھی بھی نہیں بڑھتی حالانکہ سڑک بالکل ایک لکیر کی طرح چلی جاتی ہے۔ ٹریفک نہ ہونے کے برابر اور دونوں جانب غیر آباد پہاڑ۔ ایسی سڑک تو گرانڈ پری ڈوٹ کے لیے بھی موزوں رہے گی۔ میں نے ساتھ بیٹھے افغان سے ڈرائیوروں کی ست روی کا سبب پوچھا تو کہنے لگا: ”اول تو حکومت کی طرف سے حد رفتار متعین ہے۔ تجاوز کی صورت میں ڈرائیونگ لائسنس عمر بھر کے لیے چھین جاتا ہے، دوسرے ڈرائیور بھی نئے ہیں۔ مثلاً اس بس کا ڈرائیور پچھلے سال تک قندھار میں تربوز بیچا کرتا تھا۔ آپ شکر کریں کہ وہ بس سیدھی تو چلا رہا ہے۔“ چنانچہ میں نے شکر کیا۔

اب ہم کابل کی نواحی آبادیوں سے بھی نکل آئے تھے۔ دائیں طرف کوہ بابا اور نزدیک ہو گیا۔ برف چاندی کی تاروں کی مانند چوٹیوں سے نیچے وادی تک لگی ہوئی تھی۔ خنک ہوا کا ایک بخ بستہ جھونکا آیا اور میں نے بیگ سے سوئٹر نکال کر پہن لیا۔

بس سڑک کے دائیں ہاتھ سرو کے درختوں کے جھنڈ میں مڑ گئی۔ سامنے غزنی تھا، سر بفلک اور خاموش۔ ہم سلطان محمود کا مزار چند کوس پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اس کا غزنی ہمارے سامنے تھا۔ بس نے ایک اور موڑ کاٹا اور دھول سے اُٹے ہوئے ایک سنسان چوک میں کھڑی ہو گئی۔ ”چائے کا وقفہ“ ڈرائیور نے اپنی گھنی داڑھی کھجاتے ہوئے کہا۔ سامنے ایک بوسیدہ قبوے خانے پر ”سلطان محمود ہوٹل“ کا بورڈ آویزاں تھا۔ میں اور علی باہر رکھے ہوئے بیچ پر بیٹھ کر ”شیریں چائے“ پینے لگے۔ کچھ مسافر چوک میں گھومنے لگے۔ بس کے ڈرائیور نے سرسری طور پر ادھر ادھر دیکھا اور ہوٹل کے ساتھ والے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کی اوٹ میں بیٹھ کر حواج ضروریہ سے فارغ ہونے لگا۔ مجھے کراہت آ گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے شہر کے اوپر بالائے حصار کی دیواریں اپنی بربادی اور بے حرمتی پر نوحہ کنناں ہیں۔ میری آنکھیں بند کیوں ہیں۔ میں نے سوچا، میں حال میں نہیں ماضی میں سفر کر رہا تھا۔ میرے دل کی آنکھیں کھلی ہیں۔

آج سے ایک ہزار سال قبل غزنی کو وہ شان و شوکت اور عظمت نصیب ہوئی جو حال

یوں گویا ہوا کہ: ”جب تم نے مجھ سے اپنے گھر لٹنے کی فریاد کی تو میرے دل میں یہ خیال تقویت پکڑ گیا کہ کہیں میرا اپنا فرزند ہی اس فعل کا ذمہ دار نہ ہو کیونکہ میری فوج کے کسی سپاہی کو یہ جرأت نہیں ہو سکتی۔ میں نے شمعیں گل کرنے کا حکم اس لیے دیا کہ میرا انصاف اندھا اور بے رحم ہو اور میں سجدہ ریز اس لیے ہوا کہ مجرم میرا بیٹا نہ تھا۔“

سلطان محمود کی وفات کے بعد اس کا فرزند مسعود تخت نشین ہوا۔ نئے سلطان کی تخت نشینی کے ساتھ ہی ترک قبیلوں نے بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ مسعود اپنی فوج لے کر مقابلے کے لیے آگے بڑھا۔ ایک ایرانی تاریخ دان لکھتا ہے کہ مسعود اپنے باپ کی طرح نڈر تھا۔ وہ تلوار سونت کر دشمن کی صفوں میں گھس گیا اور شجاعت کے ایسے عظیم کارنامے دکھائے جن کی مثال تاریخ کے صفحوں میں نہیں ملتی۔ فتح قریب تھی، لیکن جب سلطان نے پیچھے مڑ کر اپنی سپاہ کی جانب دیکھا تو اس کی فوج میں شامل ترک اس کا ساتھ چھوڑ کر اپنے بھائیوں سے جا ملے۔ مسعود کو شکست ہوئی اور غزنی کی شاہانہ عظمت زندقان کے میدان میں دفن ہو گئی۔ اب سلطنت کے نئے حکمران کے چناؤ کا مسئلہ تھا۔ فاتح ترک قبیلوں کے ہر سردار نے اپنا نام ایک تیر پر کھودا اور تمام تیروں کو ایک گٹھے میں باندھ دیا گیا۔ ایک معصوم ترک بچے نے گٹھے میں سے ایک تیر اٹھا لیا۔ تیر پر سلجوق کے پوتے طغرل بیگ کا نام تھا اور یوں سلطان محمود کی عظیم سلطنت ایک قرعے سے ترک گذریے طغرل بیگ کے نام منتقل ہو گئی۔ غزنی کے جلال و جمال کے دن پورے ہو چکے تھے۔ 1150ء میں افغان علاؤ الدین غوری نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ مردوں کو تہ تیغ کر کے عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا گیا۔ سلطان محمود کے تعمیر کردہ محلات اور عمارت کو بالکل تباہ کر دیا گیا اور شہر کو آگ لگا دی گئی۔ غزنی سات دن تک جلتا رہا اور مہینوں سلگتا رہا۔ یوں اس شہر بے مثال کی خوبصورتی اور عظمت تاریخ کے صفحوں پر منتقل ہو گئی۔

”سلطان محمود ہٹل“ کے سامنے چوراہے میں دھول اڑ رہی تھی۔ مسافر چائے پی چکے تھے اور ڈرائیور بھی فارغ ہو کر اپنا ازار بند کس رہا تھا۔ میری نظریں بالائے حصار سے ہٹ کر آج کے غزنی پر مرکوز ہو گئیں۔ کچے اور غلیظ مکانات، دھول سے اٹی ہوئی تنگ گلیاں، غربت اور گندگی اور پھر شہر سے پرے محمود کے تعمیر کردہ ”فتح کے مینار“ جہاں بلخ اور بخارا سے آنے والی شاہراہ ختم

ہوتی تھی۔ یہاں کے باشندے اب سیاحوں کی بخشش اور حکیم ثنائی کے مزار پر آنے والے زائرین کی خیرات پر پلتے ہیں۔ بس سرو کے جھنڈ سے نکل کر قدھار کی جانب روانہ ہو گئی۔ غزنی نے مجھے اداس کر دیا تھا۔

کابل کی خنکی نے صرف غزنی تک ساتھ دیا۔ اب ہوا گرم اور ریت آلود تھی۔ بخر اور چنیل پہاڑوں کا اکتا دینے والا سلسلہ تاحہ نظر پھیلا ہوا تھا۔ کہیں کہیں سڑک اور پہاڑوں کے درمیان ویرانے میں خانہ بدوشوں کے خیمے نظر آتے۔ یوں لگتا جیسے سیاہ فام پرندوں کے غول کے غول دیکے بیٹھے ہیں اور ذرا سی آہٹ سے اپنے چوڑے پر پھیلا کر فضا کے بسط میں پرواز کر جائیں گے۔ صدیوں سے یہ لوگ بہار کے ساتھ ساتھ سفر کرتے رہے ہیں۔ ان کے لیے ملک اور سرحدوں کی قید بے معنی چیزیں ہیں۔ یہ دنیا کے عظیم ترین سیاح ہیں لیکن دن بہ دن ان سرحدوں کو بند کیا جا رہا ہے جن کے وجود سے وہ اب تک بے خبر تھے۔ ماورائے نہر اور بدخشاں کے پرے آہنی پردہ پڑ گیا اور اب تو حکومت پاکستان نے بھی پابندی عائد کر دی ہے۔ بہار کے مسافروں کو پہلی مرتبہ موسم خزاں کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔

دوپہر کے کھانے کے لیے ہم ”جاندر“ میں رُکے جو چند دکانوں اور قہوہ خانوں پر مشتمل تھا۔ ہم ایک تنگ اور نشیبی دروازہ نمارا سٹے سے قہوہ خانے میں داخل ہوئے۔ مٹی کے کمرے میں کھڑکی یا روشندان کی غیر موجودگی نے پورے ماحول کو نیم تاریک اور پراسرار بنا رکھا تھا۔ ہم کچے فرش پر بچھی ہوئی بوسیدہ دری پر بیٹھ گئے۔ ایک بوڑھے افغان نے پہلے ہاتھ دھلائے اور پھر دسترخوان بچھا کر اس پر سوپ کا پیالہ، بغیر مرچ کے بھنے ہوئے گوشت کی کڑاہی اور ہاتھی کے کان جتنے نان رکھ دیئے۔ علی کو پانی کی ضرورت محسوس ہوئی تو میں نے پوچھا: ”مگنا دوں؟“ کہنے لگا: ”جی نہیں۔ قزلباش ہوتے ہوئے فارسی بولنا میرا پیدائشی حق ہے“ اور افغان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: ”آغا آب خورد بیا۔“ افغانستان میں قدیم فارسی مروج ہے جو آج کل بولی جانے والی فارسی سے یکسر مختلف ہے۔ افغان نے سر ہلایا اور سوپ کا ایک اور پیالہ لے آیا۔ علی کھینا ہوا گیا۔ ”اب یہ فارسی نہیں سمجھتے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ باہر لگے ہوئے تل سے پانی پی لیتے ہیں۔“

باہر آئے تو ہوا کی شدت میں اضافہ ہو چکا تھا۔ دُور صحرا میں بگولے اُٹھ رہے تھے اور سڑک پر کانٹے دار جھاڑیاں اڑ رہی تھیں۔ چنگیز خان بھی تو ان ہی صحراؤں کو پاٹ کر خراسان پر حملہ آور ہوا تھا، میں نے سوچا۔ سڑک سے کچھ دور ویرانے میں ایک قدیم کاروان سرائے کے کھنڈر دھوپ میں چمک رہے تھے۔ ویران اور مہیب۔ زمانہ قدیم میں طوران اور ایران کے مابین انہی راستوں پر قافلے سفر کرتے تھے جن کی شبِ ب سری کے لیے ہر بیس کوس کی مسافت پر کاروان سرائے تعمیر کی گئیں۔ افغانستان میں جدید ذرائع نقل و حمل کے لیے تارکول کی سڑکیں بھی تقریباً انہی راستوں پر بنائی گئیں۔ مشینی ذرائع کی آمد سے کاروان اور قافلوں کا دور ختم ہو گیا لیکن سرائیں اب بھی قائم ہیں۔ زیادہ تر کھنڈرات میں تبدیل ہو چکی ہیں لیکن کچھ اپنی اصلی حالت میں بھی موجود ہیں۔

میں نے علی سے کہا: ”چلو ایک نظر اس سرائے کو ہی دیکھ لیں۔“

”اور جو بس نکل گئی تو؟“ اس نے جھلا کر کہا۔ اسے اب تک اس کم فہم افغان پر غصہ

تھا۔

”تو کیا ہوا؟ رات وہیں بسر کریں گے۔ ہم سے پہلے کے لوگ بھی تو یہی کیا کرتے تھے۔ ذرا تصور کرو کہ تمہارا کاروان سرقند سے ہرات جا رہا ہو۔ سارے دن کی مسافت کے بعد تمہیں شام ڈھلے ریت کے ٹیلے کے اوپر سے شفق کی سرخی میں نہائی ہوئی ایک رومانوی کاروان سرائے دکھائی دیتی ہے۔ کیا تم دیوانہ وار اپنے مریل اونٹ کو بھگا کر وہاں تک نہیں پہنچ جاؤ گے؟“ علی ہنسنے لگا۔ ”چلو دیکھ لیتے ہیں۔“

ہم صدر دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ مٹی کی بنی ہوئی چوکور قلعہ نما عمارت کے درمیان ایک وسیع تالاب تھا جسے صحرا کے بگولوں اور آندھیوں نے ریت سے بھر دیا تھا۔ قافلے آتے تو اونٹوں کو پانی پلا کر صحن میں باندھ دیا جاتا اور مسافر چاروں طرف بنی ہوئی کوشٹیوں میں سما جاتے۔ رات کو بکرے کا پورا دھڑالا پر بھونا جاتا۔ سرائے کے چھوٹے سے صحن پر ایک اچھے خاصے قصبے کا گمان ہونے لگتا۔ گوشت سے چربی لکھل کر سلگتی ہوئی لکڑیوں پر گرتی اور اس کی اشتہا انگیز خوشبو سرمئی دھوئیں میں مدغم ہو کر پوری فضا میں رچ جاتی۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہر مسافر اپنی داستان سنانا اور مخالف سمت سے آنے والوں سے راستے کے بارے میں پوچھتا۔ مرو کے پاس

توافق تو نہیں؟ دشت مرگ کے خلتانوں میں پانی تو نہیں سوکھ گیا؟ کاروان سرائے کا دروازہ ہر مسافر کے لیے کھلا تھا۔ یہ صحرا کا اصول تھا کہ جو بھی اس کی چار دیواری میں داخل ہو جاتا، اس کے جان و مال ہر قسم کے خطرات سے محفوظ ہو جاتے۔ تمام رنجشیں بھلا دی جاتیں۔ دوست اور دشمن ایک ہی چھت کے نیچے شب بسر کر کے دوسری صبح اپنی اپنی راہ لیتے۔

میں انہی خیالات میں مگن تھا کہ بس کا ہارن متواتر بجنے لگا اور ہم واپس آ گئے۔ سفر جاری ہوا تو پھر وہی بیابانی اور صحرا کی وسعتیں ساتھ ہو لیں۔ کبھی کبھی سڑک کے کنارے چرتی ہوئی قرقلی بھیڑیں یک دم بس کے سامنے آ جاتیں اور ہارن کی تیز آواز سے بدک کر اُچھلتی ہوئی یوں بھاگتیں جیسے بس کی بجائے کسی خونخوار بھیڑیے سے پالا پڑ گیا ہو۔ ”پچھلے آٹھ گھنٹوں میں اس سڑک پر صرف چار کاروان کا گزر ہوا۔“ علی نے حساب لگایا۔ آخر کاروں کا بیوپاری تھا۔

شام کے پانچ بجے ہم قندھار میں داخل ہوئے۔ کچے مکانات، تنگ گلیاں اور کہیں کہیں سرو کے درخت۔ علی نے بس سے اترتے ہی اناروں کی تلاش شروع کر دی جن کا موسم نہیں تھا۔ شاید اسی لیے اکثر کمین بیماروں کی صورت بنائے پھرتے تھے۔ اڈے کے گرد و نواح میں اکثر ہوٹل بے حد غلیظ اور تنگ تھے۔ تانگے والے کے مشورے پر ”ہوٹل قندھار“ کا رخ کیا جو پرانے شہر سے باہر جدید حصے میں واقع ہے۔ ہوٹل کے کلرک نے کمرے کا کرایہ سو روپیہ بتایا۔ چنانچہ واپس باہر آ گئے۔ ساتھ والی عمارت پر پاکستان کا چاند تارا لہرا رہا تھا ”پاکستان کونسلٹ قندھار“ ہم فوراً اندر پہنچ گئے۔ ادھر ادھر جھانک رہے تھے کہ ایک پٹھان چوکیدار نمودار ہوا۔ ”خوس کو ملے گی؟“ ہم نے سینہ تان کر کہا: ”ہم پاکستانی ہیں اور یہاں رات بسر کرنا چاہتے ہیں۔“

وہ ہمیں عمارت کے پچھواڑے میں لے گیا جہاں ایک صاحب دبیز پیشوں کی عینک لگائے ٹائپ رائٹر پر جھکے ٹائپ میں مصروف تھے۔

”فرمائیے۔“ انہوں نے ٹائپ رائٹر سے نظریں ہٹائے بغیر پوچھا۔

”ہم پاکستانی ہیں اور ہمیں رات گزارنے کے لیے کسی جگہ کی تلاش ہے۔“ میں نے کندھے سے سامان اتار کر نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

”یہ ہوٹل نہیں ہے۔“ صاحب نے ہماری طرف بغور دیکھتے ہوئے بڑی سرد مہری سے جواب دیا۔ ”ویسے کونسلٹ میں ایک مہمان خانہ موجود ہے لیکن وہاں کونسل جنرل کی

کے ہاتھوں سلطان مسعود کی شکست کے بعد جہاں غزنی برباد ہوا وہاں لشکری بازار کو بھی زوال آ گیا۔ اس عظیم شہر کی حدیں دشت مرگ کو چھوتی تھیں۔ آب و ہوا خشک اور سخت گرم تھی۔ محل وقوع اور آب و ہوا ایک وسیع سلطنت کے دار الخلافہ کی تعمیر کے لیے انتہائی ناموزوں تھی۔ برسوں سے آثار قدیمہ کے ماہرین اور تاریخ دان اس گتھی کو سلجھانے کی ناکام کوشش کرتے رہے کہ وہ کون سے عوامل تھے جن کے تحت مجبور ہو کر غزنی کے سلطانوں نے اس ویرانے کا انتخاب کیا۔ چند برس پیشتر کھدائی کے دوران برآمد ہونے والی اشیاء نے اس عقدے کو حل کر دیا۔ یہ تو ڈھیر ہاتھیوں کی خاطر کیا گیا تھا۔

ان دنوں ہاتھی جنگی مہمات کا ایک لازمی اور فیصلہ کن جز ہوا کرتے تھے۔ یونانی سلوکس نے جو انہی اطراف کا حکمران تھا، ہمسایہ ایرانی سلطنت پر فوج کشی سے پہلے ہاتھیوں کی سپلائی کے لیے ہندوستانیوں سے ”ٹینڈرز“ مانگے۔ چندر گپت مور یہ نے کوہ ہندوکش سے قندھار تک کا علاقہ بطور ”کوٹیشن“ لکھ دیا اور سلوکس کی طرف سے منظوری کا خط آنے پر آرڈر کے مطابق بڑھیا قسم کے فربہ ہاتھی سپلائی کر دیئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سلوکس کا حریف انٹی گوسی میدان جنگ میں ہاتھیوں کی کثیر تعداد دیکھ کر ہی بھاگ نکلا۔ محمود غزنوی بھی اپنی آئے دن کی ہندوستانی مہموں کے لیے ہاتھیوں پر بہت بھروسہ کیا کرتا تھا۔ موسم گرما میں غزنی خوشگوار رہتا مگر سرما کی شدت ان قوی ہیکل جانوروں کو اس نہ آتی اور ان میں سے اکثر فوت ہو جاتے! چنانچہ ایک گرم اور خشک جگہ کی تلاش ہوئی جہاں محمود کے چہیتے ہاتھی سردیوں میں خوش رہ سکیں۔ لشکری بازار کی تعمیر اسی ضمن میں ہوئی۔ اس سے قبل رومنوں نے بھی اپنے جنگی ہاتھیوں کی خاطر شام میں خصوصی شہر تعمیر کر دئے۔ دھوپ کی شدت میں کمی واقع ہو چکی تھی اور بھوری چٹیل اور بنجر زمین پر جا بجا سبزے کے نشان اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ ہماری منزل قریب ہے۔ ڈرائیور نے بتایا کہ ہم ایک گھنٹے تک ہرات پہنچنے والے ہیں۔

پہلے ہوئے ویرانوں کی آغوش میں چلی گئی۔ دائیں ہاتھ ایک بے ہنگم سا پہاڑ آیا جس کی چوٹی پر بابر کی فتوحات کی یادگار ”چہل زنیہ“ ہے۔ یادگار تک پہنچنے کے لیے چالیس پتھرلی میڑھیاں طے کرنی پڑتی ہیں۔ اکبر نے اپنے دادا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اسی یادگار پر اپنی فتوحات کا پوسٹ سکرپٹ لکھوایا۔ بس ایک زوردار جھٹکے سے رُک گئی۔ میں نے باہر جھانکا۔ سڑک سے کچھ دور ریت پر ایک مسافر بس اوندھی پڑی تھی۔ بس کے شکستہ ڈھانچے کی اوٹ میں حادثے میں ہلاک ہونے والے مسافروں کے لاشے پڑے تھے۔ صحرا کی تیز ہوا لاشوں پر ڈالی ہوئی چادروں کو اڑائے لے جا رہی تھی۔ چادر سرتی تو ادھ کھلی آنکھیں، کٹے ہوئے بازو اور بے جان دھڑنظر آ جاتے۔ ایک زخمی مسافر پتھر چُن کر چادروں کے کناروں پر رکھ رہا تھا تھا کہ ہوا کا زور انہیں اڑانہ لے جائے۔ خون سے لتھڑی ہوئی ایک چادر کے نیچے سنہری بالوں کی ایک لٹ ہوا میں پھڑپھڑا رہی تھی۔ کوئی یورپی سیاح تھا جسے موت افغانستان کے صحراؤں میں کھینچ لائی تھی۔ حادثے میں بچ جانے والے مسافر بھی ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ وہ بھوتوں کی مانند ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ ساری فضا میں ایک ناگوار بُورچی ہوئی تھی۔

”حادثہ صبح چھ بجے ہوا۔“ ایک مسافر کہہ رہا تھا۔ ”نزدیک ترین ہسپتال قندھار میں ہے۔ امید ہے طبی امداد آج دوپہر تک پہنچ جائے گی۔“

گھر سے نکلنے کے بعد پہلی بار مجھے سفر کے خطرات اور صعوبتوں کا احساس ہوا۔ دہشت اور خوف کا ایک چھوٹا سا سنبولیا جو پہلے سے میرے دل کے کسی کونے ٹھہرے میں چھپا بیٹھا تھا۔ شراب سے باہر نکلا اور اپنا ننھا منہ چھن لہرانے لگا۔ تمہارے ساتھ بھی یہی ہوگا، یہاں نہیں تو ایران یا ترکی میں سہی یا پھر..... پھر کیا؟ میں نے نڈر بننے کی ناکام کوشش کی۔ حادثہ کہاں نہیں ہو سکتا۔ وہاں اپنے گھر کے سامنے سڑک پار کرتے وقت بھی ہو سکتا ہے۔ سنبولیا یہ بات سن کر پھر کسی تاریک کونے میں دبک گیا۔ ہماری بس میں بیٹھے ہوئے مسافروں نے بلند آواز سے مرنے والوں کے حق میں دعائے مغفرت کی اور ہم روانہ ہو گئے۔

دوپہر کو ہم ”گرشک“ پہنچ گئے جہاں سے کچھ فاصلے پر دریائے ہلمند کے کنارے لشکری بازار اور قلعہ بست کے کھنڈرات ہیں۔ محلات، مسجدیں، حفاظتی برج، فصیلیں اور بلند محرابیں صحرا میں بکھری پڑی ہیں۔ لشکری بازار غزنوی سلطانوں کا سرمائی دار السلطنت تھا۔ ترکوں

سے بھر پورا ڈے میں جا کھڑی ہوئی۔ ہم نے اپنا سامان اتارا اور اڈے سے باہر ایک وسیع اور کشادہ پتھرلی سڑک پر آ نکلے۔ سامنے ”ہوٹل بہراڈ“ کا بورڈ دیکھ کر ہم اندر چلے گئے۔ ہوٹل صاف ستھرا اور مناسب تھا۔ ڈیسک سے کمرے کی چابی لے کر ہال میں داخل ہوئے تو سامنے سیاحوں سے درخواست کے بورڈ پر نظر پڑی۔ ”یہاں چرس پینا ایک حد تک منع ہی سمجھیں۔“ ٹھنڈے پانی کے غسل نے تمام دن کی سستی اور تھکن دور کر دی۔ کھانے کے لیے نیچے کمرے میں آئے تو وہاں ہڑبونگ مچی تھی۔ زیادہ تر غیر ملکی سیاح تھے۔ ایک لمبی داڑھی والے صاحب تین ڈالر وصول کر کے سنوڈنٹ کارڈ جاری کر رہے تھے جنہیں دکھا کر بسوں اور ریل گاڑیوں کے کرائے میں تخفیف کروائی جاتی ہے۔ مجھ سے مخاطب ہوئے تو میں نے کہا: ”مجبوری ہے، میں طالب علم نہیں ہوں۔“

داڑھی پر ہاتھ پھیر کر فرمانے لگے۔ ”تو بر خور دار کارڈ بھی تو جعلی ہیں۔“

دوسری میز پر ایک فاقہ زدہ پتی براجمان تھا۔ میں نے ہرات کی تاریخی عمارات کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگا: ”چرس کے سگریٹ کا ایک کش مجھے ان زمانوں میں لے جاتا ہے جب ان عمارات کی تعمیر ہو رہی تھی۔ اب دیکھ کر کیا کروں۔ پچھلے دو ماہ سے ہرات میں ہوں۔ چرس پیتا ہوں اور سوتا ہوں۔“

علی سامنے بیٹھی ہوئی امریکی لڑکیوں کی طرف دیکھ کر برابر مسکرائے جارہا تھا۔ وہ اٹھ کر ہماری میز پر آ گئیں۔ ”میں کوکا کولا پیوں گی۔“ علی نے فوراً منگا دیا۔ بل آیا تو معلوم ہوا، تین روپے کا ہے اور ایران سے درآمد شدہ ہے۔ کوکا کولا پی کر لڑکی نے اپنی نیلی پتلون کی جیب سے ایک بھورے رنگ کی ڈلی نکالی اور میز پر رکھ دی۔ ایک سگریٹ کا آدھا حصہ تمباکو سے خالی کر کے ڈلی کو مارجس جلا کر پکھلایا اور تمباکو میں بڑی مشاقی سے مل دیا۔ اس مرکب کو سگریٹ کے خالی حصے میں بھرا اور ایک لمبا کش لگا کر علی کی طرف بڑھا دیا۔ ”بیو۔“

”یہ کیا ہے؟“ علی بالکل بوکھلا گیا۔

”چرس اور کیا؟“ اور اس نے دھواں علی کے منہ پر بکھیر دیا۔ علی نے دبی زبان میں

موچی دروازے کا پیدائشی حق استعمال کیا اور ہم کھانا کھائے بغیر ہوٹل سے باہر آ گئے۔

ہرات کے بڑے بازار میں خوب رونق تھی۔ قدیم وضع کی تنگ دکانوں کے باہر خوبصورت پوستینیں، کھالیں، مندے اور خراسانی قالین بچے ہوئے تھے۔ مجھے ہلکے بھورے رنگ

ہرائے

”اور جب سکندر اعظم جنوبی پہاڑوں کی طرف سے نیچے آیا تو اس نے وادی کے دامن میں ایک قدیم کاروان شہر ”ہرائے“ کے بالمقابل ایک اور ”سکندریہ“ کی بنیاد رکھی اور اپنی فوج کے مفلوج سپاہیوں کو وہاں آباد کر کے خود آگے بڑھ گیا۔“

(ہیرالڈ لیمب)

ہماری بس ایک خشک پہاڑی کو عبور کر کے ایک ہری بھری وادی میں داخل ہو گئی۔ سامنے ہری رود یعنی ”دریائے ہری“ بہہ رہا تھا۔ ”ہری، ہرائے اور آریہ“ تینوں ہرات کے قدیم نام ہیں۔ دریا کے پار سڑک کے دونوں طرف چیز کے درختوں کی قطاریں دور تک چلی گئی تھیں۔ وادی کی ہریا دل اور درختوں کے سبزے کو میری دکھتی ہوئی آنکھوں نے اپنے اندر سمولیا۔ میں نے آج تک جتنے بھی شہر دیکھے ہیں، ان میں سے کوئی بھی اتنی خوبصورت سڑک کے اختتام پر نہیں ہے۔ دس بارہ میل کا یہ ٹکڑا دونوں طرف سے مختلف قسم کے درختوں اور پھلوں کے باغات سے بھرا پڑا ہے۔ چیز کے انہی درختوں کو ایرانی مصوروں نے موتیوں کی ایک مالا سے تشبیہ دی اور ہرات کو اس کے درمیان میں جڑا ہوا یا قوت کہا گیا۔

درختوں سے پرے مٹی کی دیز دیواروں کے پیچھے خوبصورت رہائشی مکانات سرو کے درختوں میں چھپے ہوئے تھے۔ مشرق نے ہمیشہ سے ہی باطنی خوبصورتی کو ظاہر پر ترجیح دی ہے۔ ہم شہر میں داخل ہوئے تو شام ہو چکی تھی۔ بس ایک تنگ دروازے میں سے گزر کر ایک گندے اور تعفن

کی ایک پوتین پسند آگئی جس کے گلے اور بازوؤں پر سفید دھاگے کی کڑھائی بے حد بھلی لگ رہی تھی۔ موسم سرما کے لیے خراسانی گذریوں کا روایتی لباس۔

”خالص قراقلی ہے“ دکان دار نے کہا۔ ”آپ کے لیے صرف تین ہزار افغانی۔“ سودا پندرہ سو میں طے ہو گیا۔ میں نے پوتین پہن کر دکان کے شیشے میں دیکھا، خاصا سارٹ لگ رہا تھا۔ ہم سیر کرتے ہوئے بڑے چوراہے تک آ گئے جو پورے ہرات کا مرکز ہے۔ چوک سے بائیں ہاتھ جاتی ہوئی سڑک کے آخر میں مسجد جامی کے میناروں اور گنبدوں کا ہلکا سا خاکہ تاریکی میں نظر آ رہا تھا۔ ایک بوڑھا افغان فٹ پاتھ پر بیٹھا گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے سینوں پر بھون رہا تھا۔ ہم نے وہیں کھڑے ہو کر چند شخص کھائیں اور واپس ہوٹل کی طرف چل دیے۔ راستے میں بوند باندی شروع ہو گئی جو ہوٹل پہنچنے تک تیز بارش میں بدل چکی تھی۔ میں نے کمرے میں جا کر کھڑکی کھولی تو ہرات کی کچی گلیوں کی سوندھی خوشبو سارے کمرے میں پھیل گئی۔ سڑک کے پار قبوہ خانے میں چند افغان کوئی قدیم خراسانی لوک گیت بلند آواز میں الاپ رہے تھے۔ بستر کے ساتھ سفید دیوار پر کسی مچھلی سیاح نے سرخ لپ سنک سے ”ہوٹل، بہزاد“ لکھا ہوا تھا جس کے نام نے مجھے مسحور کر دیا۔ میرا پسندیدہ مصور بہزاد جو ایرانی نقاشی کی تاریخ میں بقائے دوام حاصل کر چکا ہے۔ اسی شہر میں پیدا ہوا۔ وہ تیموری سلطان حسین مرزا کے دربار میں مصاحب تھا۔ اس زمانے میں ہرات تیمور کے سمرقند سے بھی دولت مند اور حسین تھا۔ اس نے تیمور کے عسکری کارناموں پر مبنی ایک مصور کتاب تخلیق کی جس کی تصاویر رنگوں کے حسین امتزاج کا نمونہ تھیں۔ نیلے، نارنجی اور گہرے سبز رنگ۔ بہزاد کی تصاویر میں زندگی حرکت کرتی نظر آتی۔ انسان، جانور، درخت، صحرا سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے۔ مختصر تصویر کشی میں بہزاد بلاشبہ سب سے بلند ہے۔ آج شہر بہزاد کے اکثر باشندے اس کے نام سے بھی نا آشنا ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی جائے ولادت کا تعین بھی نہیں کیا جا سکا۔ میں انہی خیالات میں مگن تھا کہ نیند نہ آئی۔

دوسری صبح ہم ناشتے کے لیے ایک قبوہ خانے میں چلے گئے۔ تنور کے ساتھ مٹی کے فرش پر دردی پکھی تھی۔ الاؤ کی حدت فرش میں سرایت کر کے ہم تک پہنچ رہی تھی۔ تازہ میٹھی بالائی اور گرم نانوں کے بعد قبوہ آ گیا۔ پیالیوں کی تہ میں باریک چینی پہلے سے موجود تھی۔ آپ قبوہ پیالی میں

انڈیلے تو چینی ایک ایک تہ خود بخود گھل جائے گی اور آخری پیالی تک آپ کا ساتھ دے گی۔ آج ہرات کی سیر کا پروگرام تھا۔

ہرات اور قدیم تاریخ کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ کسی زمانے میں اس کی خوبصورتی ضرب المثل تھی۔ ایک پرانی کہات کے مطابق خراسان ایک صدف تھا جس میں ہرات ایک آبدار موتی کی طرح چمک رہا تھا۔ 1340ء میں ابن بطوطہ کا یہاں سے گزر ہوا تو اس نے اپنے سفرنامے میں لکھا: ”پھر ہمارا شہر ہرات میں وارد ہوا۔ یہ خراسان کے تمام شہروں میں سے زیادہ آباد ہے۔ خراسان کے شہر بڑے بڑے ہیں جن کی تعداد چار ہے۔ ان میں دو یعنی ہرات اور نیشا پور آباد ہیں اور دو یعنی بلخ اور مرو ویران پڑے ہیں۔“

قدیم تاریخ میں اس علاقے کو ”آریا“ یا ”آریانہ“ یعنی نسل آریہ کا مسکن کہا جاتا تھا جو بعد میں بگڑ کر ”ہری“ ہو گیا اور پھر ہرات کے نام سے مشہور ہوا۔ شہر کے جنوب میں ”ہری رود“ یعنی دریائے ہری اب تک اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ 327ء قبل مسیح میں سکندر اعظم نے اسے ”آرتاکونا“ کا یونانی نام دیا اور اس کے بالمقابل ایک نیا شہر ”سکندریہ“ آباد کیا۔ فرشتہ کی تاریخ کے مطابق 651ء میں حضرت عثمانؓ کے گورنر عبداللہ بن امیر کے ہاتھوں ہرات فتح ہوا اور ایران کی مسلم سلطنت کا ایک حصہ قرار دیا گیا۔ ان دنوں یہاں کی اکثر آبادی حضرت زرتشت کی پیروکار تھی۔ غزنوی سلطانوں اور سلجوق ترکوں کے بعد یہ شہر خوارزم کے سلطانوں کے زیر نگیں آ گیا۔ اس دور میں ہرات خوبصورت عمارات اور زمین کی زرخیزی کی وجہ سے مشہور ہوا۔ ایران اور طوران کی خوں ریز جنگوں کے باوجود ہرات کی خوشحالی میں کوئی فرق نہ آیا اور یہ ایک ایسا اہم تجارتی مرکز بن گیا جہاں سمرقند، بخارا، دہلی اور دمشق سے آتی ہوئی عظیم شاہراہیں آپس میں ملتی تھیں۔ ایک تاریخی دستاویز کے مطابق 1219ء میں ہرات میں بارہ ہزار دکانیں، ڈیڑھ لاکھ رہائشی مکانات، ساڑھے تین سو مدرسے، چھ ہزار حمام، سرائے، پن چکیاں اور درجنوں شاہی محلات تھے۔ یا قوت نے اسے خراسان کا امیر ترین اور سب سے بڑا شہر قرار دیا۔ امن و آشتی کی اس فضا میں چنگیز خاں کے حملے نے زہر گھول کے رکھ دیا۔ ہراتی تاریخ دان خوند میر کے مطابق چنگیز خاں کے دو حملوں میں پندرہ لاکھ سے زائد شہری قتل ہوئے۔ سب سے پہلے 1219ء میں چنگیز خاں نے ہرات کو تباہ کیا لیکن سلطان جلال الدین نے کمال شجاعت سے تاتاریوں کو مار بھگا یا۔ تین برس بعد ایک مرتبہ

پھرتا تاری حملہ آور ہوئے اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

ہرات زندگی کی ایک رواں دواں لہر تھی اور چند سالوں میں ہی انہی کھنڈرات سے ایک نئے ہرات نے جنم لیا جسے غوری سلطانوں کے تحت ایک مرتبہ پھر ”چمن ایشیا“ کے لقب سے پکارا جانے لگا۔ اس کے کوچہ و بازار میں یہ کہات عام ہو گئی کہ ہرات ہی دنیا کا خوبصورت ترین شہر ہے۔ دائی امن اور خوشحالی شاید اس شہر کے مقدر میں نہ تھی۔ 1381ء میں امیر تیمور وسط ایشیا کے ترکوں کی معیت میں سمرقند سے نکلا اور ہرات پر حملہ آور ہوا۔ شاہی خزانے کے بیش قیمت جواہرات، طلائی تاج اور تمام سونا چاندی جیہوں کے پار سمرقند میں منتقل کر دیا گیا۔ شہر کی فصیلیں مسمار کر دی گئیں اور حفاظتی دروازے اکھاڑ کر فتح کی یادگار کے طور پر تیمور کی جائے پیدائش کیش میں بھجوا دیئے گئے۔ ہرات ایک مرتبہ پھر اجڑ چکا تھا۔ تقریباً آٹھ سال بعد جب امیر تیمور نے خراسان، سیدستان اور ماژندران کے علاقے اپنے بیٹے شاہ رخ کو سونپے تو اس کی نگاہ انتخاب اپنے باپ کے تباہ کئے ہوئے ہرات پر پڑی اور اس نے اسے اپنا دار السلطنت قرار دیا۔ شاہ رخ نے منہدم فصیلیں دوبارہ تعمیر کروائیں اور شہر کے حفاظتی دروازے کیش سے واپس لا کر نصب کروا دیئے۔ سمرقند کے ماہر معماروں کو شہر کی تعمیر نو پر مامور کیا گیا۔ شاہ رخ کا عہد ہرات کی تاریخ کا حسین ترین دور ثابت ہوا۔ وسط ایشیا کا یہ دار السلطنت اب مشرقی شہروں کی ملکہ کے نام سے پکارا جانے لگا۔ اس کا حکمران تلوار کا دھنی ہونے کے علاوہ انصاف پسند اور انتہائی پرہیزگار بھی تھا۔ شاہ رخ کی حسین ملکہ گوہر شاد نے ہرات کو خوبصورت اور عالی شان محلات سے سجا دیا۔ آج شہر سے باہر ایک لٹ و دق صحرا میں اس حسین ملکہ کے مقبرے کے کھنڈرات بکھرے پڑے ہیں۔ مقبرے کے شکستہ گنبد کی دیدہ زیب نیلی اینٹیں خراسان کی جتنی دو پہر میں چمکتی ہیں تو ویرانے میں نیلگوں رنگوں کی لہریں ابھرنے لگتی ہیں۔

شاہ رخ کی وفات کے فوراً بعد اس کے بیٹے اور شاہی خاندان کے متعدد شہزادوں کے درمیان تخت کے لیے خانہ جنگی شروع ہو گئی جس میں سلطان حسین مرزا فتح یاب ہوا اور 1470ء میں تخت نشین ہوا۔ حسین مرزا کو سائنس کے علاوہ فنون لطیفہ سے بھی بے حد دلچسپی تھی۔ اس کے دربار میں شاعروں اور مصوروں کو غلبہ حاصل تھا۔ بہزاد ان میں سے ایک تھا۔ 1505ء میں سلطان حسین مرزا فوت ہو گیا۔ ہرات کی شہرت اور خوبصورتی اس نکتے پر آ کر ٹھہر گئی۔ حسین مرزا کے بیٹوں کی دعوت پر کابل اور غزنی کا حکمران بابر ہرات گیا جہاں اُس کا فقید المثال استقبال کیا

گیا۔ ”تذکرہ بابر“ کے صفحات میں بابر کی ہرات سے بے پناہ وابستگی پائی جاتی ہے۔ اس کا بیٹا ہمایوں شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر ہندوستان سے فرار ہوا تو اسے ہرات میں ہی پناہ ملی۔ اس کے بعد ہرات کا شاندار دور بدتر ترقی تنزل پذیر ہوتا گیا اور اس کی شہرت کا سورج گہنا گیا۔

آج کا پرانا ہرات چند قدیم عمارات، کچے مکانات اور غلیظ بازاروں پر مشتمل ہے۔ البتہ شہر کے نواح میں گورنمنٹ کے دفاتر، ایئر پورٹ اور نئی آبادیاں جدید تہذیب کی مظہر ہیں۔ اہل ہرات کو اپنے تیموری عہد سے بے حد لگاؤ ہے۔ ملکہ گوہر شاد کی خوبصورتی، حسین مرزا اور شاہ رخ کی شجاعت کی داستانیں خراسانی لوک گیتوں میں ڈھل چکی ہیں۔ ہرات کی خوبصورت ترین عمارت مسجد جامع شہر کے جنوبی کنارے پر واقع ہے۔ باہر سے مسجد کی وسعت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو اس کے وسیع صحن اور گنبدوں نے ہمیں اس کی عظمت اور خوبصورتی کا احساس دلایا۔ مسجد بالکل ویران پڑی تھی۔ رات کو بارش سے میناروں اور گنبدوں کی دیدہ زیب اینٹوں کی نیلا ہٹ اور نمایاں ہو چکی تھی اور تمام عمارت غیر مرئی طور پر شفاف نیلگوں آسمان میں جذب سی ہو گئی تھی۔ اکثر جگہ نیلی اینٹیں اور پتھر اکھڑ چکے تھے جن کی مرمت کا کام جاری تھا۔ مسجد کے برآمدے میں چند ہنرمند کاریگری اینٹوں کی تراش خراش میں مصروف تھے۔ مسجد کی موجودہ صورت 1200ء میں غیاث الدین غوری کے دور میں ظہور پذیر ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان نے یہ مسجد مشہور بزرگ فخر الدین راضی کے لیے تعمیر کروائی۔ راضی کا مزار مسجد سے ملحقہ ان کے حجرے میں واقع ہے۔

شہر سے باہر ملکہ گوہر شاد کے مقبرے کے قریب شیخ بیقرار کے مدرسے کے چار سربریدہ مینار کھڑے ہیں۔ 1858ء میں انگریز افواج نے مدرسے اور مسجد کو منہدم کر دیا تاکہ حملہ آور اسی عمارت کی چھت پر اپنا توپ خانہ نصب کر کے شہر پر گولہ باری نہ کر سکیں۔

ہم جب ہرات چھوڑ رہے تھے تو بیقرار مدرسے کے پر شکوہ مینار صحرائی وسعتوں میں دراز قد زرافوں کی طرح گردنیں اٹھائے کھڑے تھے۔ ان کی بلندی اور خوبصورتی پر وقت کی تباہ کاریاں بھی اثر انداز نہ ہو سکی تھیں۔

رہے تھے، ایک سیاہ فام جنگلی خاتون ان پر فدا ہو گئیں اور اس نے انہیں اپنے جھونپڑے میں رات بسر کرنے کی دعوت دی اور پھر وہ سرد آہ بھر کے اپنے خضاب رسیدہ بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے: پھر کیا بتاؤں کہ رات کیونکر کٹی۔ آپ تو اپنے بچوں کی طرح ہیں۔ پھر انہوں نے بتایا کہ اطالیہ سے یونان سمندری جہاز کے ذریعے سفر کر رہے تھے کہ ایک یونانی لیڈی نے..... وغیرہ وغیرہ اور پھر گاہے گاہے آنکھیں بند کر کے گنگناٹا شروع کر دیتے۔ ہم ابھی شیخ صاحب کی رومانی داستانوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ہرات کی جانب سے ایران آئل کمپنی کا ایک دیو پیکر آئل ٹینکر نمودار ہوا جو ظاہر ہے ایران کی طرف ہی جا رہا تھا۔ میں نے ڈرائیور کو آرسی ڈی کے واسطے سے ایران کے سرحدی قصبے یوسف آباد تک لے جانے کی درخواست کی۔ اس نے ہامی بھر لی۔ ”ایک آدمی کے لیے تو گلی سیٹ پر جگہ ہے اور باقی حضرات ٹینکر کی چھت پر سوار ہو جائیں۔ کرایہ پچاس افغانی پیشگی“، ہم نے شیخ صاحب کی بزرگی کو مد نظر رکھتے ہوئے انہیں اگلی سیٹ الاٹ کر دی اور خود ٹینکر کی آہنی سیڑھی کے ذریعے چھت پر چڑھ گئے جو خاصی بلند تھی۔ پٹرول کی ٹینکی پر لوہے کی سلاخوں کا جال تھا جس پر بیٹھنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے سامان بچھا کر لیٹ گئے اور جنگل کو مضبوطی سے تھام لیا۔

”ہوشیار باش“ ڈرائیور نے انجن سٹارٹ کرتے ہوئے خبردار کیا۔ ٹینکر ارنابھینے کی مانند ڈکراتا ہوا حرکت میں آیا اور ہم عازم ایران ہوئے۔ طاقت ور انجن کی چھکار کچی سڑک کے سینے سے دھول کا غبار اٹھاتی اور ہم اس کی لپیٹ میں آ کر بھوت بن جاتے۔ نائر تلے ایک چھوٹا سا کنکر بھی آ جاتا تو ہم ہوا میں اُچھل جاتے۔ میں چھپکلی کی مانند اوندھے منہ لیٹا سلاخوں سے چٹنا ہوا تھا۔ اپنی حالت پر ہنسی بھی آرہی تھی اور پھر خوف بھی کہ خواہ مخواہ ٹینکر پر سواری کی حماقت کی۔ اگر یہ دیوالٹ جائے تو ہزاروں گیلن پٹرول بھسم کر کے رکھ دے گا۔ چند میل کی مسافت کے بعد جب اُچھل کود اور دھول پھانکنے کی عادت ہو گئی تو میں نے سر اٹھا کر علی کی جانب دیکھا۔ وہ ایک کونے میں لیٹا مزے سے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ سگریٹ؟ میرا دماغ اُلٹ گیا۔

”علی!“ میں نے چیختے ہوئے کہا۔ ”سگریٹ بچھا دو۔“

”وہ کیوں؟“ اس نے ایک اور کش لگا کر کہا اور اسی لحظے اس نے جلتا ہوا سگریٹ ہوا میں اُچھال دیا۔ اس کو خطرے کا احساس ہو چکا تھا۔ علی کا رنگ بالکل زرد تھا۔

شہر ہزارہ سے شہر خیام تک

کشمم کی دو عمارتوں اور ایک ہوٹل پر مشتمل اسلام قلعہ کی سرحدی چوکی ہرات سے تقریباً دو گھنٹے کی مسافت پر واقع تھی۔ افغان کشم سے جلد ہی فراغت ہو گئی اور ہم کشم ہاؤس سے باہر سڑک پر سواری کی تلاش میں آن کھڑے ہوئے یہ سرحد دوسری بین الاقوامی سرحدوں سے مختلف ہے۔ افغان سرحد عبور کرتے ہی ایران نہیں آ جاتا بلکہ دونوں ملکوں کے درمیان دس بارہ میل کا ایک ویران ٹکڑا ہے جو No Man's Land ہے یعنی کسی ملک کی ملکیت میں نہیں۔ چونکہ یہاں باقاعدہ آمد و رفت کا انتظام نہیں، اس لیے اس ویرانے کو عبور کرنے کے لیے آپ اپنی تخلیقی صلاحیت، ہمت، اچھی کبھی کا بیک وقت مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ ہم اس منی صحرا کو پائے کی فکر میں تھے کہ تین پاکستانیوں سے ملاقات ہو گئی جو سڑک پر دھڑنا مارے جمائیاں لے رہے تھے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ہم بھی انہی کے برابر سامان زمین پر رکھ کر بیٹھ گئے اور سواری کی راہ تنگے لگے۔ دو حضرات تو بندر عباس سے کویت سمنگ ہونے کی فکر میں تھے اور تیسرے جو ذرا ادھیڑ عمر کے تھے اور چہرے مہرے سے ذرا بھی سپورٹس مین نہیں لگتے تھے، سیالکوٹ کی کسی سپورٹس فرم کے لیے آرڈر لینے نکلے تھے۔ منزل یورپ تھی۔ دوپہر سے شام ہو گئی لیکن اس پار جانے کا کوئی بندوبست نہ ہو سکا۔ سیالکوٹ کے شیخ صاحب جو عرصہ دراز سے کاروبار کے سلسلے میں ہر سال یورپ اور افریقہ جاتے تھے، ہمیں اس دوران میں اپنے دوروں کے دلچسپ واقعات سناتے رہے۔ زیادہ تر ذکر ان کی ذاتی وجاہت اور کشش کا تھا جو بقول ان کے صنف نازک کے لیے بہت حد مہلک ثابت ہوتی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ ایک مرتبہ جب وہ سوڈان میں گھوم پھر

دور تار یکی میں یوسف آباد کی برقی روشنیاں ٹٹمار ہی تھیں۔ ٹینکر کسٹم ہاؤس میں داخل ہوا تو ہم سر سے پاؤں تک دھول میں اٹے پڑے تھے اور جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ حافظ و سعدی کے دلیں سے ہمارا تعارف انتہائی گرد آ میز اور غیر شاعرانہ انداز میں ہوا۔

یوسف آباد بالکل وائلڈ ویسٹ (Wild West) کے ایک چھوٹے قصبے سے مشابہت رکھتا تھا۔ گرد آلود چوڑی سڑک، چند قہوہ خانے۔ ایک دوسرائیں اور پولیس سٹیشن۔ شب ب سری کے لیے ہم نے ایک قدیم سرائے کا انتخاب کیا جس کے وسط میں بوسیدہ تالاب تھا۔ تالاب کے کائی والے پانی کے اندر خود ر و گھاس کی تہیں تھیں اور اس کے ساتھ باغ میں جنگلی بیلوں اور جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ اس سارے گورکھ دھندے کے چاروں طرف جنگ کوٹھڑیاں تھیں جہاں ہمارا قیام تھا۔ کھانے سے پہلے ہم نے سرائے کے مالک سے غسل خانے کے بارے میں دریافت کیا تو وہ مسکرا دیا: ”ایران میں غسل خانے نہیں، حمام ہوتے ہیں۔ سرائے کے پچھواڑے والی گلی کے کونے پر چلے جائیے۔“

میں اور علی جب حمام کے بلند و بالا چوبی دروازے سے اندر داخل ہوئے تو یوں محسوس ہوا جیسے الف لیلے کے کسی طلسمی غار کا دہانہ کھل گیا ہو۔ خادم نے بڑھ کر سلام کیا اور توہلیوں اور چادروں کا بنڈل ہمارے ہاتھ میں تھما دیا۔ سفید اور نیلی ٹانکوں سے مزین ہال کمرے کے درمیان سنگ مرمر کے بنے ہوئے خوبصورت تالاب میں فوارہ ابل رہا تھا۔ تالاب کے گرد کا تمام فرش ایرانی قالینوں سے ڈھکا ہوا تھا جہاں ایرانی دہقان کمرے کے گرد چادریں باندھ بیٹھے تھے۔ بعض چائے سے دل بہلا رہے تھے اور چند خادموں سے مالش کروانے میں مصروف تھے۔ کمرے کے چاروں طرف حمام ہی حمام تھے۔ خادم نے ایک حمام کا دروازہ کھول کر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ حمام دو حصوں پر مشتمل تھا۔ میں نے اپنے دھول سے اٹے ہوئے کپڑے تہہ کر کے تھڑے پر رکھ دیئے اور ساتھ والے حصے میں چلا گیا جہاں گرم اور ٹھنڈے پانی کے ٹل لگے تھے۔ گرم پانی کی تیز دھار میرے جسم کی ساری تھکن اور گرد بھا کر لے گئی۔ لذت اور سکون کی خوشگوار لہر نے مجھ پر غودگی طاری کر دی اور میری آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ میں بہت دیر تک نہاتا رہا یہاں تک کہ میری انگلیوں کے گول سرے پچک سے گئے اور میں وہاں سے اٹھ کر ساتھ والے حصے میں

چلا آیا۔ یہاں میں نے ایک چادر اپنی کمر کے گرد باندھ لی اور دوسری کندھوں پر ڈال کر تھڑے پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں بھاپ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ سامنے دیوار پر آویزاں قد آدم آئینے کی غم آلود سطح پر میرا دھندلا دھندلا عکس ابھر رہا تھا۔ میں اس وقت ایک مونٹاروسن لگ رہا تھا جو ٹوگا باندھ کر روم کے کسی شاہی حمام میں بیٹھا ہوا ہو۔ اتنے میں خادم نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور گرم چائے کا ایک گلاس مجھے تھما دیا۔ میں خاصی دیر تک وہاں بیٹھا چائے اور سگریٹ سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

حمام ایرانی تہذیب کا لازمی جزو ہیں۔ رہائشی مکانون میں غسل خانے تعمیر کرنے کا رواج نہیں۔ لوگ گھروں سے تیار ہو کر حمام میں آ جاتے ہیں اور غسل اور مالش کے بعد یہیں سے سیدھے دفتری یا کاروبار پر چلے جاتے ہیں۔ رات کو پارٹی ہو تو کھانے سے پہلے مہمانوں کو اعلیٰ درجے کے حمام میں مدعو کیا جاتا ہے۔ کاروباری معاملات بھی حمام کے ماحول میں بہتر طور پر طے پاسکتے ہیں۔ امتحان نزدیک آ جائے تو طالب علم تالاب کے کنارے چادر باندھ کر بڑے سکون سے مطالعہ کر سکتے ہیں۔

ہم حمام سے باہر نکلتے تو یوسف آباد تاریک اور خاموش تھا۔

دوسری صبح سورج طلوع ہونے سے بہت پہلے ہم مشہد کے لیے روانہ ہو گئے۔ بس میں سوار اکثر مسافر مشہد میں حضرت امام رضا کے روٹے کی زیارت کرنے جا رہے تھے۔ خراسان کا زمینی منظر بے حد اکتا دینے والا ہے۔ بھوری بنجر زمین، خشک جھاڑیاں اور چٹیل پہاڑ اتنی باقاعدگی سے نظر کے سامنے آتے ہیں کہ آنکھیں دکھنے لگتی ہیں، لیکن صبح و شام سورج کی کرنیں اس دیران خطے میں بھی رنگ بھر دیتی ہیں۔ اس صبح بھی تاحہ نظر سنہری کرنیں اور خاک کے آن گنت رو پہلی ذرے نیلگوں آسمان کی وسعتوں میں دمک رہے تھے۔ صحر اکا حسن اس کی وسعت اور نیلے آسمان کے امتزاج سے ہوتا ہے اور اس وقت ہماری نظریں خوبصورتی کے اس عظیم شاہکار کی چمک سے خیرہ ہو رہی تھیں۔

دو پہر تک ہم جامی کے شہر تربت جام سے گزر کر شہر فریمان پہنچ گئے۔ افغان شہروں کی دیرانی اور بے ترتیبی کے بعد ایرانی شہروں کی صفائی اور خوبصورتی نہایت خوشگوار تبدیلی تھی۔

تھرے اور کشادہ بازار جن کے گرد پھولوں کی کیاریوں کے ساتھ سفیدے کے درختوں کی قطاریں کھڑی تھیں۔ دکانوں کی سجاوٹ میں سلیقے اور ذوق کا رنگ، خوش پوشاک اور ہنس مکھ باشندے۔ فریمان میں چائے کا وقفہ تھا۔ ہم ایک قبوہ خانے کے باہر فٹ پاتھ پر لگی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ کر شیشے کے صراحی نما نازک گلاسوں میں چائے کا لطف اٹھانے لگے۔ افغانستان کی نسبت موسم خنکی مائل تھا۔ دھوپ کی نرم مہم بے حد بھلی لگ رہی تھی۔ ہماری میز کے ساتھ زمین پر بیٹھا ہوا ایک ایرانی چھوٹے تیشے کی مدد سے قند کے راکٹ نما ککڑے کو چھوٹی چوکر ککڑیوں کی شکل دے رہا تھا۔ اس کے تیشے کی ہر چوٹ اتنی پتی تلی ہوتی کہ جال ہے جو کسی بھی ککڑی کے حجم یا وضع میں ذرہ برابر فرق آئے۔ ایک ماہر سنگ تراش کی مانند اس کی ہر کاٹ ایک شاہکار کو جنم دے رہی تھی۔ تیشے کا ایک وار قدرے ترچھا پڑا تو قند کی ایک ڈلی دھپ سے سفید اولے کی مانند ہماری میز پر آگری۔ میں نے جلدی سے ڈلی اٹھا کر منہ میں رکھ لی اور ایرانی قند تراش کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ ”بالے بالے“ اس نے گردن ہلائی اور ہنسنے لگا۔ سامنے گل و رنگ میں رپے ایک قطعے کے درمیان فرینت تراشی کی باریکیوں سے یکسر مہر اشاہ کا مجسمہ نصب تھا۔ ”اسے بھی پتھر کی بجائے قند کا ہونا چاہیے۔“ میں نے منہ میں گھلتی ہوئی شیرینی کا مزہ لیتے ہوئے سوچا۔ اتنے میں ڈرائیور نے ہارن بجایا اور تمام مسافر پھر سے بس میں سوار ہو گئے۔ فریمان کے بعد بیابانی کچھ کم ہونے لگی۔ کہیں کہیں خشک پہاڑوں کے دامن میں جنگلی گل لالہ کے سرخ قالین بچھے ہوئے تھے۔

پچھلے پہر ہم مشہد کے نواح میں پہنچے۔ شہر کے افقی خطوط میں سب سے نمایاں امام رضا کے روضے کا سنہری گنبد تھا جو دوسری تمام عمارتوں سے بلند دھوپ میں چمک رہا تھا۔ بس اڈے پر کھڑی ہوئی۔ فیصلہ ہوا کہ روضے کی زیارت سے پیشتر شیش سے تہران روانہ ہونے والی گاڑی کا وقت دریافت کر لیا جائے۔ مشہد کا ریلوے شیشن حال ہی میں تعمیر ہوا ہے۔ جدید فن تعمیر کے نمونے کی ایک کشادہ اور وسیع عمارت جس کی چھت ایک خصوصی حیثیت کی حامل ہے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ ستونوں کے بغیر کھڑا ہوا اتنا بڑا اور اونچا چھت بھی گر پڑے گا۔ بہر حال اس روز تو بچاؤ ہو گیا۔ اندر داخل ہوئے تو معلومات اور ٹکٹوں کی کھڑکیاں بند تھیں اور پورا حال بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ ایک خاکروب سے معلوم ہوا کہ صبح ایک گاڑی تہران سے آتی ہے جو شام کو واپس چلی جاتی ہے۔ وقفے

میں شیشن کے عملے کے ارکان گھر جا کر قیلولہ فرماتے ہیں۔ شیخ اور دوسرے پاکستانی ابھی تک ہمارے شریک سفر تھے۔ انہوں نے انتظار خانے کے بیچ پر استراحت کا ارادہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مشہد سخت مذہبی شہر ہے۔ مجھے موافق نہیں آ سکتا۔ آپ لوگ زیارت کرا آئیں، میں سامان کی رکھوالی کرتا ہوں۔“

شیعہ مسلمانوں کے نزدیک مشہد، امام کے روضے کی نسبت سے کربلا اور نجف کے بعد سب سے زیادہ تقدس رکھتا ہے۔ روضے کے صدر دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی دونوں طرف تبرکات کی متعدد دکانیں ہیں۔ حضرت علیؑ، حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ کی رنگدار شبیہیں، تسبیحیں، مذہبی قطعے، کیلنڈر، خاک پاک اور ہر مرض کے لیے چاندی کے تعویذ۔ میں نے تھیلے سے اپنا مسودی کیمرو نکالا اور لینز پر آنکھ جما کر روضے کے بڑے گنبد کو فوکس میں لے لیا۔ اس سے پہلے کہ میں فلم بنانے کے لیے بٹن دباتا۔ کسی کے آہنی ہاتھ نے ایک جھٹکے سے کیمرو چھین لیا۔ میرے سامنے روضے کا مسلح محافظ سینٹا نے کھڑا تھا۔

”فوتو ممنوع“ اس نے قہر آلود نظروں سے میری طرف گھورتے ہوئے کہا۔ میرا جی چاہا وہ ایک نظر اُن دکانوں پر بھی ڈالے جہاں روضے کی رنگین تصویریں بک رہی تھیں۔ ”شما خارجی۔“ فوتو ممنوع“ اس نے میرے بڑھے ہوئے بالوں اور کپڑوں کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا۔ خارجی کے لفظ پر علی بدک گیا۔ ”تم خارجی ہو گے۔ میں شیعان حیدر کراڑے سے تعلق رکھتا ہوں۔ قزلباش سمجھ؟ اور یہ بے چارہ بھی مسلمان ہے۔“ ثبوت کے طور پر اس نے اپنے گلے کا تعویذ محافظ کے سامنے لہرا دیا۔ تعویذ پر کلمہ طیبہ تحریر تھا۔ ”بالے بالے“ محافظ نے معذرت کرتے ہوئے کہا اور میرا کیمرو واپس کر دیا۔

ہم شاہ عباس کے تعمیر کردہ بڑے دالان میں داخل ہوئے جس کی تمام دیواریں نیل بوٹوں سے آراستہ نیلے ٹائلوں سے مزین تھیں۔ میناروں پر سونے کا ملمع چڑھایا گیا تھا۔ ہر دیوار کے درمیان ایک بلند دروازہ تھا جس کے پہلو میں حجروں کی قطاریں تھیں۔ دالان میں ایران اور دنیا کے ہر خطے سے آئے ہوئے مسلمان عورتیں، مرد جمع تھے۔ بعض نماز میں مشغول اور زیادہ تر آدھ بکا میں مصروف..... امام رضا کی ولادت 770ء میں ہوئی۔ خلیفہ وقت مامون الرشید کی خواہش تھی کہ کسی طرح مسلمانوں کے دو بڑے فرقے شیعہ اور سنی ماضی کے اختلافات بھلا کر متحد

ہو جائیں۔ اس کوشش میں مامون نے امام رضا کو اپنا جانشین مقرر کیا اور ساتھ ہی اپنی بیٹی ان کے عقد میں دے دی۔ 819ء میں امام رضا زہریلے انگور کھانے کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔ شیعہ تاریخ دانوں کے مطابق مامون الرشید نے امام کو ایک دعوت دی اور دسترخوان پر سجے ہوئے انگور کے خوشوں کے چند دانوں میں زہر بھر دیا۔ امام نے کھانے کے دوران خاص طور پر زہر آلود انگور کے دانوں سے اجتناب کیا۔ اس پر مامون نے بذات خود وہ انگور امام کو پیش کیے۔ امام رضا اپنے دوست کی دعوت ٹھکرانہ سکے۔ انگور چکھ کر وہ فوراً ہی دسترخوان سے اٹھ کھڑے ہوئے اور دروازے کی جانب چل دیئے۔ مامون نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی امام کو پکار کر کہا: ”رضا کہاں جا رہے ہو؟“ امام رضا نے پلٹ کر جواب دیا: ”مامون جہاں تم مجھے بھیجنا چاہتے تھے۔“ یہ روایت کہاں تک درست ہے، اس کا فیصلہ تو مستند تاریخ دان ہی کر سکتے ہیں۔ بہر حال اس کا راوی دانش گاہ تہران کے شعبہ تاریخ کا ایک طالب علم تھا۔ دوسری روایت کے مطابق امام کو طوس کے دہقانوں نے شہید کیا تھا۔

امام رضا، مامون کے تعمیر کردہ روضے میں دفن ہوئے اور ان کے بعد مامون کی وصیت کے مطابق اسے امام کے قدموں میں دفن کیا گیا۔ آج زائرین مقدس لحد کی زیارت سے قبل خلیفہ مامون الرشید کی قبر پر تھوکتے اور لعنت بھیجتے ہیں۔ ذہن میں کئی سوال ابھرتے ہیں۔ کیا مامون الرشید واقعی ایک ظالم اور ریاکار شخص تھا جس نے امام کی بے پناہ مقبولیت سے ہراساں ہو کر انہیں قتل کروا دیا۔ امام کو جانشین مقرر کرنا اور ان کے پاؤں میں دفن ہونے کی وصیت صریحاً فریب تھا یا پھر رضا کے بچپن کا دوست مامون ایک مخلص انسان تھا جس نے رضا کو اپنا جانشین بنایا۔ اپنی بیٹی عقد میں دے دی۔ اس کی موت پر پہروں روتا رہا۔ عالی شان مقبرہ تعمیر کروایا اور پھر مرنے کے بعد بھی اپنے دوست سے جدا ہونا پسند نہ کیا۔

ہم نے اپنے جوتے اتار کر باہر بیٹھے ہوئے خادم کے حوالے کئے اور چاندی کے بڑے دروازے سے روضے کی عمارت میں داخل ہو گئے۔ اندر ہال میں زائرین کا بے پناہ جھوم تھا۔ لوگ جہاں چاہتے فرش پر لیٹ جاتے۔ سجدہ ریز ہوتے یا چاندی کے دبیز دروازوں کو بے تحاشا چومنا شروع کر دیتے۔ طویل مدت میں کروڑوں عقیدت مندوں کے ہونٹوں سے مس ہوئی یہ چاندی اور مصفا اور چمک دار ہو گئی تھی۔ ماحول میں عقیدت اور جذبے کی شدید لہر دوڑ رہی

تھی۔ ہال کی چھتیں سونے، چاندی اور شیشوں سے مرصع تھیں اور سارا فرش بیش بہا قالینوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ زائرین کے ریلے نے مجھے بھی روضے کی طرف دھکیل دیا۔ جوں جوں روضے کی جالی قریب ہو رہی تھی، زائرین کی آہ و بکا اور گریہ زاری میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ جدید مغربی لباس پہنے ہوئے ایرانیوں کے دوش بدوش خراسانی چرواہے اور ترکمان خانہ بدوش تھے جن کی نگاہیں ہال کے وسط میں چاندی کی جالی کے بیچ سیاہ ریشمی پردوں میں ملفوف امام کی قبر پر تھیں۔ وہ روتے، آہیں بھرتے، جالی کا طواف کرتے اور پھر دیوانہ وار اس کی قبر سے لپٹ جاتے۔ مریض اور لاچار اپنا عیوان جالی سے رگڑتے اور امام سے شفا کی بھیک مانگتے۔ ان کی آنکھیں عقیدت کی گرمی سے جل رہی تھیں۔ جذبہ ان کو کسی اور جہان میں لے گیا تھا۔ وہ آج امام کی معصومیت کا حصہ بننے آئے تھے۔ مجھ پر بھی ایک اضطرابی کیفیت طاری ہو گئی۔ آج ایک معصوم درویش کو عوام کی عقیدت اور جذبے کی معراج نے اس جگہ لاکھڑا کیا تھا جہاں شہنشاہوں کا گزر بھی نہ تھا۔ شاہ عباس پایادہ اپنے دار السلطنت اصفہان سے یہاں آیا۔ دائمی عظمت کا سرچشمہ واقعی عوام ہوتے ہیں۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے جالی کو چھوا اور پھر پیچھے ہٹ کر ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ میرے ساتھ کھڑے ہوئے سیاہ پوش درویش نے ہاتھ اٹھا کر درود پڑھا اور میں بھی اس کے ساتھ شریک ہو گیا۔ روضے کے باہر دالان میں بالکل خاموشی تھی۔ دھوپ میں سنہری گنبد چمک رہے تھے۔ میں اسی اضطرابی حالت میں صحن کے ساتھ ساتھ چھوٹے سے راستے میں سے گزر کر مسجد گوہر شاد میں داخل ہوا تو ایک دم مکمل خاموشی اور گہرے سکون کا احساس ہوا۔ ساری مسجد نیلی روشنی کے سمندر میں نہائی ہوئی تھی۔ خراسان کی ملکہ اور تیور کی بہو گوہر شاد کی تعمیر کردہ یہ مسجد ایران کی خوبصورت ترین مسجدوں میں شمار ہوتی ہے۔ نیلے ٹائلوں کا کام اتنا دیدہ زیب ہے کہ ایک فرانسیسی سیاح نے اسے دیکھ کر کہا تھا: ”مسجد گوہر شاد کی نیلی دیوار ہی پورا ایران ہے۔“

تہران جانے والی گاڑی جب سٹیشن سے باہر نکلی تو مشہد کا شہر آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ امام رضا کے روضے کا سنہری گنبد چھتوں اور کشادہ بازاروں سے بلند نیلے آسمان میں ایک سنہری گولے کی مانند اٹکا ہوا تھا۔

”روزِ محشر اولین پیغمبران حضرت نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ اور ان کے ساتھ

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) علی، حسین اور حسن جنت کے سب سے اونچے درجے میں ہوں گے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ایک پردہ کھینچ دیں گے۔ دوسری طرف ان لوگوں کے لیے جگہ ہوگی جنہوں نے اماموں کے روضوں کی زیارت کی اور امام رضا کے روضے پر حاضری دینے والے کا مقام ان سب میں سے بلند ہوگا۔“ (ایک ایرانی روایت)

مشہد سے تہران تقریباً سولہ گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ خوش قسمتی سے ہم سب کو ایک ہی کیمین میں جگہ مل گئی۔ کھانے کے ڈبے میں ایک عدد ”خوراک مرغ“ نوش کرنے کے بعد کچھ دیر کے لیے تاریخ ایران اٹھالی اور اس کی ورق گردانی کرتا رہا مگر گاڑی کے شور اور میرے ساتھی کے بے ہنگم خراٹوں نے میرے مطالعے میں خلل ڈال دیا۔ میں نے کیمین کی روشنی گل کردی اور سونے کی تیاریاں کرنے لگا۔ باہر مکمل تاریکی تھی اور دُور دُور کسی آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔

شاید نصف شب ہوگی جب مجھے سخت پیاس لگی۔ میں پانی کی تلاش میں سوئے ہوئے مسافروں کے جسم پھلانگتا غسل خانے تک گیا، لیکن پانی کا ٹل سوائے شوشوں کی آواز کے اور کچھ برا مد نہ کر سکا۔ میں مایوس ہو کر واپس کیمین میں آ گیا اور پھر اونگھنے لگا۔ یکا یک گاڑی ایک زوردار دھچکے سے رُکی اور میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے کھڑکی کا پٹ اوپر چڑھا کر باہر جھانکا۔ کوئی چھوٹا سا قصبائی اسٹیشن تھا۔ غمگیناں ہوئے مدم روشنی کے ایک قمتے کے علاوہ سارا اسٹیشن تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہمارے ڈبے سے ذرا پرے میاں لے پلیٹ فارم پر پانی کا ایک ٹل نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور گاڑی سے اتر کر سیدھا ٹل پر چلا گیا۔ ٹوٹنی گھمائی تو خشک پانی کی تیز دھار میرے کپڑوں کو تر کرتی ہوئی پلیٹ فارم پر پھیل گئی۔ میں نے ٹوٹنی کا ٹلو پیچھے گھا کر پانی کا زور کم کیا اور اس کے نیچے تھیلی پھیلا کر اپنے خشک اور گرد آلود ہونٹ بہتے ہوئے پانی کی سطح پر بہا دیئے۔ سامنے چھت سے ٹلکتے ہوئے بورڈ پر اسٹیشن کا نام لکھا تھا جو تاریکی کی وجہ سے صاف پڑھا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے اپنی کوتاہ نظری کو آنکھیں میچ کر کم کرنے کی کوشش کی۔ یکدم فارسی اور انگریزی کے حروف بورڈ کی سطح سے نکل کر میرے سامنے آ کھڑے ہوئے: ”نیشاپور“، اسٹیشن کی تاریکی چھٹ گئی اور رنگ اُبلنے لگے۔ کُل لالہ چٹکے، ارغوانی لہریں اُبھریں اور شوخ و شنگ ندیاں گنگنا نے لگیں۔ عمر خیام کا نیشاپور۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ شعر و خواب کی یہ وادی

مشہد اور تہران کے درمیان پڑتی ہے۔ مجھے اپنی کم علمی پر سخت ندامت ہوئی۔

عطار کا مقتل، خیام کا مدفن، سلجوق طغرل بیگ کا پہلا دارالسلطنت جہاں دنیا کی عظیم ترین رصد گاہ تعمیر ہوئی۔ جو نیلے اور نازک ظروف کا مرکز تھا۔ انگریز فٹنر جیرلڈ نے عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا اور وقت کے سب سے بڑے مہندس اور ماہر فلکیات کو بطور شاعر مغرب سے روشناس کیا۔ فٹنر جیرلڈ تیسرے درجے کا شاعر تھا جس کا کلام زبان زد عام نہ ہوا تو اس نے پانچ چھ برس سرسری طور پر فارسی زبان کا مطالعہ کر کے خیام کی رباعیات کو مغرب کے پسندیدہ فلسفہ نشاط کا رنگ دے کر لوگوں کے سامنے پیش کر دیا۔ اہل مغرب مشرق کی رومانوی پڑیا میں بندھے۔ ”باہر بہ عیش کوش“ کا زہر تریاق سمجھ کر پھانک گئے۔

فارسی کے جید علماء رباعیات کے ترجمے کی صحت پر اعتراض کرتے تو فٹنر جیرلڈ کہتا: ”خوبصورت ترجمہ خوبصورت عورت کی مانند وفادار نہیں ہو سکتا۔“ حال ہی میں امریکی شاعر رابرٹ فراسٹ نے ایک افغان کی مدد سے رباعیات کا ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ ایک قدیم نسخے سے کیا گیا اور فراسٹ کا کہنا ہے کہ اس میں خیام کی شاعری کو کسی رد و بدل کے بغیر پیش کیا گیا ہے تاکہ اس کی روح برقرار رہے جبکہ فٹنر جیرلڈ میں یہ چیز مفقود ہے۔ مغربی نقادوں نے فراسٹ کی اس مخلصانہ کوشش کو سراہنے کی بجائے الٹا اسے مطعون کیا۔ انہوں نے جیرلڈ کے ترجمے کو ایک تھکی مٹی چڑیا سے تشبیہ دی جو فضائے بسیط میں محو پرواز ہے اور فراسٹ کا ترجمہ اس کے مقابلے میں ایک ایسے حنوط شدہ عقاب کی حیثیت رکھتا ہے جو کالرس پر بے جان پڑا ہے۔

مرد آہن کی ایک دلدوز چیخ نے مجھے خواب و خیال کی اس رنگین وادی سے کھینچ کر ایک نیم تاریک، قصبائی اسٹیشن پر پٹنچ دیا جہاں ٹل کے نیچے میری تھیلی خشک پانی کی بوچھاڑ سے بخ ہو چکی تھی۔ میری پیاس ختم ہو چکی تھی۔ ساکن پلیٹ فارم پر گاڑی حرکت میں آئی اور میں بھاگ کر اپنے ڈبے میں سوار ہو گیا۔ صبح ہوئی تو ناشتے کے لیے کھانے کے ڈبے میں چلا گیا۔ تلے ہوئے ختم مرغ نان کے ساتھ کھائے اور پھر شیریں چائے پی کر وہیں بیٹھ گیا۔ ہم تہران کے نواح میں پہنچ چکے تھے۔ لہلہاتے ہوئے کھیتوں اور سرو کی قطاروں کے پرے کوہ البرز کی برف پوش چوٹیاں سورج کی پہلی شعاعوں سے چمک رہی تھیں۔

آخری سرے پر شاعر فردوسی کا مجسمہ شاہنامہ کی جلد تھا مے ایک ایسے تہران پر نظر ڈال رہا تھا جو اس کے شاہان کے ایران سے کتنا مختلف تھا۔ قدیم اور جدید کے درمیان صدیوں کے فاصلے تھے۔ منی سکرٹ اور شیک Chic میز ڈو والی فراخ دہن گلدی لڑکیاں، پیئر کارڈن کے جدید ترین سوٹوں میں ملبوس اتراتے نوجوان۔ ہر کونے پر آبِ جوخنک دستیاب۔ سینما، نائٹ کلب، کارے، ایک سیل نور۔ ہم خیابان خیابان گھومے۔ سینما ہندی دیکھا جس کے مکالمے فارسی میں تھے اور گانے اردو میں۔ ایک ہوٹل سے کھٹی لسی پی اور چلو کباب کھائے۔ لائبریری اور نفیس چاول، تازہ مکھن اور گرم گرم کباب۔

باہر نکلے، سڑک پر ایک صاحب نے کار روک لی۔ ”کہاں چلے گئے؟“ ہم نے تکلف برتنا چاہا۔ وہ مصر ہو گئے۔ سوان کا دل رکھنے کے لیے بیٹھ گئے اور ہوٹل کا پتہ بتا دیا۔ تہران کے بازاروں میں ابھی تک رونق تھی اور فردوسی کا مجسمہ آسکر وائلڈ کے پپی پرنس کے مجسمے کی مانند اداس اور تنہا کھڑا تھا۔ ہوٹل پہنچ کر ہم نے اپنی فارسی لغت کے تمام الفاظ شکر کیے کے روپ میں ڈھال دیے لیکن کار والے صاحب شاید ہماری بات سمجھ نہ سکے۔ ”براہ کرم چار تو مان کرایہ ادا کر دیجئے۔“ معلوم ہوا تہران میں اکثر لوگ فارغ اوقات میں اپنی کاروں پر مسافر ڈھونے کا کام بھی کرتے ہیں۔ دفتر جاتے ہوئے کسی کو بٹھالیا تو سارے دن کی چارچہ پورا ہو گیا۔ سینما سے واپسی پر اکثر سواری مل جاتی ہے۔ چلو ٹکٹ کے پیسے پورے ہو گئے۔ یہ طریقہ زائد آمدنی کا ذریعہ بھی ہے اور لوگوں کو سہولت بھی رہتی ہے۔ چنانچہ ہم نے کرایہ ادا کیا اور ہوٹل میں چلے آئے۔

دوسری صبح میں نے سکھد پ کو فون کیا۔ وہ فوراً اپنی سپورٹس کار میں میرے ہوٹل پہنچ گیا اور نہایت تپاک سے ملا۔ ولایت میں سکھد پ اور میں ایک ہی کالج میں زیر تعلیم تھے۔ دراز قد، ہنس مکھ اور مخلص ہونے کے علاوہ اس میں سکھوں کی تمام خصوصیات کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ سکھد پ کے والد مہاراجہ پٹیلالہ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور عرصہ دراز سے ایران میں کاروبار کے سلسلے میں سکونت پذیر تھے۔ ولایت سے واپسی ہوئی تو وہ ہمیشہ عید اور نوروز کی مبارکباد کا کارڈ بھیجتا۔

”یار بڑی سر پر اندی ہے تم نے۔ مجھے اطلاع تو کر دیتے۔“ اس نے اپنی گھنی داڑھی

نبلی شراب کی آبشار

تہران پہنچے تو شیخ صاحب نے مشورہ دیا: ”بچو، پانساں پلستان اوّل درجے کی جگہ ہے۔ وہیں قیام کیا جائے۔“ سٹیشن سے باہر نکلے۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور نے ”پاکستانی برادر“ کا نعرہ لگایا اور پھر ”بسم اللہ“ پڑھ کر ہمارا سامان ٹیکسی کی چھت پر رکھ دیا۔ ٹیکسی سٹارٹ ہوئی اور ایک جھٹکے سے تہران کی ٹریفک میں گڈمڈ ہو گئی۔ خیابان ناصر خسرو تک کے دو میلوں میں ڈرائیور نے ٹریفک کے ہر اصول کی خلاف ورزی کی اور سڑک کے تمام دوسرے کینوں کا شجرہ نسب فر فر سنایا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ”گرینڈ پری ریس“ میں حصہ لینے کی مشق کر رہا ہو۔ میں نے ڈرتے ڈرتے شیخ صاحب سے پوچھا: ”یہ جھٹی تو نہیں؟“ انہوں نے مجھے کچوکا دیتے ہوئے جواب دیا: ”بیٹے یہ تہران ہے، یہاں سب چلتا ہے۔ اس بھلے مانس نے تو ایک آدھ کار کو گزرنے کا راستہ بھی دے دیا ہے۔“

”پانساں پلستان“ جس کا قدیمی نام ”مسافر خانہ اطمینان نو“ تھا بس یونہی سی جگہ تھی۔ ہم کپڑے بدل کر باہر جانے کے لیے تیار ہوئے تو شیخ صاحب نے ایک اور نادر مشورے سے نوازا: ”بچو، سب سے پہلے بازار حسن کی سیر کو چلا جائے۔“ ہمارے گستاخانہ انکار پر بے حد مایوس ہوئے اور سر ہلا کر فرمایا: ”کسی شہر کی خوبصورتی کا پیمانہ وہاں کا بازار حسن ہوتا ہے اور یہ تاریخی عمارتیں اور عجائب گھر وغیرہ دیکھنا تو محض وقت کا زیاں ہے۔“

ہم وقت ضائع کرنے کے لیے جب باہر نکلے تو شام ہو چکی تھی۔ ہلکی کھر میں تہران کی لاتعداد روشنیاں جھلملارہی تھیں۔ میدان سپاہ کو پار کر کے ہم خیابان فردوسی پر آ نکلے جس کے

میں انگلیوں سے لنگھی کرتے ہوئے کہا۔ ”آخر ملے ہو۔“

”پیارے سردار جی، ان انجانی ملاقاتوں کا کچھ اور ہی مزا ہے۔“

”اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ میں تمہیں آج تہران کی سیر کراؤں گا۔ بولو، کیا دیکھو گے؟ گلستانِ پیلِس میں تختِ طاؤس کے بارے میں کیا رائے ہے؟“

”تختِ طاؤس ہمارا تھا۔ غیر کے قبضے میں اپنی چیزیں دیکھ کر مجھے خوشی نہیں ہوتی۔“ میں نے جواب دیا۔

”اچھا پھر بیٹھو کار میں اور پھر واگور جو کرے سو کرے۔“

سکھد پپ نے کار سارٹ کی اور میدانِ سپاہ سے نکل کر شاہِ رضا کی طرف موڑ دی۔ موسمِ بے حد خوشگوار تھا اور آسمان ایک ایرانی شاعر کے الفاظ میں ”نیلی شراب کی آبشار“... تھوڑی دیر میں ہم زیریں تہران سے نکل کر شمران کی طرف جا رہے تھے۔ تہران کا یہ حصہ کوہِ دماوند کے پہلو میں واقع ہے اور باقی شہر سے دو ہزار فٹ بلند ہے۔ سخت گرمیوں میں جب خیابانِ فردوسی تپنے لگتا ہے تو شمران میں بہار کا موسم ہوتا ہے۔ پُر رونق بازار اور بلند عمارتیں پیچھے رہ گئیں تو فضا میں موٹروں کے ہارن اور شہری ہنگاموں کے شور غل کے بجائے سڑک کے پہلو میں گنگنائی ندی کا شور۔ ان گنت پرندوں کی چہچہاہٹ اور پہاڑی چشموں کی نزلِ رل ابھرنے لگی۔ خنکی بندرت بڑھ رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف پھولوں کے تختوں اور گھنے سرسبز چناروں کی قطاریں تھیں۔ ہم اس پُر پیچ سڑک پر کوئی موڑ مڑتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے گھنے چنار ہمارا راستہ روک لیں گے۔ ان کی شاخیں ہمارے عین اوپر آپس میں یوں گتھی ہوئی تھیں کہ سبزے اور خنکی کی ایک سرنگ سی بن گئی تھی۔ خنک ہوا کا پھیڑا آتا اور چنار کے سرخی مائل چوڑے پتے ہماری کار پر بارش کے قطروں کی طرح برسنے لگتے۔

سکھد پپ نے در بند کے بلیوارڈ نو میں کار پارک کی اور ہم ایک پتھریلی چٹان میں سے تراشی ہوئی سیڑھیاں طے کر کے ایک پُر فضا اوپن ایئر ریسٹورانٹ میں آ گئے۔ جو میز ہم نے منتخب کی، اس کے ساتھ ہی ایک پہاڑی چشمہ اُبل رہا تھا۔ تمام میزوں کے وسط میں آرائش کے لیے گل دانوں کے بجائے رنگ برنگے ننھے ننھے پرندوں کے پنجرے رکھے تھے۔ ماحول سراسر رومانوی تھا۔ میں نے سکھد پپ کی گھٹی داڑھی اور بسنتی پگڑی کی طرف دیکھا۔ وہاں دوستی اور

خلوص کے جذبات تو تھے مگر رومان.....

”کیا بیو گے؟“ سکھد پپ نے لہرا کر پوچھا۔ اس پر بھی ماحول کا اثر ہو چکا تھا۔

”تحصیل پھالیہ کی کھٹی لسی جو تہران میں بھی ملتی ہے۔“

”اوئے۔“ اس نے بُرا سامنہ بنایا۔ ”ابھی تک ملے ہو۔“

”تم بھی تو سکھ کے سکھ ہی رہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”یک آب جو خنک و جگر مرغ“ اس نے ویٹر سے مخاطب ہو کر کہا۔

سکھد پپ کا فارسی لہجہ بالکل اہلِ ایران کی مانند تھا۔

چار آب جو چڑھانے کے بعد سکھد پپ منوڈ میں آ گیا۔

”یار تمہیں یاد ہے ہماری پہلی ملاقات کیسے ہوئی تھی؟“ اُس نے آب جو کا گھونٹ بھر کر

کہا: ”کالج کا سالانہ قصہ تھا اور تم ہمیشہ کی طرح ایک کونے میں اکیلے بیٹھے سگار پی رہے تھے اور تم جانو اگر وہاں کا خالصہ تمباکو نہیں پیتا صرف ”لسی“ پیتا ہے۔ دہی کی نہیں صرف جو کی۔ ہال کچا کھج بھرا ہوا تھا۔ میں نے تمہاری میز پر بیٹھنے کی اجازت چاہی تو تم نے سگار کا دھواں میرے منہ پر بکھیر دیا اور بوڑھے انگریزوں کی طرح منہ گاڑ کر کہا: ”پلیز یور سیلف اولڈ بوائے!“ ساری شام انگریزی بول بول کر میرے توجڑے بھی دُکھنے شروع ہو گئے تھے۔ کچھ اثر ”لسی“ کا بھی تھا۔ میں نے چڑ کر کہا: ”بادشاہو، جے پنجابی اوتے پنجابی وچ گل کرو۔ گوریاں دی بولی انگریزی دی لت کیوں توڑ دے او۔ اولڈ بوائے۔“

”ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”اور پھر تم نے مجھ سے شرط لگائی

کہ اگر وہیلری جو کالج کی سب سے حسین اور مغرور لڑکی تھی، ہماری میز پر آ جائے تو تم مجھے دیسی گھی میں تلے ہوئے قیتے کے پراٹھے کھلاؤ گے۔“

”آہو“ سکھد پپ نے خوش ہو کر کہا: ”وہ سُری تمہارے ایک دفعہ کہنے پر اپنے

مذاحول کو چھوڑ کر ہماری میز پر اُٹھ آئی اور میں نے تمہیں اسی رات پراٹھے کھلائے۔“

بھلا میں یہ سب کچھ کیسے بھول سکتا تھا۔ ان پراٹھوں کی وجہ سے میری لینڈ لیڈی نے مجھے نوٹس دے دیا۔ نصف شب جب رقص ختم ہوا تو میں گھر واپس آ کر اپنے کمرے میں سو گیا۔ رات کے پچھلے پہر کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے بستر سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ لینڈ لیڈی غصے

میں لال بھسوکا نائٹ گاؤن پہنے کھڑی تھی۔ ”تمہارا کوئی مہمان نیچے لگا تار گھنٹی بجارہا ہے۔ رات کے اس پہر مہمانوں کو بلانا مہذب طریقہ نہیں ہے۔ میرا کمرہ صبح تک خالی ہو جانا چاہیے۔“ میں نیچے گیا تو دروازے کے باہر سکھ دیپ ہاتھ میں پراٹھے لیے دانت نکال رہا تھا۔

”خالصے نے گھر جاتے ہی تمہارے لیے یہ دیسی گھی میں تلے ہوئے قیتے کے پراٹھے تیار کیے اور ابھی لے آیا۔ بھلا شرط پوری کرنے میں خالصہ دیری کیسے کر سکتا ہے؟“

اس حادثے کے بعد میں اور سکھ دیپ گھرے دوست بن گئے۔ وہ پٹیا لہر طرز کی پگڑی باندھتا اور اس کے وسط میں روزانہ ایک مختلف رنگ اور حجم کا پتھر اٹکا لیتا۔ لڑکیاں پوچھتیں تو کہتا: ”میرا باپ ہاتھیوں کا سب سے بڑا شکاری ہے اور اس کی اپنی ریاست ہے۔ یہ میرے اس نے مجھے ولایت آتے وقت بطور جیب خرچ دیئے تھے۔“ چنانچہ وہ بے حد مرعوب ہوتیں اور ان میں سے ایک آدھ رات کے کھانے کی دعوت قبول کر لیتی۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگا: ”یار، پٹنی کوٹ لین کے ایک کباڑیے سے بارہ شٹلنگ میں خریدے تھے۔ عام رنگدار شیشہ ہے۔ ذرا یہ میسین خوش ہو جاتی ہیں۔“

اور آج برسوں کے بعد اچانک میل ہو گیا تھا۔ لنڈن کا بے پروا مسٹر سنگھ اب تہران کا ایک بہت بڑا سوداگر تھا اور بیوی بچوں سمیت شہر کے نواح میں ایک خوشنما بنگلے میں رہتا تھا۔ اس کی بے ساختہ دوستی اور خلوص ابھی تک جوں کا توں تھا۔

ہمارے سامنے پرانے آتش فشاں کوہ دامنہ کی چوٹی سے برف پگھل پگھل کر شران کی ندیوں اور چشموں کو سیراب کر رہی تھی۔ ”تم تو جانتے ہو گے ایک مقامی حکایت کے مطابق کوہ دامنہ کی برف پوش چوٹی پر سیرخ کا بیرا ہے جس کی ایک آنکھ ہمیشہ باضی پر اور دوسری مستقبل پر رہتی ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”تہران میں باضی اور مستقبل دونوں فضول چیزیں ہیں۔“ سکھ دیپ نے آپ جو کا جھاگ منہ سے پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ ”یہاں صرف حال کی حکمرانی ہے۔ ماضی کی تلاش میں پرس پالس جاؤ جسے سکندر کی رقاصہ تانکس نے ایرانیوں سے اتھرنی آتش زدگی کا انتقام لینے کے لیے جلا دیا تھا یا پھر اصفہان، جسے نصف جہان کہتے ہیں۔ یار، یہ کیا بور باتیں کر رہے ہو۔ سیرخ کو چھوڑو اور جگر مرغ کی طرف دھیان دو۔“

میں نے چٹپٹا بھٹنا ہوا جگر مرغ کھایا۔ نہایت لذیذ تھا۔

”جگر مرغ کے بعد اب تمہیں مچھلی کھلائی جائے گی۔ لندن کی بد ذائقہ اینڈ چیس نہیں بلکہ دریائے خراج کی مچھلی.....“

تھوڑی دیر میں ہم شہر شمالی سے اتر کر تہران شہر کی وسیع سڑکوں پر تھے۔ سکھ دیپ اپنی کار کے طاقتور انجن کا پورا پورا استعمال کر رہا تھا اور سپیڈومیٹر کی سوئی سوا اور ایک سو بیس کلومیٹر کے درمیان تھرک رہی تھی۔ ”ذرا احتیاط سے چلاؤ، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ میں نے ”لسی“ کے اثرات مد نظر رکھتے ہوئے کہا۔

”فکر نہ کرو پیارے، میں نے ڈرائیونگ کا امتحان لنڈن سے پاس کیا ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ میں نے مرعوب ہوئے بغیر جواب دیا۔ ”ایک ہی ممتحن نے جب تمہیں دس مرتبہ ڈرائیونگ کے امتحان میں فیل کر دیا تو گیارہویں مرتبہ تمہارے یہ کہنے پر کہ صاحب جی! گلے ہفتے خالصہ ہمیشہ کے لیے ولایت چھوڑ رہا ہے۔ آپ کے بچے جیس اس مرتبہ پاس کر دو۔ بڑی کرپا ہوگی۔ اس نے تمہیں رعایتی نمبر دے کر پاس کر دیا۔“

”وہ سسر تو ویسے ہی سکھوں کے خلاف تھا۔“ سکھ دیپ نے ایکسیلیٹر پر اور دباؤ ڈالتے ہوئے غصے سے کہا۔

تہران شہر خاصا پیچھے رہ گیا تھا اور خراج کے قصبے سے گزرنے کے بعد اب ہم دریائے خراج کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے۔ دریا سڑک اور پتھریلی چٹانوں کے درمیان سرپیختا ہوا بڑے زور شور سے بہہ رہا تھا۔ دریا کے کنارے درختوں کی گھنی چھاؤں میں لوگ پتھروں پر بیٹھے ہوئے دیدہ زیب قالینوں پر بیٹھے پنک منارہے تھے۔ آج تعطیل تھی اور سارا تہران اس پُر فضا وادی کی رنگینیوں کا لطف اٹھانے کے لیے آمد آیا تھا۔ ایک موٹر پر دریا گھنے درختوں کی اوٹ میں ہو گیا۔ ہم نے سڑک کی ٹکڑ پر کاکڑی کی اور وادی میں اترتی ہوئی کچی سبزھیاں طے کر کے دریا کے کنارے واقع ریسٹوران میں آ گئے۔ بلند درختوں میں خوشگوار خنک ہوا کی سرسراہٹ اور ساتھ بہتے ہوئے دریا کے شور میں زندگی کی لہر تھی جس میں میں بھی ڈوب گیا۔ اوپن ایئر ریسٹوران کے درمیان ایک کچے تالاب میں خراج سے پکڑی ہوئی مچھلیاں اُچھل رہی تھیں۔ آپ اپنی پسند کی مچھلی خود ہی پکڑیے اور ویٹر کے حوالے کر دیجئے۔ وہ میز کے ساتھ ایک چھوٹا سا باورچی خانہ ایستادہ کر کے

آپ کے سامنے یہ مچھلی بڑی نفاست اور سلیقے سے تل دے گا۔ ہم پانی میں ہاتھ ڈالتے تو مچھلیاں ہتھیلی میں گدگدی کر کے پھسل جاتیں۔ چنانچہ اپنے کپڑے تریتر کرنے کے بعد فیصلہ ہوا کہ یہ فرض دیگر ہی پورا کرے۔

کھانے کی تیاری کے دوران میں سکھد یپ ایرانی واڈ کا سے حظ اٹھاتا رہا۔ ”مچھلی کھانے سے پیشتر مسوڑھے ضرور گرم ہونے چاہئیں اور اس کا رخیر کے لیے واڈ کا لا جواب چیز ہے۔ ان نمکتوں کے پاس شیرازی ارغوانی شراب موجود نہیں ورنہ وہ اس سے بھی بہتر ثابت ہوتی ہے۔“ سکھد یپ خاصا آؤٹ ہو چکا تھا۔

ریستوران کی تمام میز پر تھیں اور اکثر لوگ جو تہران کی اونچی موسائی سے تعلق رکھتے تھے، مے نوشی میں مصروف تھے۔ ہمارے برابر والی میز پر مچھلی سماع گرم تھی جہاں درمیانی عمر کے ایک خوش شکل اور خوش پوشاک ایرانی نے شراب، شباب اور موسیقی کا پورا انتظام کر رکھا تھا۔ اس کے برابر میں کرسیوں پر تین ادھیڑ عمر موسیقار سر بہوڑائے ایران کے روایتی ساز بجا رہے تھے۔ سامنے ایک حسین و جمیل عورت میز پر کہنیاں نکائے بڑی دلنوازی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائے جا رہی تھی۔ پل بھر کے لیے سارنگی خاموش ہوئی۔ دف پر ایک تیز تھاپ پڑی اور ایک موسیقار ہاتھ بلند کر کے کسی عشقیہ غزل کے اشعار اپنے لگا۔ غزل کا اختتام ہوا تو میزبان مراقبے سے بیدار ہوا۔ اپنی محبوبہ سے مخاطب ہو کر غزل کا آخری مصرع جھوم جھوم کر پڑھا اور پھر ہاتھ میں جام لے کر موسیقاروں کے گرد رقص کرنا شروع کر دیا۔ عورت کی کالی بھور آنکھیں رقص کرتے ہوئے بے خود ایرانی کا پیچھا کرتیں اور پھر وہ عجب والہانہ انداز سے ہنسنے لگتی۔ میز کے نیچے اس کے گورے گورے پاؤں دف کی تھاپ پر حرکت کر رہے تھے۔ مچھلی بھی موسیقار کی لوج دار آواز پر کان دھرے اشعار کے معانی سمجھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ ایک غزل کے اختتام پر جب وہ صاحب حسب معمول جام لے کر اٹھے تو سکھد یپ بھی اپنا جام اٹھا کر ان کے ساتھ رقص میں شامل ہو گیا۔ موسیقی ختم ہوئی تو ایرانی صاحب جام و مینا، سازندوں اور اپنی محبوبہ سمیت ہماری میز پر آ گئے۔ سکھد یپ نے میر تعارف کرایا کہ یہ پاکستان سے آئے ہیں۔ انہوں نے ”الحمد لله“ کہہ کر گلے سے لگا لیا اور سازندوں کو حکم دیا کہ بیان جاری رہے۔

مچھلی تیار ہو گئی۔ واقعی بے حد خستہ اور مزیدار تھی۔

دو پہر ڈھل رہی تھی اور دھوپ کی ملاحیت میں خنکی کا اثر نمایاں تھا۔ میں ریستوران سے اٹھ کر نیچے دریا کی سطح کے قریب ایک پتھر پر جا بیٹھا۔ پانی میں ہاتھ ڈالا تو جیسے کسی نے کاٹ لیا ہو۔ بالکل رخ۔ دریاے خراج کے تیز پانی کے شور اور ہوا کی بھرپور سرسراہٹ کے باوجود سازندوں کی تائیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد سکھد یپ بھی آ گیا۔

”نہانے کا ارادہ ہے کیا؟“ اس نے شرارت سے پوچھا۔

”دریاؤں میں ہم نہیں نہاتے۔ ہاں کیسین سمندر ہو تو الگ بات ہے۔“ میں نے سو سو اسو میل دور رامسر کو مد نظر رکھتے ہوئے بڑبڑائی۔

”نہاؤ گے؟“ اس نے ہانک لگائی۔

”یقیناً۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”تو پھر یہ شرط بھی پوری ہو جائے۔ میں آج تمہیں کیسین ہی میں نہلاؤں گا۔“

سکھد یپ کی سنجیدگی میرے لیے تشویش کا باعث بن گئی۔ طویل فاصلے کے علاوہ کیسین کا راستہ نہایت دشوار اور پُر خطر تھا۔ آب جو اور واڈ کا کے مٹکے چڑھانے کے بعد سکھد یپ جھوم رہا تھا اور اس کے ساتھ ایسے سفر پر جانا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ میں نے بہتیرا سمجھایا لیکن وہ بضد تھا۔ ”میں یہ شرط ضرور پوری کروں گا۔“

میں نے جب صاف انکار کر دیا تو اس نے میری ملتی شجاعت کو نشانہ بنایا۔

”پاکستانی ہو کر ڈرتے ہو؟“ اس طنز نے فیصلہ کر دیا اور ہم البرز کے سلسلہ کوہ میں

گولی کی مانند جا رہے تھے۔ سکھد یپ عمیق گھاٹیوں اور خطرناک موڑوں سے بے پروا ایک ہی رفتار پر اڑا جا رہا تھا۔ سو، ایک سو دس، ایک سو بیس، سپیڈ میٹر کی سوئی ایک سو تیس کلومیٹر کے ہند سے پر جھوم رہی تھی۔ دور سڑک پر کار یا بس نظر آتی اور پلک جھپکتے میں ایک زنائے سے غائب ہو جاتی۔ فراور سرو کے درختوں کے درمیان دریاے خراج کا شفاف پانی ڈھلتی دو پہر کی ملائم دھوپ میں لمحہ بھر کے لیے چمکتا دکھائی دیتا اور پھر نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ دریا کی دوسری طرف بلند چٹانوں کی شکلیں ہر لحظہ بدل رہی تھیں۔ بلند مینار، ہیبت ناک قلعے، خوفناک دیو اور سیاہ غفریتیں۔ ڈوبتے سورج کی روشنی سے عجیب عجیب شکلیں ظہور میں آرہی تھیں۔ ہم نے خراج پر تعمیر کردہ عظیم بند عبور کیا تو موڑ پر گھاٹی کے نیچے سرخ سرخ سیبوں سے لدا ایک باغ نظر آیا۔

سکھدیپ نے فوراً کارروک لی۔

”میں سیب کھاؤں گا۔“ اُس نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

”رہنے دو، میں لادیتا ہوں۔“ میں نے پیشکش کی۔ وہ قطعاً اس حالت میں نہ تھا کہ گھاٹی سے نیچے اتر کر پھر واپس بھی آجاتا۔ میں بڑی احتیاط سے نیچے اتر کر باغ تک چلا گیا۔ پہاڑ کے دامن میں ہونے کی وجہ سے یہاں روشنی بے حد کم تھی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ درخت پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ ”شاید انار ہیں۔“ میں نے اندازہ لگایا۔ ایک سیب یا انار کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میرے بالکل پیچھے ایک حیوانی قسم کی غراہٹ بلند ہوئی۔ میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ مڑ کر دیکھا تو سامنے کین ڈائل کے ہاؤنڈ آف باسکرویل کا ایرانی ماڈل کھڑا تھا۔ گدھے کے قد کا ایک وحشت ناک کتا مجھے گھور رہا تھا۔ وہ اپنے خونخوار دانت تیزی سے کچکاچاتا اور اس کی نم آلود چھوٹی ناک سسرتی اور پھیل جاتی۔ نیم تاریکی میں اس کی آنکھیں مشعلوں کی طرح روشن تھیں۔ وہی گھاٹی جسے اترنے میں پانچ منٹ صرف ہوئے تھے، اب میں نے چند سیکنڈوں میں پھلانگی اور بانپتا ہوا واپس سڑک پر پہنچ گیا۔

”یار سیب نہیں لائے۔“ سکھدیپ نے سنیئرنگ سے سراٹھا کر پوچھا۔

”کٹھ ماروسیوں کو۔“ میں نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”شکر کرو، زندہ بچ گیا ہوں۔ نہایت ہیبت ناک قسم کا کتا تھا۔“ میرا سانس ابھی تک پھولا ہوا تھا۔

”کتا؟“ سکھدیپ نے کار سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہاں نہیں ہوتے۔ بھیڑ یا ہوگا۔“

”بھیڑ یا؟“ میں نے سیٹ سے اُچھلتے ہوئے کہا: ”یہاں ہوتے ہیں؟“

”ہاں، دوسرے درندوں کے علاوہ بھیڑیے بھی ہوتے ہیں۔“

کوہ البرز کی ایک میل لمبی سرنگ عبور کر کے جب ہم دوسرے سرے پر نکلے تو سورج غروب ہو چکا تھا اور ہر طرف تاریکی چھا چکی تھی۔ سرنگ کی پتھریلی دیواروں سے رستے ہوئے پانی کی بو چھاڑنے ہمیں بالکل بھگودیا۔ رات کی تاریکی نے گرد و پیش کے خطروں کو ہماری نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ کار کی تیز روشنیاں اندھیرے کو اور بھی گہرا کر رہی تھیں۔ رات کے دس بجے سکھدیپ نے مژدہ سنایا کہ ہم ماٹنڈران کے صوبے سے گزر کر بحرہ کیسپین کے ساحل پر پہنچ گئے

ہیں۔ گھپ اندھیرے میں صرف لہروں کا شور اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ سمندر قریب ہے۔ ہم ساحل کے ساتھ ساتھ سڑک پر چند میل تک گئے اور پھر دائیں ہاتھ پر ایستادہ ہوٹل کے بورڈ کے ساتھ کار موڑ دی۔ ہم نے وہاں شب ب سری کے لیے کمرہ بک کروایا اور کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔ ہال کی فرانسیسی طرز کی سفید کھڑکیوں سے پرے کیسپین تھا۔

”کیوں پیارے؟“ سکھدیپ جواب بالکل سوہر تھا، شرارت آمیز لہجے میں کہنے لگا:

”کیسپین کا سمندر تمہارے سامنے ہے، لگا دو چھلانگ۔“

میرا خیال تھا کہ وہ اب تک شرط بھول چکا ہوگا۔

”سامنے کہاں ہے تاریکی میں کچھ بھی تو نظر نہیں آتا، صرف لہروں کا شور ہے۔“ میں

نے کھسیانا ہو کر کہا۔ ”اور پھر کیسپین تو سرے سے سمندر ہے ہی نہیں۔ یہ تو دنیا کی سب سے بڑی جھیل کہلاتی ہے۔“

”چلو حساب برابر ہوا۔“ اس نے خوش دلی سے کہا۔ ”ایک شرط میں ہار تھا، ایک تم ہار گئے۔“

رات کے کھانے سے پہلے ویٹر ”کیوی آر“ لے آیا جو کیسپین میں پائی جانے والی

سڑجن مچھلی کا پیٹ چاک کر کے نکالا جاتا ہے اور ہزاروں روپے فی پونڈ کے حساب سے برآمد کر دیا جاتا ہے۔ یورپ میں لوگ اسے فیشن کے طور پر کھاتے ہیں۔ مہنگی اور بد مزہ چیز کھانا بھی سناہری میں شامل ہے۔ آج سے کئی برس پہلے ماسکو کے کریملن میں ایک دعوت کے دوران میں پہلی مرتبہ کھانے کا اتفاق ہوا تھا لیکن وہ ”کیوی آر“ اس سمندر کی دوسری طرف روسی کنارے پر تیار کیا گیا تھا۔ میں نے چکھا تو ذائقے میں ذرہ برابر فرق نہ تھا۔ ابھی تک مچھلی کی بو آ رہی تھی۔ ایک دم سکھدیپ کو کچھ یاد آ گیا۔ ”یار گڑ بڑ ہو گئی ہے۔“ اس نے پریشان ہو کر کہا: ”میری تمہی تو رات کے کھانے پر میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ میں ڈیک سے تہران فون کیے دیتا ہوں تاکہ خواہ مخواہ فکر مند نہ ہو۔ تم بیٹھو۔“ تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا تو کہنے لگا: ”یار، اب واقعی گڑ بڑ ہو گئی ہے۔ میں نے اپنی تمہی کو بتایا کہ آج رات ایک پاکستانی دوست کے ہمراہ رامسر کے قریب ٹھہرنا پڑ گیا ہے۔ اب وہ بھلی لوگ مانتی ہی نہیں۔“

”کیا نہیں مانتی؟“

”بس کہتی ہے دوست وغیرہ کوئی نہیں، تم ضرور کسی لڑکی کے ساتھ ہو۔ ابھی اور اسی

وقت تہران واپس آؤر نہ میں چلی پٹیلے.....“
 ”پھر کیا ارادہ ہے؟“ میں نے میز سے اٹھتے ہوئے کہا۔
 ”جانا پڑے گا۔“

تہران جانے والی سڑک بالکل سناں پڑی تھی۔ رات کو اس سڑک پر بھاری ٹریفک کی بالکل ممانعت تھی اور کاروں والے حضرات پر خطر پہاڑی راستے کے پیش نظر ویسے ہی ہمت نہیں کرتے جب تک ”میں چلی پٹیلے“ کی دھمکی نہ ملے۔ میں نے سکھد پپ کی طرف دیکھا وہ نہایت مشاقی سے کار چلا رہا تھا۔
 ”تم نے مجھے کیسپین تو دکھایا ہی نہیں، صرف لہروں کا شور اور سمندر کی بونگھا دی۔“
 میں نے اسے چھیڑا۔

”پھر کبھی سہی میرے دوست۔“ اس کے لہجے میں تھکاوٹ تھی۔ ”ازدواجی زندگی میں بھی کتنی پابندیاں ہوتی ہیں۔ یاد ہے ہم دونوں لندن کے شیفیس بری ایونیو پر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کس بے فکری سے گھومنا کرتے تھے۔ لڑکیاں کہتیں یہ دونوں نارمل نہیں۔ بھلا دولڑکوں کا ہاتھ پکڑ کر چلنا چہ مٹی۔ یاد ہے تمہاری وہ جنس کتنا جلتی تھی اس بات پر؟ کبھی کوئی خط وغیرہ آیا؟“
 ”اب تو کبھی نہیں آیا۔ اسے اونچی سوسائٹی کی پارٹیوں، جیٹ سیٹ اور سینٹ لارینٹ کے کپڑوں سے دلچسپی تھی۔ ہمیشہ With it رہنے کا جنون اور مجھے ان کھوکھلی اقدار سے اتنی ہی نفرت..... وہ حسین تو تھی ہی سواس نے ایک ادھیر عمر فرانسسی سے شادی رچالی اور اب پیرس سے باہر ایک ”شائو“ میں رہتی ہے۔ سارے پیرس میں مادام جینی جیسی ”ٹیک“ پارٹیاں کوئی نہیں دیتا۔“ میں ماضی کے دھندلکوں میں کھو گیا تھا۔ کوئی موڑ آتا تو کار کی روشنیاں پل بھر کے لیے سڑک سے جدا ہو کر کھائیوں کے پار چٹانوں پر پڑتیں اور پھر واپس آ جاتیں۔ یکدم رات کے سناٹے میں بھونکنے کی آوازیں ابھریں، میں نے مڑ کر کار کے پیچھے اندھیرے میں دفن ہوتی سڑک کی طرف دیکھا۔ لاتعداد روشن اور چمکتی آنکھیں ہمارا پیچھا کر رہی تھیں۔ مشعلوں کے اس جلوس سے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

”کتنے؟“ میں نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی سکھد پپ سے سوال کیا۔

”بھیڑیے۔“ اس نے سڑک پر سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا اور ایکسپریس دبا دیا۔
 مشعلیں اندھیرے میں گم ہو گئیں۔
 البرز کی سڑک کے پار سڑک کے کنارے دو فریب بھالو بیٹھے تھے۔ کار کی روشنی پڑی تو تھوٹھنیاں اٹھا کر نیچے جنگل میں گم ہو گئے۔
 ”کچھ اور بھی باقی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ جنگل بھرے پڑے ہیں۔ سورج کی حرارت رات گئے تک سڑک کے تارکول میں موجود رہتی ہے اور جانور جنگل کی خنکی سے فرار ہو کر یہاں آ بیٹھتے ہیں۔ انہی جنگلوں میں سکندر اعظم ہرکانین نسل کے شیر کا شکار کھیلنا کرتا تھا۔ شیکسپیر کے ڈرامے ”میکبیتھ“ میں اسی شیر کی تندی اور خونخواری کا ذکر آیا ہے۔“

ہم تہران کے نواح میں پہنچے تو صبح کا زب کا سماں تھا۔ ہوٹل کے دروازے کے باہر سکھد پپ نے کار کھڑی کر دی۔

”اب کب ملو گے؟“ اس نے میرے دونوں کندھے پکڑ کر گرجوٹی سے کہا۔
 ”میں کل..... میرا مطلب ہے آج تم پر چلا جاؤں گا۔ میری منزل اندلس ہے۔ الحمرا کے ایوانوں اور قرطبہ کی محرابوں نے مجھے ڈوری میں باندھ رکھا ہے۔ اس ڈور کے آخری سرے پر جا کر دیکھوں گا کہ اسے کون ہلا رہا ہے۔ پھر واپسی انہی راہوں سے ہوئی تو ضرور ملوں گا۔“
 ہم بغلگیر ہوئے تو سکھد پپ جذباتی ہو گیا۔ ”ضرور آنا۔ ہم پھر کیسپین چلیں گے لیکن دن کے اُجالے میں.....“

میں نے اوپر کمرے میں جا کر کھڑکی سے جھانکا تو وہ ابھی تک فٹ پاتھ پر کھڑا تھا۔
 میں نے ہاتھ ہلایا اور بلند آواز سے کہا:

”سکھد پپ، وہ ممتحن جس نے تمہیں دس مرتبہ ڈرائیونگ ٹیسٹ میں فیل کیا تھا نا؟ وہ سُرا واقعی سکھوں کے خلاف تھا۔ تم تو بڑی اچھی کار چلاتے ہو۔“

سکھد پپ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ایڑھیاں اٹھا کر دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کیے اور کار سٹارٹ کر کے تہران کی کُہر آلود صبح میں گم ہو گیا۔

سے اٹھ کر بڑی گرم جوشی سے ہم سے ہاتھ ملائے۔ ان کی گرفت آہنی تھی۔ علی دیر تک اپنا ہاتھ سہلاتا رہا۔ ”میرے سات بیٹے اور بھی ہیں۔ پوتے پوتیوں کی تعداد مجھے ٹھیک سے یاد نہیں رہتی۔ حالانکہ عمر صرف نوے سال ہے مگر حافظہ جواب دیتا جا رہا ہے۔“ میں نے حیرت سے اس کے دیکتے ہوئے سرخ و سپید چہرے کی طرف دیکھا جو جھریوں سے پاک تھا۔

”پنیر بے حد لذیذ ہے۔“ علی نے چٹخارے لیتے ہوئے کہا۔

”ہونا بھی چاہیے۔“ عورت نے خوش دلی سے کہا۔ ”میں نے خود اپنے ہاتھوں سے

پانچ سال قبل بنایا تھا۔“

”یعنی یہ پنیر پانچ سال پرانا ہے؟“ علی نے منہ کھول کر کہا۔

”ہاں۔ ہمارے ہاں پنیر جتنا پرانا ہوتا ہی رغبت سے کھایا جاتا ہے۔“

”آہم۔“ علی نے بمشکل اپنا لقمہ نگلا اور کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

”تمہیں کرد قوم کی جدوجہد آزادی کا تو علم ہوگا۔“ موٹی عورت کا بیٹا مجھ سے کہہ رہا

تھا۔ ”ہم صلاح الدین ایوبی جیسے سپہوؤں کو جنم دینے والی سرزمین کے بیٹے ہیں۔ اگرچہ ہمارا

ملک ایران، عراق اور ترکی کی سرحدوں پر بکھرا پڑا ہے لیکن ہم مصطفیٰ برزانی کی قیادت میں اپنی

منتشر شدہ قوم کو ایک ہی پرچم تلے جمع کرنے کی بھرپور جدوجہد میں مصروف ہیں۔ ہم ایرانی،

عراقی یا ترک نہیں صرف کرد ہیں۔ یہ عارضی سرحدیں ایک دن ختم ہو کر رہیں گی اور تب ہم آزاد

کردستان کی ریاست کی بنیاد رکھیں گے۔ ہمیں کوئی غلام نہیں بنا سکتا۔“ اس کی آنکھوں میں ہلاکی

چمک تھی۔

”کیا تم ہماری آزادی کا نشان روایتی کرد پگڑی دیکھنا پسند کرو گے؟“ چھوٹا بھائی جو

اب تک خاموشی سے ہماری باتیں سن رہا تھا، مجھ سے مخاطب ہوا۔ میں نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔ ”ہاں

ضرور۔“ اس نے اپنی ماں کے پاؤں تلے پڑی ہوئی گٹھڑی کھولی اور دور نگداریشی چادریں نکال

کر ایک اپنے بڑے بھائی کو دے دی اور دوسری خود اپنے سر پر باندھنے لگا۔ دونوں بھائی جب

پگڑیاں باندھ چکے تو نشست سے اٹھ کر ہمارے سامنے اکڑوں کھڑے ہو گئے۔ وہ بے حد وجہہ

اور جری لگ رہے تھے۔ ان کی پگڑیوں کی جھالیں ڈبے کی چھت کو چھو رہی تھیں۔

”ایرانی ریلوے کے ڈبے بدراز قد کردوں کے لیے بے حد تنگ ہیں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

نوح کا پہاڑ

میں اور علی ”راہ آہن ایران“ یعنی ایران ریلوے کی رات کی گاڑی سے تبریز روانہ ہو رہے تھے۔ ہماری گاڑی شیشن سے باہر نکلی تو جگمگاتا تہران نظروں کے سامنے آ گیا۔ شران کے پہلو میں تاریکی میں روپوش کوہ دماوند کے ہلکے افقی خطوط نے مجھے حکایتی پرندے یسرغ کی یاد دلائی جو برف پوش چوٹی پر بیٹھا ماضی اور مستقبل دونوں پر بیک وقت اپنی نظریں گاڑی ہوئے تھا۔ میں نے بھی تہران میں بیٹے ہوئے خوبصورت دنوں کی یاد سے ناٹھ توڑا اور مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ گاڑی کل صبح تبریز پہنچ جائے گی۔ وہاں سے ہم بس کے ذریعے چند گھنٹوں میں ایران کی سرحدی چوکی باز رگان تک چلے جائیں گے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ باز رگان سے ترکی کے شہر ارض روم کے لیے بس مل جاتی ہے اور پھر ارض روم سے ہمیں استنبول کے لیے ڈائریکٹ گاڑی مل جائے گی۔ ”بقیہ سفر کی منصوبہ بندی باسفورس کے کنارے بیٹھ کر کی جائے گی۔“ میں نے سوچا اور ڈبے کے دوسرے مسافروں کا جائزہ لینے لگا۔ ہم دونوں کے علاوہ وہاں صرف دو ایرانی مرد اور ایک موٹی ادھیڑ عمر عورت براجمان تھے۔ سونے سے قبل میں نے کھانے کا ڈبہ نکالا تو موٹی عورت نے فوراً اپنی گٹھڑی سے ایک میلی سی پوٹلی نکالی۔ ”بیٹا، تم ہمارے مہمان ہو۔ کھانا ہمارے ساتھ کھاؤ۔“ اس نے پوٹلی کھول کر سوکھا زرد پنیر اور روٹی ہمارے سامنے رکھ دی۔ موٹی عورت کی آنکھوں سے ممتا کی شفقت ٹپک رہی تھی۔

”ہم کردستان کے رہنے والے ہیں۔“ عورت نے فخر سے کہا۔ ”قرہ دین سے بس

ہمارے پہاڑی قصبے تک جاتی ہے۔ ان سے ملو یہ نمبرے بیٹے ہیں۔“ دونوں مردوں نے نشست

”سرزمین ایران کی طرح۔“ بڑے بھائی نے سنجیدگی سے کہا۔

”ایرانی اتنے بُرے نہیں۔“ موٹی عورت جواب تک بڑے فخر سے اپنے جوان بیٹوں کو دیکھ رہی تھی، کہنے لگی۔ ”سارا تصور تو عراقیوں کا ہے۔“

”اس کا خیازہ بھی تو انہیں بھگتنا پڑ رہا ہے۔“ بڑے بھائی نے مسکرا کر کہا اور پھر تینوں ماں بیٹوں نے ہنسا شروع کر دیا۔

”ہماری بس جب کردستان کی سرحد پر پہنچے گی تو ہم اپنے وطن میں داخل ہونے سے پہلے یہ پگڑیاں باندھ لیں گے۔“ چھوٹے بھائی نے پگڑی کی گرہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”کیونکہ ایرانی لوگ انہیں ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔“

”ایرانی کون ہوتے ہیں انہیں ناپسند کرنے والے؟“ بڑے بھائی نے گرج کر کہا۔
 ”آج ہم نے اپنے پاکستانی بھائیوں کے لیے یہ پگڑیاں باندھی ہیں۔ اب یہ نہیں اتریں گی۔“

چھوٹے بھائی کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی اور اس نے فوراً گرہ مضبوطی سے باندھ لی۔ ماں نے سر ہلا کر بیٹے کے فیصلے کی تائید کی۔

موٹی عورت نے ہم سے بے شمار سوال پوچھے۔ کتنے بہن بھائی ہو؟ دیہات میں لوگ کھیتی باڑی کس طرح کرتے ہیں؟ مسجدوں کے مینار کیسے ہوتے ہیں؟ پنیر بنانے کا رواج کیوں نہیں؟ قزوین قریب آیا تو کہنے لگی۔ ”تم میرے بیٹوں جیسے ہو۔ ہمارے ساتھ گاؤں چلو اور چند روز اپنے کرد خاندان میں بھی گزارو۔“

”میں بھی آپ کو ماں ہی سمجھتا ہوں۔“ اس کے خلوص اور پیار سے متاثر ہو کر میں نے جواب دیا۔ ”لیکن بیٹے ہمیشہ تو ماؤں کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ آج ہمیں اجازت دے دیں، میں کبھی نہ کبھی آپ سے ملنے ضرور آؤں گا۔ شاید اس وقت تک کردستان آزاد ہو چکا ہوگا۔“ قزوین آیا تو ماں نے میرا ہاتھ چوما۔ سلامتی کی دعا دی۔ بھائیوں نے گلے لگا کر خدا حافظ کہا اور پھر تینوں رات کی تاریکی میں گم ہو گئے۔

دوسری صبح ہم تبریز پہنچ گئے جو صوبہ آذربائیجان کا صدر مقام ہونے کے علاوہ تہران

کے بعد ایران کا سب سے بڑا شہر ہے۔ کوہ صامند سے نکلتی ہوئی ندیاں جنوبی وادیوں کو سیراب کرتی ہیں جہاں زمین بے حد زرخیز ہے۔ مشرق کے اکثر شہروں کی مانند تبریز کا حال اس شہر کے شاندار ماضی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ اکثر تاریخی عمارات قدرتی آفتوں اور زمانے کی تباہ کاریوں کا شکار ہو چکی ہیں۔ نیلی مسجد کی چند شکستہ اینٹیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ صدیوں پہلے یہ عمارت ایرانی فن تعمیر کا شاہکار ہوگی۔ ارگ کا حصار بلند فصیلوں اور میناروں کا ایک شکستہ ڈھیر ہے۔ تبریز ایران کے مغل بادشاہوں کا پایہ تخت تھا۔ ارغن خان کی درخواست پر جب خان اعظم نے ایک مغل شہزادی مارکو پولو کی حفاظت میں چین سے ایران روانہ کی تو پولو اسے لے کر تبریز ہی آیا تھا لیکن ارغن خان اس دوران فوت ہو گیا اور چینی شہزادی اس کے بیٹے غازان خان کے پلے باندھ دی گئی۔ مارکو پولو اپنے سفر نامے میں لکھتا ہے۔ ”تبریز عراق کے صوبے میں واقع ہے۔ لوگوں کی اکثریت کُخواب، ریشم اور اطلس کے کاروبار میں ہے۔ شہر کے بازاروں میں ہندوستان، مَول اور ہرموز سے لایا ہوا سامان بکتا ہے۔ اس کے علاوہ جنوبی وادیوں میں قیمتی پتھر دستیاب ہیں۔ تمام شہر باغات سے ڈھکا ہوا ہے۔“

تبریز کی گلیوں میں گھومتے ہوئے مجھے شمس تبریزی اور مولانا روم کی پہلی ملاقات کی روایت یاد آگئی۔ مولانا اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم ہونے کی حیثیت سے دربار شاہی میں عالی مقام رکھتے تھے۔ ایک روز مولانا ایک تالاب کے کنارے بیٹھے مطالعہ میں مصروف تھے۔ شمس ادھر سے گزرے تو کتابوں کے ڈھیر دیکھ کر مولانا سے پوچھا:

”یہ کیا ہے؟“

”یہ وہ ہے جس کی تمہیں خبر نہیں۔“ مولانا جنہیں اپنے علم پر بے حد ناز تھا، طنزاً کہنے لگے۔ ان کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ کتابوں کے ڈھیر میں آگ لگ گئی۔ مولانا نے گھبرا کر شمس سے پوچھا: ”یہ کیا ہے؟“ تو انہوں نے بڑے تحمل سے کہا: ”یہ وہ ہے جس کی تمہیں خبر نہیں۔“ مولانا یہ جواب سن کر بے حد پشیمان ہوئے اور انہیں احساس ہوا کہ روحانیت کے بغیر دنیاوی علم مکمل نہیں ہو سکتا۔ اسی تالاب کے کنارے شمس تبریزی کے ہاتھ پر بیعت کی اور پھر ان کے قتل تک ساتھ رہے۔

ہے؟ آپ اپنے سامان میں جس یا فیم تو نہیں لے جا رہے؟ اگر لے جا رہے ہیں تو مہربانی کر کے وزن لکھ دیجیے وغیرہ وغیرہ۔ سنا ہے ترکی میں منشیات کی سنگٹنگ کا انسداد اسی طرح کیا جاتا ہے۔ سمگلر حضرات فارم پُر کرتے وقت نہایت ایمانداری سے دامن انیون یا چار چھٹانک جس لکھ دیتے ہیں، چنانچہ فوراً دھر لیے جاتے ہیں۔ ایران والے چونکہ سنگلوں کی دیانتداری کو شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں، اس لیے انہوں نے منشیات کا کھوج لگانے کے لیے ایسیشن کتوں کا عملہ بھرتی کر رکھا ہے۔ یہ کتے منشیات کا کھوج کم لگاتے ہیں اور سیاحوں کے سامان میں بندھے ہوئے سینڈویچز اور پیجز زیادہ رغبت کے ساتھ کھاتے ہیں۔

ایرانی کتوں اور ترک کتے سے چھٹکارا حاصل کر کے ہم نے کتے ہاؤس کے وسیع دالان کے پہلو میں واقع بینک سے ایرانی ریال ٹرک لیر میں تبدیل کیے۔ صدر دروازے سے باہر نکل کر ترکی کی سرزمین پر جب پہلا قدم رکھا تو میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میرے سامنے خشک چاندی کی چمکتی ہوئی ایک دیوار کھڑی تھی۔ دامن سے چوٹی تک سفید برف کے بوجھ تلے دبا ہوا بلند پہاڑ جو سرحد کے اس پار سے دھندلا کبر آلود بادل معلوم ہوتا تھا۔ اتنا نزدیک جیسے ہاتھ بڑھاؤ تو ایک چھٹانک سے چھن چھن کر قتی چاندی تمام وادی میں بکھر جائے۔ یہ کوہ آرات تھا۔ روایت ہے کہ طوفانِ نوح کے بعد حضرت نوح کی کشتی اسی پہاڑ کی چوٹی پر لنگر انداز ہوئی تھی۔ آرات کے پہلو میں بے شمار چوٹیوں نے سر اٹھا رکھے تھے لیکن سبھی خشک اور ویران۔ اس مقدس پہاڑ کی عظمت کا اقرار کرتے ہوئے سر بسجود۔

کوہ آرات کے خوبصورت سحر کے خشک بازو مجھے اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔ یکدم ایک تیز اور بے بس تہ ہوا چلنے لگی جو آرات کے پاک دامن سے چھو کر پھسلتی ہوئی نیچے وادیوں میں اترتی اور میرے جسم کو بخ کر جاتی۔ سیٹیاں بجاتی ہوئی تند ہوا کا شور کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھا۔ سڑک کے کنارے مٹی کا بنا ہوا ایک بوسیدہ قبوہ خانہ تھا جس کے باہر چند ٹوٹے ہوئے بیج پڑے تھے۔ قبوہ خانے کا مالک شکستہ دیوار کے ساتھ ایک چھپر کی آڑ لے کر زمین پر بیٹھا دیکھتے کونکوں پر شیش کباب بھوننے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ خشک ہوا کا تھپڑا پہاڑ سے اترتا اور کونکوں کو اڑا لے جاتا۔ میں نے دونوں ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑ کر کانوں پر رکھ لیا اور قبوہ خانے کے بیج پر بیٹھ گیا۔ میں اب بڑی طرح ٹھٹھرنے لگا۔ بیج کے ساتھ ہی میرا سامان پڑا تھا۔

اسی دو پہر ہم ایک بس پر سوار ہو کر ایران، ترک سرحد بازو رگان کی طرف روانہ ہو گئے۔ تبریز سے باہر نکلتے ہی بلند و بالا پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آذربائیجان کے زمینی مناظر لقیہ ایران سے یکسر مختلف ہیں۔ وہاں چٹیل میدان اور بے آب و گیاہ صحرا پھیلے ہیں تو یہاں ہر سو ہرے بھرے کھیت اور سرسبز وادیاں بکھری پڑی ہیں۔ ان علاقوں میں لوگوں کی زبان بھی فارسی کی بجائے ترکی ہے۔ ہم ”مراند“ سے گزرے۔ وادی کے پہلو میں نیند میں ڈوبا ہوا خوبصورت گاؤں۔ ایک حکایت کے مطابق حضرت نوح کی اہلیہ یہاں دفن ہیں۔ ”ماکو“ کا قصبہ آیا، سقرا اور خوشنما۔ صحت مند لوگ، جا بجا پھولوں کے تختے۔ بڑے چوک کے ساتھ شفاف ندی۔ برف گھل گھل کر نیچے آ رہی تھی اور پھر ماکو کا ناقابلِ تسخیر قلعہ جسے تیوری افواج کا منہ پھیر دینے کا شرف حاصل ہوا۔

آس پاس کے انہی پہاڑوں اور وادیوں میں حضرت زرتشت نے تبلیغ کی۔ ”جانوروں اور غریب لوگوں سے نیکی کرو۔ مقدس آگ کو لکڑیوں سے جلانے رکھو۔“ خدا ”آہور مزدا“ نے کہا: ”نیک سوچ، نیک الفاظ اور نیک اعمال ہی سے انسان نجات حاصل کر سکتا ہے۔“ زرتشت نے غرنی تک سفر کیا۔ بلخ کے بادشاہ نے اپنے آتش پرست ہونے کا اعلان کر دیا۔ بعد میں بلخ آتش کدوں کا شہر کہلایا۔ ”ماکو“ سے نکل کر ایک مرتبہ پھر ہم پہاڑوں میں کھو گئے۔ چڑھائی کی وجہ سے بس بے حد آہستہ جارہی تھی۔ بلندی کے ساتھ لمحہ بہ لمحہ خشکی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ ایک موڑ پر سامنے وادی کے آخری سرے پر چمکیلی روٹی کا ایک ڈھیر نظر کے سامنے آ گیا۔ ارد گرد کے پہاڑوں سے بلند آسمان پر دھند اور بادلوں کا ایک گولا سا بن گیا تھا۔ میں نے آنکھیں میچ کر غور سے دیکھا۔ دھند نہیں ہو سکتی، شاید بادل ہیں۔

بس نے ایک اور موڑ کاٹا، سب کچھ اوجھل ہو گیا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد پھر وہی بادل نظر آیا، بادل بھی نہیں تھا، برف تھی۔ بالکل کوہِ فوجی یا ما کی طرح..... بازو رگان تک یہ برف پوش پہاڑ یونہی آنکھ بھولی کھلتا رہا۔ یہاں پر ایرانی کتے کے عملے نے صرف پاسپورٹوں پر مہر لگانے پر ہی اکتفا کیا۔ دوسری طرف ترک کتے والوں نے جی بھر کے تلاشی لی اور اس کے بعد سب کو ایک ایک فارم تھا دیا۔ ”اسے پُر کر دیجئے۔“ مجبوری ہے، صرف کاغذی کارروائی۔ ”فارم پر بے شمار سوال درج تھے۔ آپ کے پاس کیمرے کی کتنی فلمیں ہیں؟ ترکی میں کتنے روز قیام کا ارادہ

تھیلے کے پھٹے ہوئے کونے میں سے میری ہراتی پوسٹین کی سیاہ کھال جھانک رہی تھی جس کی موجودگی مجھے یاد ہی نہ تھی۔ میں نے ٹھہرتے ہاتھوں سے تھیلا کھولا اور پوسٹین نکال کر پہن لی۔ قراقلی کی نرم اور گرم کھال نے میرے جسم کی تمام سردی چوس لی اور میں شیش کباب بھوننے والی انگلیٹھی کے ایک کونے سے سگریٹ جلا کر بڑے سکون سے بیٹھ گیا۔

”ایک سیخ کتنے کی؟“ میں نے شہادت کی انگلی کھڑی کر کے قہوہ خانے کے مالک سے پوچھا۔

”دو لیرا“ اس نے اپنی قمیض کے دامن سے ہاتھ پونچھ کر مجھے ایک سیخ پکڑادی۔

”ارض روم جانے والی بس کتنے بجے آئے گی؟“ میں نے گوشت کا ایک ٹکڑا سیخ سے اتار کر جلدی سے منہ میں رکھ لیا۔ بے حد گرم تھا۔

”وہاں تو صرف دن میں ایک بس جاتی ہے اور وہ آج صبح ہی چلی گئی تھی۔ آپ تھوڑی دیر انتظار کر لیں تو میرا ایک دوست اپنے ٹرک پر آپ کو اگلے قصبے بازید تک لے جائے گا۔ وہ اندر قہوہ پی رہا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے سگریٹ کا آخری کش لگایا اور پاؤں تلے مسل کر کھڑا ہو گیا۔ آرات کا پورا پہاڑ سورج کی روشنی سے چمک رہا تھا، مگر گرد و نواح کے پہاڑوں اور گہری وادیوں میں دھند کا چھا رہا تھا۔ شام ہونے کو تھی۔ قہوہ خانے کا مالک اب کباب بھوننے کی بجائے زمین پر بیٹھا آگ تاپ رہا تھا۔ میں نے آرات کی چوٹی کی جانب اشارہ کر کے پوچھا:

”اس کی برف کس موسم میں پگھلتی ہے؟“

”آرات کی برف کبھی نہیں پگھلتی۔“ اس نے تقدس آمیز نظروں سے چوٹی کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے بتایا۔ ”یہ نوح کا پہاڑ ہے۔ وادی کے دوسری طرف جس صبح موسم صاف ہو تو اس کی اجلی برفوں میں ایک کالا دھبہ دکھائی دیتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں وہ نوح کی کشتی کا ایک حصہ ہے۔“

”وادی کے اس پار تو روس ہے۔“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔“ اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ”ایک مرتبہ روسیوں نے نوح کی کشتی کی تلاش

میں آرات پر ایک مہم بھی بھیجی تھی۔ وہ بے مذہب لوگ ہیں، اس لیے ناکام واپس گئے۔“

اتنی دیر میں ٹرک کا مالک قہوہ پی چکا تھا۔ میرے اور علی کے علاوہ چند یورپی سیاح بھی ٹرک کے پچھلے حصے میں سوار ہو گئے۔ ٹرک قہوہ خانے کے ساتھ والی ڈھلوان سے نیچے اترا اور بازید کی کچی سڑک پر دھول اڑاتا چل دیا۔ سڑک کے کنارے سفید سنگ میل پر ”ارض روم 384 کلومیٹر“ کے الفاظ کندہ تھے۔ کچی سڑک بالکل ہموار اور سیدھی جا رہی تھی۔ ہمارے بائیں ہاتھ نیلے اور پہاڑیاں تاجہ نظر پھیلے ہوئے تھے اور دائیں جانب فصلوں اور چراگاہوں کا ایک وسیع اور سرسبز میدان آرات کی خشک دیوار کے دامن تک چلا گیا تھا۔ میدان کے خاتے پر آرات کے پہلو میں گڑیوں کے گھر وندوں ایسے ننھے سنے کچے مکانوں کے گاؤں تھے۔ برف مکانوں کی چھتوں کو چھو رہی تھی۔ خشک ہوا کی شدت میں ابھی تک کوئی کمی واقع نہ ہوئی تھی۔ ٹرک میں سوار دوسرے مسافر سردی سے بچاؤ کے لیے کونوں میں دیکے بیٹھے تھے اور علی ہمیشہ کی طرح ارد گرد کے مناظر سے بے نیاز سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ میں ٹرک کے جنگلے کا سہارا لیے بشکل کھڑا تھا اور آرات کی اجلی اجلی برفوں، اس کے دامن میں خوابیدہ کچے گاؤں اور لہلہاتی فصلوں کو ایک بھوکے اور نریدے بچے کی طرح ٹکڑے کر دیکھے جا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس پوری وادی کا حسن اپنے اندر سمو کر اس کا ذخیرہ کر لوں اور پھر زندگی کے تاریک لمحوں میں یہی حسن قطرہ قطرہ رس کر مجھے ٹھنڈک اور سکون کا احساس دلانے اور لمحوں کی تاریکی میں آرات کی سفید برف چمکنے لگی۔

اگرچہ اب رات ہونے کو تھی اور ساری وادی میں ملگجی اندھیرا پھیل رہا تھا، لیکن آرات کی چوٹی ابھی تک ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں کی پہلی روشنی میں جگمگا رہی تھی۔ میں نے ٹکٹلی باندھ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ میں نے زیر لب گننا شروع کر دیا۔ چوالیس۔ پینتالیس۔ یکدم چوٹی تاریک ہو گئی جیسے شمع بجھ گئی ہو۔ سورج ڈوب چکا تھا۔

چند فرلانگ کے فاصلے پر سڑک کے کنارے ایک ترک دیہاتی کھڑا تھا۔ قریب پہنچنے پر اس نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ڈرائیور نے بریک پر پاؤں رکھا اور ٹرک ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ دیہاتی کے کاندھے پر بندوق تھی۔ اس کے ساتھ مہین تھو تھنیوں والے دو شکاری کتے کھڑے تھے۔ وہ غالباً شکار سے واپس آ رہا تھا۔ اس نے پہلے ہمیں اپنی بندوق تھائی اور پھر ایک ایک کر کے بڑے پیار سے کتوں کو اٹھا کر ٹرک میں بٹھا دیا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے ڈرائیور کو اپنی زبان میں کچھ کہا اور ٹرک کے سٹارٹ ہوتے ہی بڑی پھرتی سے سوار ہو گیا۔ اس کی کمر کے گرد بندھے

شب ب سری کے لیے ہوٹل کی تلاش کے مرحلے سے پہلے ہم نے کھانا کھانے کا فیصلہ کیا۔ بائزید قلعہ کے پہلو میں ایک گندا سا قہوہ خانہ نظر آیا۔ میں نے کہر آلود شیشوں کو ہتھیلی سے پونچھا اور اندر جھانکا۔ خوب اُدھم مچا ہوا تھا۔ ہم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تو سب لوگ خاموش ہو گئے کہ یہ اجنبی جانے کہاں سے آ گئے۔ علی نے ہاتھ اٹھا کر بلند آواز سے السلام علیکم کہا تو پھر سے اُدھم مچ گیا کہ اپنے ہی ہیں۔ کھانے کے حصول میں خاصی دشواری پیش آئی کیونکہ زبان یارمن ترکی والا معاملہ تھا۔ چنانچہ مالک ہمیں باورچی خانے میں لے گیا جہاں اس کی نہایت خوش شکل مگر قدرے فربہ بیٹیاں گاہکوں کے لیے کھانا پکانے میں مصروف تھیں۔ وہ ہمیں دیکھ کر مسکرا دیں اور دیکھیوں کے ڈھکن اٹھا اٹھا کر تمام ترک کھانوں کا تعارف کروایا۔ گاڑھے چاول اور سبزیوں کا سوپ۔ مکھن میں تلے ہوئے بند گوبھی کے پتے۔ قیمہ بھرے بیگن۔ چاول اور سلاڈ کے کوفتے اور مختلف قسم کے کباب۔ علی دیکھیوں کی بجائے گوری چٹی ترکن کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ میں نے مالک کو اشارے سے بتایا، یہ۔ یہ اور چباب یعنی کباب اور پھر علی کا بازو تھام کر اسے واپس قہوہ خانے میں لے آیا۔ ”خوب است“ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔

کھانا آیا تو ہم نے اسے ایرانی خوراک سے بدرجہا لذیذ پایا۔

وہ رات ہم نے ایک بے حد غلیظ سرائے نما عمارت میں بسر کی اور منہ اندھیرے اٹھ کر بسوں کے اڈے پر آ گئے۔ میں نے قصبے سے پرے کوہ آرات کی طرف دیکھا۔ وہاں ابھی تک تاریکی کا راج تھا۔ بس شہر سے نکلی تو میری نگاہوں ایک ہی نقطے پر مرکوز رہیں۔ سورج طلوع ہوا۔ پہلی کرن آرات کی برف پوش چوٹی پر پڑی اور منعکس ہو کر پوری وادی میں پھیل گئی۔ ”آج مطلع صاف ہے۔“ میں نے دھند اور بادلوں سے پاک نیلگوں آسمان کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ ”وادی کی دوسری طرف آرات کی اُجلی برفوں میں ایک سیاہ دھبہ دکھائی دے رہا ہوگا۔ کشتی نوح کا ایک حصہ۔“ آہستہ آہستہ ہم آرات سے دور ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ مجھے اس کی سفید برفوں پر دھند لایا بدل کا گمان ہونے لگا۔ بس نے ایک موڑ کاٹا اور آرات نظروں سے غائب ہو گیا۔ میں اب اس مقدس اور خوبصورت پہاڑ کے سحر سے آزاد ہو چکا تھا۔

گردنوں کی پہاڑیوں پر ابھی تک سرما کی برف پوری طرح نہیں پگھلی تھی۔ کہیں کہیں گندریوں کے چھوٹے چھوٹے گاؤں نظر آتے۔ عورتیں چھینٹ بکے پنچوں اور شلواروں میں

تھیلے میں سے ایک خون آلود خرگوش کا خوب صورت اور لمبا کان باہر نکلا ہوا تھا۔ مجھے اپنے تھیلے کی طرف متوجہ پا کر وہ مسکرا دیا اور اپنے کتوں کو تھپکتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہنے لگا: ”اس وادی میں شکار کی اتنی بہتات ہے کہ ہم لوگ جو آرات کے دامن میں رہتے ہیں، روزانہ دو چار خرگوش مار لاتے ہیں۔ کبھی کبھار ہرن بھی مل جاتا ہے۔ کیوں پنچو؟“ اس نے کتوں سے مخاطب ہو کر بڑے لاڈ سے کہا۔ جواب میں پنچوں نے اپنے تیز نوکیلے دانتوں کی نمائش کر دی۔ تھوڑی دور جانے کے بعد اس نے اگلی سیٹ کا شیشہ بجا کر ڈرائیور کو رکنے کے لیے کہا۔ ”میرے گاؤں جانے والی پگڈنڈی آگئی ہے۔“ اور ہندوق اور پنچوں کے ساتھ نیچے اتر گیا۔ ٹرک دوبارہ چلا تو میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ نیم تاریکی میں آرات کے دامن میں ایک گاؤں کے ہلکے خطوط دکھائی دے رہے تھے۔ ایک کچے گھر کی چنی سے سفید دھوئیں کی بل کھاتی کیر فضا میں بلند ہو رہی تھی۔ شکاری کا رخ اُسی جانب تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے دونوں کتے ڈم ہلاتے بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ شاید انہوں نے اس گھر میں پکنے والے رات کے کھانے کی خوشبو سونگھ لی تھی۔ کاش میں بھی ان کے ساتھ اس مقدس پہاڑ کی گود میں آباد خوبصورت گاؤں میں جا سکتا۔ صرف ایک رات کے لیے۔ شاید میں اس طرح آرات کے طلسم کو پا لوں، اُسے چھو لوں۔

آج سے تقریباً سات سو برس پیشتر مارکو پولو بھی اسی راستے سے گزرا تھا۔ وہ اپنے سفر نامے میں لکھتا ہے: ”آرمینیا کے قلب میں ایک نہایت بلند پیالہ نما پہاڑ واقع ہے۔ کہا جاتا ہے نوح کی کشتی یہاں لنگر انداز ہوئی تھی اور اسی مناسبت سے اسے ”نوح کا پہاڑ“ کہتے ہیں۔ یہ اتنا لمبا چوڑا ہے کہ اس کے گرد چکر لگانے میں دو دن صرف ہو جاتے ہیں۔ چوٹی پر برف پوری طرح کبھی نہیں پگھلتی بلکہ ہر سال پرانی برف پر نئی برف کی تہیں جم جاتی ہیں اور اس طرح اس کی بلندی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ برف کے پگھلنے سے پہاڑ کا دامن سرسبز اور زرخیز ہے۔“

بائزید پنچے، اندھیرا چھا چکا تھا اور شدید سردی تھی۔ شاید یہ آرات کی ابدی برفوں کا کرشمہ تھا۔

”ارضِ روم کے لیے بس صبح ساڑھے چار بجے روانہ ہوگی۔ آپ ٹکٹ ابھی خرید لیجئے۔“ ہمیں بسوں کے اڈے پر بتایا گیا۔

ملبوس۔ سر پر رنگ برنگے رومال باندھے اپنے تھاپنے میں مصروف اور مرد بھڑکیں چراتے ہوئے۔ کچے مکانوں کی چھتوں پر گھریلو کپڑوں کے علاوہ ترکمان قالین اور مندے دھوپ میں سوکھ رہے تھے۔ ایک سرسبز و شاداب میدان کے آخر میں کسی شہر کے افقی خطوط نمودار ہوئے۔ ”ارضِ روم“ ڈرائیور نے پلٹ کر مسافروں کو بتایا۔ شہر کے مکانوں کی سرخ چھتوں کے درمیان شیفہ مدرسے کے مینار دھوپ میں چمک رہے تھے۔

مدرسے کے میناروں سے بارش کا پانی رِس رِس کر میرے قدموں میں جمع ہو رہا تھا۔ میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ ہاں یہی نم آلود اور افسردہ مینار تھے جنہوں نے چھ ماہ قبل چمکتی دھوپ میں میرا استقبال کیا تھا۔ اس روز میں کتنا خوش تھا۔ ارضِ روم کے کوچہ و بازار میں زندگی اور خوب صورتی تھی۔ علی اور میں نے یونیورسٹی کے ساتھ ایک نفیس قبوہ خانے میں ڈولما اور شیش کباب کھائے اور پھر پوری دوپہر شہر میں گھومتے رہے۔ استنبول کے لیے گاڑی شام چھ بجے چلتی تھی اور ابھی ایک بجاتا تھا۔ ہم نے دورانِ سفر کے لیے خشک مچھلی، پنیر، انڈے اور ڈبل روٹی خریدی اور پھر ہم ادھر آ نکلے۔ مدرسے کے باہر لوگ دھوپ سینک رہے تھے۔ خوائچے والے ترک مٹھائیوں کے تھال لیے بیٹھے تھے اور ان کے گرد بے شمار بچے جمع تھے اور پھر اس روز وہ فقیر بھی تو یہیں بیٹھا تھا جو ابھی ابھی بارش سے بچاؤ کی خاطر شیش کی طرف چلا گیا تھا۔ اس کی جھولی میں میرا آخری لیرا تھا۔ میں نے علی سے کہا ”مدرسہ اندر چل کر دیکھتے ہیں۔“ اسی دروازے کے باہر دربان نے ہمیں روک لیا۔ ”کھڑکی سے نکل کر خرید لیجئے۔ دو لیرا۔“ علی نے آہنی دروازے کی سلاخوں کے اندر جھانکا اور کہنے لگا۔ ”اندر کچھ بھی نہیں ہے۔ ہماری موچی دروازے والی مبارک حویلی اس سے کہیں بہتر ہے۔ دو لیروں میں مچھلی کا ایک اور ڈبہ آ سکتا ہے۔“ اور ہم آگے بڑھ گئے۔

اس روز میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یورپ سے واپسی پر اسی مدرسے کے میناروں تلے میں اس حالت میں کھڑا ہوں گا۔ میری جیب خالی ہوگی اور وطن جانے والی تمام راہیں مسدود ہو جائیں گی۔ یہ شہر اور اس کے گلی کوچے میرے لیے بے بسی اور غریب الوطنی کا پیغام بن جائیں گے۔

اس روز شیش تک جانے والی سڑک کے دورویہ شاہِ بلوط کے درختوں میں کتنی تازگی اور شگفتگی تھی۔ موسم بہار کا آغاز تھا۔ ہم دونوں خوراک کے پیکٹ اور اپنا سامان اٹھائے آنے والے حسین سفر کی رنگینیوں میں کھوئے گنگنا تے ہوئے شیش کی طرف جارہے تھے جہاں استنبول جانے والی گاڑی کھڑی تھی۔ بارش ابھی تک جاری تھی۔ میں ایک مرتبہ پھر اپنے سفر کی حسین یادوں میں کھو گیا۔

ارضِ روم کے چھوٹے سے شیش پر بے حد رش تھا۔ گاڑی جواب تک شیش سے باہر ریلوے یارڈ میں کھڑی تھی، وہاں سے چل کر پلیٹ فارم میں داخل ہوئی تو ہزاروں لوگ اس پر ٹوٹ پڑے۔ چند سیاحوں کے علاوہ باقی تمام مسافر ترک دیہاتی تھے۔ میں اپنا سامان اٹھائے بے بسی کے عالم میں پلیٹ فارم کے دونوں سروں کے درمیان جگہ کی تلاش میں طواف کرتا رہا لیکن ہر دروازے اور کھڑکی میں جسموں کی ایک دیوار چُنی تھی۔ میں نے گاڑی سے مدد کی درخواست کی تو اس نے سامان مجھ سے لے کر ایک کھڑکی کے اندر دھکیل دیا اور ساتھ ہی گاڑی چلنے کی جھنڈی لہرا دی۔ گاڑی چلی تو میں پاندان کے ساتھ لٹک رہا تھا۔ دروازے میں کھڑے دیہاتی میری طرف اشارہ کرتے اور پھر ایک دوسرے کو کہنیاں مار کر بے وقوفوں کی طرح دانت نکالنے لگتے۔ مجھے بے حد غصہ آ رہا تھا۔ کافی دیر بعد جب انہیں احساس ہوا کہ اس معلق حالت میں میں ان کے مزاح سے لطف اندوز ہونے سے قاصر ہوں تو انہوں نے مجھے گاڑی کے اندر کھینچ لیا۔ سامان کی تلاش ہوئی تو وہ ڈبوں کے ساتھ لمبے راستے میں پڑا ملا۔ مجھے علی کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا کہ آیا وہ گاڑی پر موجود بھی ہے یا نہیں۔ بہر حال میں سامان کے تھیلے پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ استنبول تک دو راتوں اور ایک دن کا سفر کیسے کئے گا۔ اس دوران کئی دیہاتی بلا جیل و حجت میرے جسم کو پھلانگ کر گاڑی کے دوسرے حصے میں آتے جاتے رہے۔

”آپ کے تھیلے پر چاند تارے کا پرچم کاڑھا ہوا ہے۔“ ایک نوجوان ترک جو مجھے پھلانگنے کے لیے اپنی ٹانگ اٹھائے کھڑا تھا، رُک کر کہنے لگا۔ میں چونکہ اس وقت پاک ترک بھائی بھائی کا نعرہ لگانے کے موڈ میں نہیں تھا، اس لیے خاموش بیٹھا کڑھتا رہا۔

”آپ شاید پاکستانی ہیں؟“ اس نے نہایت پیار سے پوچھا اور اپنی ٹانگ نیچے کر لی۔

”بالکل ہوں۔“ میں نے جل کر کہا۔ ”لیکن آپ لوگ سلوک میرے ساتھ یونانیوں جیسا کر رہے ہیں۔“ اس دوران ایک اور دیہاتی مجھے پھلانگ کر چلا گیا۔ وہ بھلا ناس نوجوان ترک میرے تیردیکھ کر وہاں سے غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا اور میرا سامان اٹھا کر مجھے ایک ڈبے میں لے گیا۔ ”تشریف رکھیے، یہ میری سیٹ ہے۔ چونکہ میں نے اگلے اسٹیشن پر اتر جانا ہے۔ اس لیے گاڑ سے کہہ کر یہ سیٹ آپ کے لیے مخصوص کروادی ہے۔“

اب میرا جی چاہا کہ نعرہ لگا دوں پاک ترک.....

”اور ہاں.....“ اس نے میرا سامان نشست کے نیچے رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہم یونانیوں کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا کرتے۔“

”مجھے اپنے رویے پر ندامت ہے۔“ میں نے سر جھکا کر کہا۔

”کوئی بات نہیں سفر کے دوران ایسا ہو ہی جاتا ہے۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ اگلا اسٹیشن آیا تو وہ اتر کر چلا گیا۔

رات کے پچھلے پہر جب اکثر مسافر سو چکے تھے میں علی کوڈھونڈنے کی غرض سے باہر نکلا اور پوری گاڑی میں گھوما۔ ایک غسل خانے کے دروازے کے ساتھ ایک لگائے علی سگریٹ کے کش لگاتا ہوا مل گیا۔

”کوئی سیٹ ملی یا راہوں میں پڑے ہو؟“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”ویسے غسل خانہ بالکل خالی ہے۔“ میں نے اسے ساتھ لیا اور اپنے ڈبے میں لا کر ایک کونے میں فکس آپ کر دیا۔ ہمارے ڈبے میں بھی تمام مسافر اناطولیہ کے دیہات سے تعلق رکھتے تھے۔ ان حضرات کی خاصیت یہ ہے کہ کسی بھی جگہ ہر پوزیشن میں بڑے اطمینان سے سو جاتے ہیں۔ ایک صاحب کونے میں اکڑوں کھڑے خرائے لے رہے ہیں تو دوسرے سیٹ کے عین نیچے بستر بغیر جو خواب ہیں۔ سفر کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو، ہاتھ لٹکائے آ جاتے ہیں اور آتے ہی اپنے ڈھیلے ڈھالے سوٹ سمیت، خستہ حال بیٹ کو آنکھوں تک نیچے کھینچ کر کسی بھی حالت میں سو جائیں گے اور منزل آنے تک خرائے لیتے رہیں گے۔ اس دوران اگر شامت اعمال سے ان کے پاؤں آپ کی قوت شامہ کے دائرے میں آ جائیں تو وہیں بیٹھے اناطولیہ کے دیہات کی خوشبوؤں سے قرب حاصل ہو جاتا ہے۔ گاڑی کی کھڑکیاں بالکل بند کر دیں گے اور کتنا ہی جس کیوں نہ ہو جائے، تازہ ہوا کو سم قاتل

سمجھیں گے۔ کھانے کا وقت ہوا تو ایک جیب سے روٹی نکالی، دوسری سے پیاز اور چٹخارے لے کر کھا گئے۔ روٹی کے ساتھ اگر شہتوت مل جائیں تو پوری عیاشی ہوگی۔ اناطولیہ کے ان دیہاتیوں کی جفاکشی اور فاقہ مستی دیکھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ عثمان ترکوں نے کس کے بل پر وی آنا کے دروازوں پر دستک دی اور گیلی پولی میں انگریزوں کا بھر کس کس نے نکالا۔

صبح سویرے گاڑی ”سیو“ پہنچی۔ پلیٹ فارم پر بوتلوں میں بند کٹی لسی بک رہی تھی۔ وطن یاد آ گیا۔

رات گئے ”انقرہ“ آیا۔ جیسے دیوالی کی رات ہو۔ لاکھوں دیئے ٹنٹارہے تھے۔ گاڑی کا یہ طویل سفر بے حد صبر آزما اور اکتا دینے والا ثابت ہوا۔ اناطولیہ کی خوشبوؤں کے علاوہ غسل خانے میسر اور پانی ندارد۔ ڈائیننگ کار موجود اور ڈنر غائب۔ ارض روم سے خرید کی ہوئی مچھلی اور پنیر کام آئے ورنہ نوبت فاقہ مستی تک پہنچتی۔ ہمیں گاڑی پر سوار ہوئے تیس گھنٹے بیت چکے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ ست رفتار گاڑی صدایونہی چلتی رہے گی اور ہم کبھی بھی استنبول نہ پہنچ پائیں گے۔ دردغ برگردن علی کہنے لگا کہ انقرہ سے ادھر شملہ پہاڑی کے حجم جتنی ایک پہاڑی چڑھتے چڑھتے انجن کی طاقت جواب دے گئی اور گاڑی کھسکتے کھسکتے پھر نیچے واپس آ گئی۔ انجن نے ایک مرتبہ پھر زور لگایا، لیکن پہاڑی کے عین وسط میں پہنچ کر گاڑی پھر..... بہر حال علی کہہ رہا تھا مجھے اس بارے میں علم نہیں کیونکہ میں اُس وقت سو رہا تھا۔

ہماری گاڑی جب استنبول کے حیدر پاشا سٹیشن پر رُکی تو سارا طلسم ٹوٹ گیا۔ گندا اور غیر موثر سٹیشن۔ چالیس گھنٹے کی مسافت کے بعد زمین پر قدم رکھا تو یوں محسوس ہوا جیسے جیل سے چھوٹے ہوں۔ باہر نکلے تو باسفورس کا پانی قدم لینے کو آیا۔ ہلکی لہریں چھپاک چھپاک سٹیشن کی سیڑھیوں کو چھو رہی تھیں۔ سامنے ٹیکسی یا ناگہ شینڈ کی بجائے سینئر کھڑے تھے۔ ہم نے ٹکٹ خریدے اور عرثے پر سامان رکھ کر بیٹھ گئے۔ سینئر کا گھگھکیا ہوا بھونپو زور زور سے، بجا اور ہم ایشیا سے جدا ہو چکے تھے۔ دوسرے کنارے پر یورپ تھا۔ طوخم کی سرحد پر اپنا ملک چھوڑنے کا غم تھا اور یہاں اپنا برا عظم چھوٹنے پر افسوس ہو رہا تھا۔

بازنطائن۔ قسطنطنیہ۔ استنبول

”میں سمندروں کا سینہ چیر کر آج مقدس شہر بازنطائن پہنچ گیا ہوں۔“

(YEATS)

دوسری صبح میں سو کر اٹھا تو ہمارے ڈبے میں تیز دھوپ چمک رہی تھی۔ میری آنکھیں ابھی تک نیند سے بوجھل تھیں۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ اوپر کھسکا کر سرباہر نکالا اور ایک گہرا سانس لیا۔ ہوا میں سمندر کی سیلی خوشبو تھی۔ دُور افق پر ایک نیلی لکیر ابھری اور سبز کھیتوں کو چیرتی ہوئی گاڑی کے ساتھ آگئی۔ بحیرہ مرمر، جس کے آخری سرے پر استنبول تھا۔

ایک جانب سرو کے لاجے درخت اور سبزے سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں اور دوسری طرف نیلگوں بحیرہ مرمر۔ مَرَمَر کے کنارے لکڑی کے بنے ہوئے خوشنما کالج جن کے باغیچے سُرخ اور نیلے رنگ کے جنگلی پھولوں سے اُٹے ہوئے۔ انگور کی بیلوں سے لدے ہوئے شرمیلے خاموش کُنج۔ سرو کے گہرے سبز اور نیم تاریک جھنڈ۔ ہر لمحہ خوبصورتی کا ایک نیا پہلو سامنے آ رہا تھا۔ ایک برف کی مانند سفید پیارا سا گھر نظر کے سامنے آیا۔ باغ میں پرانی وضع کا سنگِ مرمر کا فوارہ۔ ٹھلے آہنی دروازے کے پیچھے درختوں اور بیلوں کی سبز تار کی لیکن بالکل سناں جیسے آسب زدہ ہو۔ گاڑی کی رفتار اب تیز ہو چلی تھی۔ مرمر کی سطح ایک جھیل کی مانند سکون تھی۔ ”یالی“ گھروں کے ہرے بھرے باغیچے نیچے پانی کی سطح تک چلے گئے تھے۔ ہر گھر کا اپنا چھوٹا سا گھاٹ تھا جہاں صبح کی ہلکی دھند میں کشتیاں پانی میں ہلکورے لے رہی تھیں۔

”استانبول۔ استانبول۔“ ریلوے گارڈ ہر کیمین کے پاس دستک دیتا ہوا جا رہا تھا۔

میرے سامنے گنبدوں اور میناروں کا ایک شہر سمندر سے اٹھا۔ یہ شہر ماضی بعید میں بازنطینیوں کا بازنطائن۔ ماضی میں کانستطنائن کا قسطنطنیہ اور حال میں عثمانی ترکوں کا استنبول کہلایا۔ ایک شہر تین عہد، تین روپ اور تین ہی حصے۔ ایک حصہ ایشیا میں جہاں سے ہم آ رہے تھے۔ دوسرا یورپ میں اسلامبول جو ہماری منزل تھی اور تیسرا الغلط جسے شاخِ زریں اسلامبول سے جدا کرتی ہے۔ ایک ہی شہر۔ ہمارے گرد آبنائے باسفورس میں پلپل مچی ہوئی تھی۔ ایشیا اور یورپ کے درمیان درجنوں مسافر بردار کشتیاں رواں دواں۔ سامان سے لدے ہوئے بیڑے، چھپوروں کی لاتعداد کشتیاں۔ دنیا کے ہر کونے سے آئے ہوئے تجارتی جہاز اور پھر ہارن اور بھونپوؤں کی متواتر آوازیں۔ دنیا بھر میں کسی بھی شہر نے اپنے گرد پھیلے ہوئے سمندر کو اتنی خوبصورتی نہیں بخشی جو باسفورس کے حصے میں آئی ہے۔ ونس کی خوبصورتی کا انحصار ہی سمندر پر ہے مگر استنبول میں سمندر شاخِ زریں کا کشکول ہاتھ میں لیے شہر سے حسن کی بھیک مانگ رہا ہے۔ میری نظروں کے سامنے اس حسین شہر کے طلسمی افقی خطوط ابھر رہے تھے۔ آیا صوفیہ کا عظیم الجثہ گنبد۔ نیلی مسجد کے چھ نازک اندام اور باریک مینار۔ ترک سلطانوں کا محل سرا۔ شاخِ زریں پر پل۔ الغلط اور اس گھنے جنگل میں سینکڑوں لاجے اور پتے مینار ہر سو بکھرے ہوئے جیسے نیلے آسمان کے سینے میں تیز چمکتے ہوئے برچھے گڑھے ہوں۔ میرے لیے استنبول کی پہلی جھلک جوانی کے فریبوں اور پہلی محبت کے احساسات سے زیادہ حسین اور ہیجان خیز ثابت ہوئی تھی۔

یہ سفر صرف دس منٹ میں کٹ گیا۔ دوسرے کنارے پر ہم نے دفترِ معلومات سے کسی مناسب اور ستھرے ہوٹل کے بارے میں دریافت کیا تو کاؤنٹر پر کھڑے نو جوان ترک نے ہمیں

”یوسل ہوٹل“ میں ٹھہرنے کا مشورہ دیا۔ ”پل غلط کو پار کر کے ٹیشن کے ساتھ والی سڑک پر چلے جائیے۔ ہوٹل آیا صوفیہ کی دیوار کے سامنے واقع ہے۔“

یوسل ہوٹل نہایت آرام دہ اور صاف ستھرا تھا۔ گرم اور ٹھنڈا پانی۔ فلت سسٹم۔ گدے دار نرم بستر۔ درمیان میں ایک جدید کیفے جس کے صحن میں انگوروں کی بیلین تھیں۔ ہوٹل کا انتظام ترک طلباء کی ایک تنظیم کے ذمے ہے جو اسے صرف سیاحوں کی سہولت کے لیے رضا کارانہ طور پر چلاتی ہے۔ ہوٹل کے دروازے کے ساتھ نوٹس بورڈ پر ”ضرورت ہے“ ”برائے فروخت“ کی سرخیوں کے نیچے کاغذ کے پڑوں پر بڑے دلچسپ اعلانات تحریر تھے۔

ضرورت ہے

”ایک نوجوان فرانسیسی سیاح کو بسکم اور بھوٹان کے سفر کے لیے ایک لڑکی کی (پندرہ سے پینتیس سال) انگریزی جانتی ہو اور معاشرے کے گھسے پٹے اخلاقی اقدار کی پابند نہ ہو۔ کار کے پٹرول کی قیمت بائٹنا ہوگی۔ باقی سب کچھ مفت۔“

یا پھر ”دو ساتھیوں کی جو کسی یونانی جزیرے کی چٹانوں میں دو ماہ تک میرے ساتھ رہ سکیں۔ طلسمی گھاس کا انتظام میرے ذمے ہوگا۔ تفصیلات کے لیے کمرہ نمبر فلاں۔“

برائے فروخت

”بدھ کا ایک نادر مجسمہ جو نیپال کے ایک راہب خانے سے چُرایا گیا ہے۔ استنبول سے نیویارک تک کا ہوائی ٹکٹ۔ لمبے بالوں کی ایک وگ۔ ڈالر چھپانے والی ایک کمری پیٹی۔“

یا پھر ”خواتین کے استعمال شدہ زیر جامہ ملبوسات۔ اشتہار دہندہ افریقہ جا رہی ہے۔“

وغیرہ وغیرہ

جس کمرے میں ہمیں بستر الاٹ ہوئے وہاں چند اور غیر ملکی سیاح بھی براجمان تھے۔ میں نے بستر کے ساتھ لاکر میں سامان رکھا اور نہانے کے لیے چلا گیا۔ شاور کے گرم پانی سے پچھلے تین روز کی تھکن بالکل دور ہوگئی اور میں کمرے میں واپس آ کر سو گیا۔ آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی۔ کمرے کے دوسرے کین باہر جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ میرے ساتھ والے بستر پر ایک پاکستانی حضرت ”استنبول کی شبینہ رنگینیاں“ نامی کتابچہ بڑی دلچسپی سے پڑھ رہے تھے۔ میں نے اپنا تعارف کر دیا تو کہنے لگے۔ ”اجی صاحب چھوڑیے کبھی یہی کہتے ہیں کہ سیاحت پر نکلا

ہوں لیکن چکر یورپ میں نوکری کا ہوتا ہے۔ بہر حال میری مائیے تو ولایت میں سمگل ہو جائیے۔ ضروری پتے میں آپ کو دیے دیتا ہوں۔ ویسے میں جرمنی سے مرسلہ لیں گاڑیاں خرید کر بیروت میں بیچ دیتا ہوں۔ وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔“

دوسری جانب علی ایک سکھ سے بات چیت میں مصروف تھا۔ ”عالی صاحب!“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”آپن دافراٹک فورٹ وچ کاراں کا بنج ٹس ہے جی۔ واہگر وکی کر پاسے۔“ (دو ہفتے بعد جب میں فرینک فرٹ پہنچا تو یہی سکھ حضرت وہاں کے یوتھ ہوٹل میں جھاڑو دے رہے تھے۔) میرے اوپر والے بستر پر ایک نہایت خوش شکل اور سنجیدہ سویڈش نوجوان تمباکو پینے کے پائپ پر نہایت مشاقی سے چڑا منڈھ رہا تھا۔ ”کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ پائپ پر چڑا لگانے کا کیا مقصد ہے؟“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

”یہ مرساں پتھر کا بنا ہوا ہے۔“ اس نے پائپ پر ایسے پیار سے ہاتھ پھیرا جیسے کوئی نادر مجسمہ ہو۔ ”اس پر چڑا منڈھ کر چند روز کے باقاعدہ استعمال کے بعد اس کا رنگ کریم سے چمکتے ہوئے بھورے رنگ میں بدل جاتا ہے۔ پھر چڑا اتار دیا جاتا ہے۔ صرف استنبول میں ملتا ہے۔“

”اور اگر اس میں تمباکو کی جگہ چرس پی جائے تو؟“ اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہی نے پوچھا اور پھر خود ہی جھوم کر کہنے لگا۔ ”بس رنگین ہی ہو جائے سب کچھ۔ ہری اوم۔“ اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔

ہم اپنے کمرے کی رنگین دنیا چھوڑ کر باہر نکلے تو کیفے کے صحن میں تیز موسیقی کی لہ پر چار بپتی بھالوؤں کی طرح ناچ رہے تھے۔ ہوٹل کے سامنے آیا صوفیہ کی دیوار کے دائیں طرف ڈھلوان گلی سے نیچے اتر کر ہم باسفورس کے کنارے آ گئے جہاں سارا شہر تفریح کے لیے آمدا آیا تھا۔ بچوں کا شور، کباب بیچنے والے۔ اخبار والوں کی صدائیں۔ چھوٹے لڑکے ہاتھ میں بوٹ پالش کا برش تھامے اس انتظار میں کہ آپ کا دھیان دوسری طرف ہو اور وہ برش آپ کے بوٹ پر جما کر ”دولیرا“ کا نعرہ لگا دیں۔ ساحل پر لنگر انداز کشتیوں اور سیٹروں پر رنگ برنگے قمقمے روشن تھے۔ فٹ پاتھ کے ساتھ سمندر میں بے شمار چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں تیل کے لیپ جل رہے تھے۔ لہروں کی چھلک سے کشتیاں جھولتیں تو لیپ کے بلند شعلے پھڑ پھڑانے لگتے۔ میں نے اوپر سے جھانک کر دیکھا تو ہر کشتی میں الاؤ جل رہے تھے جن کے اوپر بڑے بڑے تھالوں میں مچھلی تلی جا

ساتھ ہولیا۔ ”ڈالر چیچ؟ گرلز؟ سٹریٹ میوز؟“ اس نے اپنی کاروباری فہرست سنادی۔
 ”یار یہ سٹریٹ میوز کیا ہوتا ہے؟“ علی کی آنکھوں میں چمک تھی۔
 ”دنگلی لڑکیوں کا ناچ ہوتا ہے بیٹے۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”معافی بھیجی۔“ علی نے لاہوریوں کے خاص انداز میں کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ ”میں نے سمجھا شاید کوئی کھانے کی چیز ہے۔“

استقلال کی رونق کم ہونے لگی تو ہم نے واپسی کی ٹھانی۔ سڑک کے دائیں ہاتھ غلط کی قدیم آبادی ہے۔ ہم اینٹوں سے بنی ہوئی ڈھلوان گلیوں سے نیچے اترنے لگے۔ اس علاقے میں کبھی صرف جنوا اور وینس کے باشندے آباد تھے۔ جب کبھی استنبول پر حملہ ہوتا، یہ حضرات فوراً حملہ آور کی خدمت میں حاضر ہو جاتے اور کہتے کہ حضور ہم تو کاروباری لوگ ہیں۔ شاخ زریں کے پار اسلامبول والوں سے آپ کا جھگڑا ہوا تو ہو ہم آپ کے خادم ہیں۔ ہمیشہ حملہ آور کا ساتھ دیتے بلکہ مناسب دام طے ہو جانے پر اپنے سپاہی بھی ساتھ کر دیتے۔ چنانچہ اکثر فائدے میں رہتے۔ ان کی مہمان نوازی سے متاثر ہو کر زیادہ تر غیر ملکی بادشاہوں نے اپنے سفارت خانے اسی آبادی میں بنوائے۔ غلط کی آبادی کے عین درمیان ایک بلند و بالا مینار ہے جسے جنوا والوں نے بنوایا اور ”مینار عیسے“ کا نام دیا۔ آج کل اس کی چوٹی پر آگ بجھانے والے علم کا دفتر ہے۔ شہر کے چوبی مکانات میں اکثر آگ لگتی رہتی ہے اور اس کی بلندی سے فوراً موقع کا تعین کر لیا جاتا ہے۔

مینار کے عین نیچے ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو مالک باورچیوں والا سفید لباس ٹوپ پہنے ہمارے پاس آ گیا۔ ”کیا کھائیے گا؟“

”اس علاقے کا خصوصی کھانا کونسا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ گولاش کھائیے جنوا والوں کی خاص ڈش ہے۔“ اس نے جھک کر کہا۔

گوشت کے ٹکڑوں اور مختلف سبزیوں کا بنا ہوا گولاش خوب تھا۔ ہم ہوٹل سے باہر نکلے تو غلط کا پورا علاقہ سنسان تھا۔ ڈھلوان گلیوں میں تیزی سے چلتے ہم واپس پل کے پاس پہنچ گئے جہاں باسفورس کا ساحل اب بالکل خاموش پڑا تھا اور کشتیوں کی روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ پل غلط پر بھی ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ برقی روشنیاں کم ہونے کی بنا پر چاندی کی سنہری کرنیں اور زیادہ نکھر آئی تھیں۔ میں نے پل پر کھڑے ہو کر دائیں ہاتھ ”شاخ زریں“ کی جانب دیکھا۔

رہی تھی۔ یہ مچھلی جال کے ذریعے کشتی کے دوسرے سرے پر پکڑی جا رہی تھی۔ مچھلی کا ایک خستہ ٹکڑا۔ ڈبل روٹی اور ایک آن چھلا پیاز صرف دو لیرے میں۔ میں نے ایک سکہ ماتھی کی طرف اُچھال دیا اور اُس نے اخبار کے کاغذ میں لپٹی مچھلی مجھے تھما دی۔

ساحل کے ساتھ میڑھیاں طے کر کے ہم پل غلط پر آ گئے۔ بسیں اور کاریں گزرتیں تو پل کے تختے دھم دھم بجتے۔ پل کے نیچے چھیرے بھیرہ اسود اور مرمے سے پکڑی ہوئی مچھلیاں فروخت کر رہے تھے۔ خریداروں کا جھوم تھا۔ ہر سورشنی اور زندگی کی گہما گہمی تھی۔ استنبول ایک مخصوص مزاج کا حامل ہے جو اس کی گندگی اور بوسے ابھر کر آپ کے سامنے آتا ہے اور آپ کو اپنا گرویدہ کر لیتا ہے۔ تہران اپنی جدید ترین عمارتوں اور صاف شفاف سڑکوں کے باوجود اس خاصیت سے محروم ہے۔ پل کو عبور کر کے ہم دوسری جانب آ گئے اور وہاں سے ”تقسیم چوک“ جانے والی بس پر بیٹھ گئے۔ کنڈیکٹر ہمیں دیکھ کر مسکرایا اور شہادت کی دونوں انگلیاں کاٹچ کھیلنے کے انداز میں جوڑ کر کہنے لگا۔ ”ترک۔ پاکستانی بھائی بھائی۔ کہاں جاؤ گے؟“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”سنا ہے ہوٹل ہلٹن کے اوپن ایئر ٹیرس سے استنبول پریوں کا شہر لگتا ہے؟“ چنانچہ اس نے ہمیں ”جمہوریت“ میں اتار دیا۔

دنیا کے کسی بڑے شہر میں چلے جائیے لیکن ان جہاز نما ہوٹلوں کا اندرونی ماحول امریکی ہی ہوگا سوائے ملازموں کے رنگ روپ کے۔ ہوٹل ہلٹن کے اوپر ایئر ٹیرس سے نیلگوں سمندر کی آغوش میں سمٹا ہوا استنبول واقعی پریوں کا شہر لگ رہا تھا مگر اس خوبصورتی میں ہل کی آمد نے زہر گھول دیا۔

”ہلٹن میں دو پیالی کڑوی کافی کی قیمت برابر ہے۔ باسفورس کی تلی ہوئی مچھلی کی پوری کشتی کے۔“ علی نے فوراً حساب لگا کر بتایا۔

ہم یہاں سے اٹھ کر ”تقسیم چوک“ کے پار جادہ استقلال میں چلے گئے۔ یوں لگتا تھا جیسے لوگوں نے اب باسفورس کے کنارے سے اکتا کر یہاں ہلا بول دیا ہو۔ مری کی مال روڈ کی طرح ہزاروں لوگ سجے سجائے چہرے پوتے بے مقصد گھوم رہے تھے۔ یہ استنبول کی سب سے مشہور اور مصروف ترین شاہراہ ہے۔ سینما، ریستوران، سٹورز اور نیون روشنیوں کی بہتات اور پھر پہلو میں درجنوں تاریک گلیوں میں استنبول کی رنگینیاں۔ ایک کونے پر ایک ترک نوجوان ہمارے

استنبول کے دو حصوں غلطہ اور اسلامبول کے درمیان ایک رُو پہلا قالین بچھا تھا۔ چاندنی میں نہانی، چمکتی دکتی شاخ زریں۔ کسی زمانے میں پانی کا یہ چھوٹا سا کٹڑا دنیا کی محفوظ ترین بندرگاہ تھی۔ ان دنوں پل غلطہ ابھی تعمیر نہیں ہوا تھا۔ اس کی جگہ پندرہ سو فٹ لمبی ایک آہنی زنجیر شہر کے دونوں حصوں کو آپس میں ملائی تھی۔ عام حالات میں یہ زنجیر سطح آب سے چند فٹ اونچی رکھی جاتی تاکہ اجازت کے بغیر کوئی بھی جہاز بندرگاہ کے اندر داخل نہ ہو سکے۔ جہاز عام طور پر پاسفورس میں کھڑے ہو کر اپنے جھنڈوں کی نمائش کرتے۔ اگر یہ دوست ملک کے ہوتے تو کنارے پر لگی وزنی چرخوں کو گھمایا جاتا۔ زنجیر ڈھیلی ہو کر سمندر کی تہہ میں بیٹھ جاتی اور جہاز آسانی سے بندرگاہ میں داخل ہو جاتا۔ جہاز کے گزر جانے پر زنجیر دوبارہ کس دی جاتی۔

ہم پل کے دوسری جانب سیڑھیوں سے نیچے اتر کر تھکے قدموں ہوٹل کی جانب روانہ ہو گئے۔

افریسیا کا صوفیہ - کانستطنائن کا آبی محل

دوسری صبح ہم نے ناشتہ ہوٹل کے کیفے میں ہی کیا۔ دیوار کے ساتھ جہاں انگور کی بیلین چبٹی ہوئی تھیں، ہم کرسیوں پر بیٹھے ترک کافی کے کڑوے گھونٹ نگلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرے سامنے میز پر استنبول کا تفصیلی نقشہ پھیلا ہوا تھا۔

علی نے جیب سے ترک سگریٹوں کا پیکٹ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ ”ترک تمباکو خوشبو اور مزے کے لحاظ سے دنیا بھر میں بہترین ہے۔“ اس نے لائٹر سے میرا سگریٹ سلگاتے ہوئے بالکل اشتہاری انداز میں کہا اور پھر نقشے پر ایک نظر ڈال کر پوچھا۔ ”ویسے آج پروگرام کیا ہے؟“ میں نے قلم سے نقشے پر نشان لگاتے ہوئے کہا۔ ”آیا صوفیہ۔ سلطان احمد مسجد اور کانستطنائن کا آبی محل۔“

ہم ہوٹل سے باہر نکل کر آیا صوفیہ کی قدیم دیوار کے سائے میں چلتے ہوئے وہاں سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر واقع ”ہپڈ روم“ یعنی ”رومی کھیلوں کے وسیع میدان“ میں پہنچ گئے۔ اس میدان میں اس شہر کی عظمت کی ابتداء ہوئی تھی۔ ہمارے پہلو میں ”آیا صوفیہ“ کی عمارت تھی۔ اس کی مخالف سمت میں سلطان احمد مسجد کا دالان نظر آ رہا تھا اور بیچ کے میدان میں پرانے قسطنطنیہ کی چند یادگاریں آسمان کی وسعتوں کو چھو رہی تھیں۔ 234ء میں یہ شہر جو اس وقت بازنطائن کہلاتا تھا، رومنوں کے ہاتھوں فتح ہوا اور بعد میں اس کا نام رومی شہنشاہ کانستطنائن کے نام پر قسطنطنیہ رکھ دیا گیا۔ ”کانستطنائن کا شہر“ اگرچہ ان دنوں روم زوال پذیر تھا مگر رومی تہذیب میں اب بھی زندگی کی حرارت موجود تھی۔ کانستطنائن نے نیزے کی آنی سے شہر کی وسیع تر حدود کی نشاندہی کی

تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد صوفیہ کا دروازہ کھل گیا۔ ہم نے ایک لیرے کا ٹکٹ خریدا اور صدر دروازے سے اس عمارت میں داخل ہوئے جس کے استنبول کی طرح تین روپ تھے۔ ماضی بعید میں عیسائیوں کا مقدس ترین گرجا، ماضی میں مسلمانوں کی مایہ ناز مسجد اور حال میں اتاترک کا سرد اور بے جان میوزیم۔ عظیم ہال میں خنکی اور تاریکی تھی، میری نظریں تاریکی کی عادی ہوئیں تو لاتعداد بھاری ستونوں، ایک بلند اور ہیبت ناک گنبد اور وسیع خلاء کا احساس ہوا۔

رعایا کی اکثریت چونکہ عیسائی مذہب اختیار کر چکی تھی، اس لیے رومی شہنشاہ، کانستانتائن نے بھی سراسر سیاسی مصلحتوں کے تحت یہ مذہب اپنا لیا اور پہلا عیسائی رومی شہنشاہ کہلایا۔ نئے مذہب کی ترویج و اشاعت کے لیے اس نے سنانا صوفیہ کی بنیاد رکھی اور تعمیر کے دوران خود ایک مزدور کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ تقریباً تین سو برس بعد شہر میں ہنگاموں کے دوران یہ کلیسا آگ لگنے سے مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔ بادشاہ وقت جستینین نے اس کی عمارت کو وسیع تر بنیادوں پر از سر نو تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ یونان سے سنگ مرمر اور سنگ سرخ کے ذخیرے آئے۔ اناطولیہ کے پہاڑوں سے نیلا اور کالا پتھر منگوایا گیا۔ دیوتا زمیں اور دیوی ڈائنا کے معبدوں کو اجازت کران کے نوادرات اس نے معبد کی سجاوٹ کے لیے استعمال کئے گئے۔ عظیم گنبد کا اندرونی حصہ سونے کی پتھریوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس طرح جھاڑ اور فانوسوں کی روشنی طلائی چھت سے منعکس ہو کر سنگ مرمر کے چمکتے ہوئے فرش پر پڑتی تو ساری عمارت سنہری ہو جاتی۔ عمارت کے مکمل ہونے پر جستینین صدر دروازے سے اندر داخل ہوا تو عین اسی جگہ جہاں میں کھڑا تھا، وہ ایک لمحہ کے لیے ٹھکا اور پھر بے اختیار ہاتھ فضا میں بلند کر کے پکار اٹھا۔ ”اے سلیمان، میرا معبد تیرے ہیکل سے بھی عظیم تر ہے۔“

کہتے ہیں کہ جستینین نے معماروں کو حکم دیا کہ معبد مکمل ہونے پر بڑے گنبد کے نیچے یہ حروف کھودے جائیں۔ ”جستینین نے یہ کلیسا خدا کی عظمت کے لیے بنوایا۔“ لیکن جب شہنشاہ کی نظر گنبد پر پڑی تو وہاں اس عبادت کی بجائے ”افریسیا نے یہ کلیسا خدا کی عظمت کے لیے بنوایا۔“ تحریر تھا۔ جستینین نے غضب ناک ہو کر معماروں سے اس تبدیلی نام کی وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ اگرچہ انہوں نے جستینین کا نام ہی کھودا تھا مگر آہستہ آہستہ یہ دھندلا پڑتا گیا اور افریسیا

اور کہا۔ ”یہ شہر روم کی جگہ لے گا۔ اس کی سات پہاڑیوں پر روم سے عظیم تر عمارتیں اور وسیع تر باغات کی تشکیل ہوگی۔“ چنانچہ رومی سلطنت کے خزانے ”نئے روم“ کی تعمیر کے لیے کھل گئے۔ سات پہاڑیوں پر سنگ مرمر کے چار سو محلات تعمیر کیے گئے۔ ”نئے روم“ کے شہر نے تمام سلطنت کے تاجروں، کاریگروں اور فنون لطیفہ کے ماہروں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ مستطیل شکل کے اس وسیع میدان کے دونوں طرف بلند و بالا مجسمے نصب کئے گئے۔ یہاں پر ”پیرس کی ہیلن“ تھی۔ اس کو نے میں ابوالہول کے آٹھ دیوزاد بت کھڑے تھے۔ اس طرف خسر دانہ روم کا نشان مادہ بھیڑیا مجسمے کے روپ میں جلوہ گر تھا اور پھر پیتل کے بنے ہوئے چار خوبصورت گھوڑے جو ستونوں پر نصب تھے اور جنہیں صلیبی جنگوں کے دوران اہل ویش اکھاڑ کر لے گئے، آج بھی ویش کے سینٹ مارک چوک میں یہ گھوڑے قسطنطنیہ کی عظمت کی یاد دلاتے ہیں۔

11 مئی 330ء کو لاکھوں باشندوں کی موجودگی میں شہنشاہ کانستانتائن نے اس میدان میں جہاں اب ہم کھڑے تھے، نئے روم کا افتتاح کیا اور اسے رومی سلطنت کا دار الخلافہ قرار دیا۔ نئے روم نے اس خوشی میں چالیس روز تک جشن منایا۔ یہاں تک شہر میں موجود شراب کا تمام ذخیرہ ختم ہو گیا۔ بحیرہ مرمر کے کنارے تعمیر کردہ شاہی محلات کا صدر دروازہ بھی اسی میدان کی جانب کھلتا تھا۔ وہاں اب احمد مسجد کی عمارت کھڑی ہے۔ اس دور کی یادگاروں میں اب صرف مینار سوزیدہ اور سانپوں کا مینار ہی باقی رہ گئے ہیں۔ سانپوں کے مینار پر سلطان فاتح کے گرز کے نشانات ہمیں مسلمانوں کی فتح قسطنطنیہ کی یاد دلاتے ہیں۔

میں اور علی پارک میں رکھے ہوئے ایک آہنی بیج پر بیٹھ کر ”آیا صوفیہ“ کے کھلنے کا انتظار کرنے لگے۔ ہمارے ساتھ ایک معمر ترک اخبار پڑھنے میں مشغول تھا۔ وہ کبھی کبھار اخبار سے نظر ہٹا کر ایک چھوٹی سی بچی کی طرف بھی نگاہ ڈال لیتا جو ہاتھ میں غبارہ لیے احمد مسجد کے کبوتروں کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ ”صوفیہ کا دروازہ کتنے بجے کھلتا ہے؟“ میں نے ترک سے پوچھا۔

”مجھے معلوم نہیں۔“ اس نے اخبار تہہ کر کے اپنی گود میں رکھ لیا اور صوفیہ کے عظیم گنبد کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں نے کبھی اندر جانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ معبد کو صرف خدا کی پرستش کے لیے وقف ہونا چاہیے۔ چاہے وہاں صلیب رہے یا ہلال۔ اب تو یہ طبع کا ڈھیر ہے۔ میوزیم بنادینے سے اس کی روح ختم ہوگئی ہے۔“ بوڑھے نے اخبار کھولا اور پڑھنے میں مگن ہو گیا۔

”یہاں کون ہے جو افریسیا نام کی عورت کو جانتا ہے؟“ شہنشاہ نے درباریوں کو قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا، سب خاموش کھڑے رہے۔ آخر کار کلیسا کے ایک خا کرو ب نے بتایا کہ اس نام کی ایک اپانچ بڑھیا کلیسا کی دیوار کے ساتھ ایک شکستہ جھونپڑے میں رہتی ہے۔ شہنشاہ کے حکم پر بڑھیا کو حاضر کیا گیا۔

”تمہارا نام افریسیا ہے؟“ جتینین نے گرجتے ہوئے پوچھا۔

”عظیم شہنشاہ، یہ میرا ہی نام ہے۔“ بڑھیا نے لرزتے ہوئے جواب دیا۔

”تم گنبد پر کھدے ہوئے اپنے نام کے بارے میں کیا جانتی ہو؟“

”میں بالکل کچھ نہیں جانتی سرکار۔“ بڑھیا کی آواز کانپ رہی تھی۔

”ایک مرتبہ پھر گنبد کی طرف دیکھو جہاں میرے نام کی بجائے غیبی طور پر تمہارا نام لکھا گیا ہے۔ جواب دو کہ تمہارا اس معبد کی تعمیر میں کتنا حصہ ہے؟“

”کچھ بھی تو نہیں حضور، میں تو اپانچ ہوں۔“ اس نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

”بالکل کچھ نہیں۔“ جتینین نے چیختے ہوئے کہا۔ ”تم یہاں پاس ہی رہتی ہو۔ سوچو

اور غور کرو کیا تم نے معبد کی تعمیر کے لیے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کا نتیجہ گنبد پر تمہارے نام کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔“

”ایک چھوٹی سی بات ہے سرکار..... لیکن اتنی چھوٹی سی بات.....“

بڑھیا نے بے تحاشا کانپنا شروع کر دیا۔

”ڈرو نہیں۔“ جتینین نے نرمی سے کہا۔ ”میں جانتا چاہتا ہوں۔“

”میرا جھونپڑا اس معبد کی دیوار کے پہلو میں ہے۔ میں اپانچ ولا چار اپنے بستر پر پڑی

ہوتی تو میرے کانوں میں گھوڑوں اور بیلوں کے کراہنے کی آوازیں آتیں۔“ بڑھیا نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ ”یونان سے اس معبد کے لیے سنگ مرمر کی بھاری سلیں باسفورس کی بندرگاہ پر اتاری جاتیں تو ان کو گھوڑوں اور بیلوں کی پیٹھ پر لا کر یہاں تک لایا جاتا۔ یہ جانور جب میرے گھر کے سامنے والی چڑھائی چڑھتے تو پتھر کے بوجھ سے ان کے پاؤں پھسلنے اور ان میں سے کئی وہیں گر جاتے اور بیشتر بری طرح ہانپنے لگتے۔ میرا دل ان بیچارے جانوروں کی حالت زار

پر بہت ہی کڑھتا مگر میں کربھی کیا سکتی تھی۔ ایک روز بارش کے بعد جب پھسلن ہو گئی تو میں رہ نہ سکی اور اپنا بستر گھسیٹ کر باہر لے آئی اور اس کے گدے میں سے بھوسا نکال کر ڈھلوان سڑک پر بچھا دیا۔ اس طرح پھسلن ختم ہو گئی۔ اب میں اپنے جھونپڑے کے فرش پر بستر کے بغیر پڑی رہتی لیکن میرے کانوں میں جانوروں کے کراہنے اور ہانپنے کی آوازیں آنی بند ہو گئیں۔“

جتینین اپنے تخت سے اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ ”اس بڑھیا کو میرے محل میں پہنچا دیا جائے۔“ اس نے حکم دیا۔ ”اور اس کے آرام و آسائش کا پورا خیال رکھا جائے“ اور پھر گنبد کی عمارت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”افریسیا کا نام اسی جگہ رہے گا۔ اس معبد کی تعمیر میں اس کا حصہ مجھ سے کہیں زیادہ ہے۔“

مجھے یاد آیا کہ ہمارا ”یوسل ہوٹل“ بھی اسی معبد کی دیوار کے ساتھ ہے جہاں کبھی اپانچ افریسیا کا جھونپڑا ہوا کرتا تھا۔ آج بھی دودھ اور سبزی کے چھکڑے جب علی الصبح باسفورس سے آنے والی ڈھلوان سڑک پر سے گزرتے ہیں تو ان کے کھینچنے والے گھوڑوں اور خچروں کے ہانپنے کی آوازیں ہوٹل کے کمروں تک آتی ہیں مگر اب اس جگہ کوئی افریسیا نہیں رہتی۔

میں نے گنبد کی طرف دیکھا۔ وہاں نیم تاریکی میں مجھے افریسیا کا نام کہیں نظر نہ آیا۔ جتینین کے دور کے بعد صوفیہ کی عظمت لاطینی لیروں کے ہاتھوں ختم ہوئی۔ انہوں نے سونا چاندی اور قیمتی پتھر اکھاڑ لیے۔ یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ کی صلیب کی لکڑی بھی اٹھا کر لے گئے۔

اس اجڑی ہوئی حالت میں بھی صوفیہ ایک عظیم معبد ہے۔ اس کے بھاری بھر کم ستون اور گنبد اس کی عظمت رفتہ کے واضح نشان ہیں۔ خاص طور پر گنبد اس طرح تعمیر کیا گیا ہے جیسے ہوا میں معلق ہو۔ اونچی کھڑکیوں کے رنگین شیشوں میں سے مدہم روشنی اندر آ رہی تھی۔ سلطنت روم کے تمام شاہوں کی رسم تاج پوشی اسی نیم تاریک عمارت میں ہوا کرتی تھی۔ ہم نے وہ دروازہ بھی دیکھا جہاں سے سلطان محمد فاتح نے اس کلیسا میں قدم رکھا اور پھر ”پوتر مریم“ کے گیتوں کی بجائے ”اللہ اکبر“ کی صدائیں اس کے درود دیوار سے نکلائیں۔ عمارت کے چاروں کونوں پر مینار تعمیر کئے گئے۔ نئے ستونوں اور محرابوں کا اضافہ ہوا۔ دیواروں سے حضرت عیسیٰ اور رومی بادشاہوں کی شبیہوں کو منادیا گیا۔ مراد سوئم نے مسجد کے دالان میں وضو کے لیے تالاب بنوائے اور گنبد پر طلائی

چاند نصب کیا جو دور دور سے نظر آتا تھا۔ عبادت گزاروں کی تبدیلی سے عبادت گاہ کی پاکیزگی اور تقدس میں کوئی فرق نہ آیا۔ ترک سلطان محل سرا سے چلتے اور جمعہ کی نماز یہاں آ کر ادا کرتے۔ پھر اسے جانے کس مصلحت کے تحت اتنا ترک نے میوزیم قرار دے دیا۔ یا محمدؐ، یا ابوبکرؓ، یا عمرؓ، یا عثمانؓ اور یا علیؓ کے طغروں کے نیچے جہاں عقیدت اور جذبے کے چراغ جلتے تھے وہاں اب تاریکی اور اداسی ہے۔ بوڑھے ترک نے سچ کہا تھا۔ ”معبود کو صرف خدا کی پرستش کے لیے وقف ہونا چاہیے۔ چاہے وہاں صلیب رہے یا ہال۔“

ہم صوفیہ سے باہر نکلے تو دھوپ کی چمک سے آنکھیں چندھیا گئیں۔ ہم ہوز روم کا میدان پار کر کے احمد مسجد کی دیوار کے ساتھ ایک کیفے میں دوپہر کے کھانے کے لیے بیٹھ گئے۔ کیفے کے مالک کی فرمائش پر ہم نے ترکوں کی مرغوب غذا شہد میں پکی ہوئی سویاں اور کالید کا کاپیلا دہی کھایا۔ اب ہمارا ارادہ کانستطنائن کا آبی محل دیکھنے کا تھا۔ میں نے جیب سے نقشہ نکال کر میز پر پھیلا دیا اور دیکھنے لگا۔ نقشے کے مطابق یہ محل ہمارے عین سامنے مینار سوزیدہ کے ساتھ ہونا چاہیے تھا لیکن وہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔ میں نے ساتھ والی میز پر بیٹھے ترک نوجوان سے محل کے بارے میں دریافت کیا، وہ اس وقت دو امریکی لڑکیوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا اور انہیں باس فورس کے کنارے اپنے ”یالی کاٹج“ میں قیام کرنے کی دعوت دے رہا تھا۔ پہلی مرتبہ شاید وہ میری بات سن نہ سکا۔ چنانچہ میں نے گلا صاف کر کے ایک مرتبہ پھر کوشش کی، ”کانستطنائن کا آبی محل.....؟“

”مینار سوزیدہ کے ساتھ بنی ہوئی جھونپڑی میں چلے جاؤ۔“ اس نے لڑکیوں سے نظریں ہٹائے بغیر بڑی رکھائی سے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

جھونپڑی کے دروازے کے ساتھ ٹکٹ کی کھڑی تھی جس کے پیچھے نیلی وردی میں ملبوس ایک بوڑھا ترک اٹکھ رہا تھا۔ میں نے کھڑکی کے سوراخ میں ہاتھ ڈال کر اس کی آنکھوں کے سامنے انگلیاں نہچائیں۔ ”ہیلو۔ بھائی وہ کانستطنائن کا.....“

”دو لیرے۔ دو لیرے۔“ اس نے میری بات سننے بغیر ہانک لگائی۔ ٹکٹ خرید کر ہم جھونپڑی کے اندر داخل ہو گئے۔ دروازے کے ساتھ ہی لکڑی کی سیڑھیاں نیچے جاتی تھیں۔ ہم نیم تاریکی میں آہستہ آہستہ نیچے اترے۔ ہمارے سامنے کانستطنائن کا زیر زمین آبی محل کھڑا تھا۔

تین سو چھتیس مرم مر میں یونانی ستون جو کمر تک گہرے سبز پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ محل کی چھت سے پانی کی بوندیں رِس رِس کر ستونوں کے اس وسیع تالاب میں ٹپ ٹپ گر رہی تھیں۔ جیسے جل ترنگ بج رہا ہو۔ سیڑھیوں کے قریب چند ستونوں پر بجلی کے قفے ٹنمارہے تھے لیکن اس سے پرے مکمل تاریکی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک پراسرار جھیل میں سینکڑوں ستون اُگ آئے ہیں۔ میں خوبصورتی اور خاموشی کی اس بوچھاڑ کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ بچپن میں بچوں کا ایک ناول ”پانی کے بچے“ پڑھا تھا۔ ”ایسی جگہوں پر رہتے ہوں گے وہ بھی۔“ میں نے سوچا، غم آلود اور بوسیدہ سیڑھیاں اتر کر میں پانی کی سطح تک چلا گیا اور وہاں بیٹھ کر ستونوں کے پیچھے آبی محل کے تاریک کونوں میں جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ ”شراب!“ ایک آواز آئی، میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔

”شراب! شراب!“ میں نے غور سے سبز پانی کی تہہ میں دیکھا۔ مچھلیاں بے شمار مچھلیاں لیکن ایران کی زیر زمین کاریزوں میں پلنے والی سفید اندھی مچھلیاں نہیں بلکہ خوبصورت رنگ برنگی گول گول آنکھیں مکاتی مچھلیاں۔ میں انہیں قریب سے دیکھنے کے لیے اور آگے جھک گیا۔ ”آگے مت بڑھو۔“ علی نے اوپر سے سرگوشی کی۔ ”لکڑی کے تختے کمزور ہیں۔“

”کمزور ہیں، کمزور ہیں۔“ ستونوں کے تالاب میں آواز گونجی، میں واپس آ گیا۔ ہم باہر آئے تو ایک گائیڈ سواحوں کی ایک ٹولی لیے نیچے جا رہا تھا۔

”اور اب ہم کانستطنائن کے اس آبی جزیرے کی طرف جا رہے تھے جہاں جیمز بانڈ کی فلم ”فرام ریشاؤڈلو“ کی شوٹنگ ہوئی تھی۔“

مسجد کے وسیع دالان میں داخل ہوتے ہی سامنے پانی کے ٹل نظر آتے ہیں جہاں عورتیں اور مرد نماز سے قبل وضو کرتے ہیں۔ صدر دروازے پر چڑے کا ایک دبیز پردہ لٹک رہا تھا جو مسجد کے اندرونی حصے کو باہر کی تیز دھوپ اور روشنی سے محفوظ رکھتا ہے۔ میں نے اپنے جوتے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیے اور پردہ اٹھا کر اندر چلا گیا۔ مسجد کے اندر داخل ہوتے ہی ایک وسیع اور گہرے نیلے سمندر کے درمیان ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی وجہ مسجد کے درو دیوار پر لگی ہوئی دیدہ زیب نیلی اینٹیں ہیں جن کی نسبت سے اسے ”نیلی مسجد“ بھی کہتے ہیں۔ پورا فرش خوش رنگ دبیز قالینوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ کچھ لوگ نماز پڑھ رہے تھے اور چند قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف تھے۔ زیادہ تعداد سیاحوں کی تھی جو محراب کی خوبصورتی اور نیلی اینٹوں کے نقش و نگار میں کھوئے ہوئے تھے۔

اندھی بڑھیا اور کبوتر

استنبول کو بجا طور پر مسجدوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ ساڑھے پانچ سو سے زائد خوبصورت مسجدوں کا شہر۔ اگرچہ سلطان فاتح کے زمانے سے شروع ہو کر بیسویں صدی کے آغاز تک ہر ترک سلطان اور وزیر اعظم نے خوبصورتی اور پاکیزگی کے ان معبودوں کی تعمیر میں حصہ لیا لیکن آج کا خوش نظر استنبول بڑی حد تک سلیمان عظیم الشان کے معمار سنان کی کاوشوں سے وجود میں آیا۔ سنان سلطان کے ”جائداروں“ کی فوج میں شامل تھا اور اسی دوران اسے مصر اور ایران جا کر وہاں کے فن تعمیر کے بارے میں جاننے کا اتفاق ہوا۔ وہاں سے واپسی پر سلطان کے حکم سے اس نے مسجد سلیمانیہ کا نقشہ تیار کیا اور استنبول کی تیسری پہاڑی پر اس کی بنیاد رکھی۔ سات سال تک ہزاروں مزدور اور معمار مسجد کی تعمیر میں مصروف رہے۔ مسجد کی ماحقہ عمارتوں میں ایک مدرسہ، شفا خانہ، سرائے اور بازار بھی شامل تھے۔ تعمیر مکمل ہونے پر سنان نے سلیمان سے کہا کہ ”اے سلطان! میں نے تیرے لیے ایسی مسجد بنائی ہے جو قیامت تک روئے زمین پر قائم رہے گی۔“ فن تعمیر کے نقادوں کی رائے میں سلیمان کی مسجد جنتین کے سامنا صوفیہ سے بھی بڑھ کر ہے اور اس رو سے ہیکل سلیمانی کی مد مقابل بھی۔ سنان نے اپنی زندگی میں تین سو کے لگ بھگ عمارات کے نقشے تیار کئے اور ان کی تعمیر کروائی۔ ان میں مسجدوں کے علاوہ پل، فوارے، مدرسے اور کاروان سرائیں بھی شامل تھیں۔

سلیمانیہ کے پہلو بہ پہلو سلطان فاتح، سلطان احمد، بایزید، رستم پاشا اور سلطان سلیم کی مساجد بھی ترک فن تعمیر کے نادر شاہکار ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی تاریخ اور طرز تعمیر پر کئی باب لکھے جاسکتے ہیں۔ طوالت سے بچنے کے لیے میں یہاں صرف سلطان احمد مسجد کا ہی ذکر کروں گا۔

اس مسجد کا نقشہ سلطان احمد کی خواہش پر معمار داؤد نے تیار کیا اور سامنا صوفیہ کے بالمقابل جہاں کسی زمانے میں رومی محلات تھے۔ اس کی تعمیر شروع کر دی۔ مسجد میں فن تعمیر کے کئی نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ مثلاً اتنا بڑا گنبد صرف چار ستونوں کے سہارے کھڑا ہے۔ اس طرح نماز کے لیے زیادہ سے زیادہ جگہ بھی نکل آئی ہے۔ یہ مسجد اس لحاظ سے باقی تمام مسجدوں سے ممتاز ہے کہ اس کے چھ مینار ہیں جو مرکزی عمارت کے چاروں طرف دالان کے دو کونوں پر واقع ہیں۔ چند علماء نے احتجاج کیا کہ چونکہ مسجد حرام کے چھ مینار ہیں، اس لیے کسی دوسری مسجد کے اتنے مینار تعمیر کرنا جائز نہیں۔ چنانچہ سلطان نے مسجد حرام کے میناروں میں ایک کا اضافہ کر کے انہیں سات کر دیا۔

میں مسجد سے باہر نکلا تو آیا صوفیہ کے پہلو میں جاتی ہوئی سڑک پر سیاحوں کا ہجوم تھا۔ ”محل سرا میں واقعی مشہور زمانہ عجائب گھر ”ٹوپ کا پی“ کے دروازے کھل گئے ہوں گے۔“ میں نے سوچا مگر میں آج عجائب گھر یا محلات دیکھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس لیے استنبول کی ایک اور خوبصورت مسجد بایزید دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ راستے میں ”بازار“ بھی پڑتا تھا۔ چنانچہ کچھ عرصہ وہاں بھی گھومتا رہا۔ یہ ڈھکے ہوئے بازار مشرق وسطیٰ کے تمام بڑے اور چھوٹے شہروں میں پائے جاتے ہیں۔ (اگرچہ استنبول یورپ میں ہے لیکن سراسر مشرقی ہے) اور ان میں دنیا جہاں کی چیزیں بکتی ہیں۔ تانبے کے برتن، زیورات، ملبوسات اور ملکی دست کاریاں، استنبول کے بازار میں آپ کو سوئڈ اور چمڑے کے کوٹ دنیا بھر میں آرزاء ترین ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ مرسان پتھر کے بنے ہوئے پائپ جو چند روز کی تباہ کنوشتی کے بعد سفید سے چمکیلے بھورے رنگ میں بدل جاتے ہیں۔

اور فصیل ٹوٹ گئی

ہماری بس ایڈرنیو پل دروازے سے گزر کر بائیں ہاتھ مڑ گئی۔ اب ہم قدیم استنبول کی حدود سے باہر آ چکے تھے۔ بس شہر کی پرانی فصیل کے ساتھ ساتھ جا رہی تھی۔ کسی زمانے میں شہر کو بیرونی حملہ آوروں سے بچانے کے لیے یہاں تین فصیلیں ہوا کرتی تھیں اور ان کے ساتھ ساتھ ایک بیس گز چوڑی کھائی جو پانی اور کچرے پر ہوتی تھی۔ ہر سو فٹ کے فاصلے پر حفاظتی مینار ایسا دہ تھے جہاں دشمن پر آگ اور پتھر برسائی کی مشینیں نصب تھیں۔ پرانی فصیل کے کچھ حصے ابھی تک کھڑے ہیں مگر زیادہ حصہ کھنڈر بن چکا ہے اور اہل شہر اسے طے کے طور پر استعمال میں لاتے ہیں۔ حفاظتی کھائی اب کھیتی باڑی کے کام آتی ہے۔

آج صبح حسب معمول جب ناشتے کے بعد میں کیفے کے صحن میں بیٹھا استنبول کا نقشہ دیکھ رہا تھا تو مجھے خیال آیا کہ میں نے سلطانوں کی مسجدیں اور شہنشاہوں کے کلیسا تو تو دیکھ ڈالے مگر استنبول کے پہلے شہید اور نبی اکرم کے پیارے صحابی حضرت ایوبؑ انصاری کا مرقد بھی تو دیکھوں۔ یہ بس مجھے ”آیوب“ یعنی ایوب مسجد کی طرف ہی لے جا رہی تھی۔ ہم ابھی تک فصیل کے کھنڈروں کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ پندرہ سو برس تک یہ توانا فصیلیں ناقابل تسمیر کھڑی رہیں اور بالاخر سلطان محمد نے ان کا غرور خاک میں ملا دیا۔ مسلمانوں نے قسطنطنیہ ایک ہی حملے میں فتح نہیں کر لیا تھا بلکہ اس کے لیے انہیں سینکڑوں برس کی پیہم جدوجہد کرنی پڑی۔

ترک لوگ جانوروں سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ گھوڑا گاڑی کا کوچوان اپنے پاس چابک رکھنا بھی گناہ کبیرا سمجھتا ہے۔ اسی طرح استنبول کی تمام مساجد کے باہر آپ کو کبوتروں کے غول کے غول ملیں گے۔ چھوٹے بچے اور بوڑھی عورتیں کبوتروں کا دانا بیچ رہے ہوتے ہیں۔ پچیس کروڑ کی قیمت میں دال کی ایک پڑیا خرید لیجئے۔ کبوتروں کو دانا ڈالیں اور ایک ترک روایت کے مطابق آپ کے کچھڑے ہوئے دوست مل جائیں گے۔ بایزید مسجد کے لاتعداد کبوتر آپ کو اس بوڑھی بیوہ کی یاد دلاتے ہیں جس کا کل سرمایہ کبوتروں کا ایک جوتا تھا جو اس نے مسجد کے افتتاح کی تقریب پر سلطان کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ میں شام ڈھلے اسی مسجد کے دالان میں داخل ہوا تو صحن کے بیچ کالے کبوتروں کے ایک ڈھیر میں سے آواز آئی۔ ”کبوتروں کو دانا کھلائیے اور ثواب کمائیے۔“ میں نے دھندلکے میں سے غور سے دیکھا تو موٹے اور بھدے کبوتروں کے درمیان ایک بڑھیا بیٹھی دانا بیچ رہی تھی۔ اس کے سامنے دال کی ایک پوٹی رکھی تھی جسے کبوتر چونچیں مار مار کر کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کالے اور سرمئی کبوتر اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے اور سوائے بڑھیا کے سفید بالوں کے اس کا سارا جسم اس غول میں ڈھکا ہوا تھا۔ پانچ کچھ کبوتر بڑے مزے سے اس کے کبڑے کندھوں پر سوار تھے۔ کبھی کبھار کوئی کبوتر اس کے سر پر بیٹھنے کی کوشش کرتا تو وہ زور زور سے سر ہلانے لگتی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چھڑی تھی جسے وہ بار بار اپنے گرد گھماتی تاکہ کبوتر اس کا پیچھا چھوڑ دیں مگر وہ بڑی ڈھٹائی سے اس کے جسم اور دانے کی پوٹی پر بیٹھے رہتے۔ میں نے جیب سے پچیس کروڑ نکالے اور بڑھیا کی طرف بڑھادیے لیکن وہ میرے بڑھے ہوئے ہاتھ کی طرف دھیان دیئے بغیر وہی صدا لگاتی رہی۔ ”کبوتروں کو دانا کھلائیے اور ثواب کمائیے۔“ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ بڑھیا دیکھ نہیں سکتی۔ وہ اندھی تھی۔ میں نے پچیس کروڑ اس کے سامنے پھینک دیئے اور جیب سے دس لیرے کا نوٹ نکال کر بڑھیا کا کمزور ہاتھ پکڑا اور اس کی ہتھیلی میں رکھ دیا۔ ”میں ساری پوٹلی خریدوں گا۔“ اس نے نوٹ لے کر بے یقینی سے فضا میں گھورا، کبوتروں کو ہٹا کر پوٹلی میرے آگے کھسکا دی اور پھر اپنی چھڑی ادھر ادھر گھمانے لگی۔ میں نے پوچھا۔ ”مائی اب تم گھر کیوں نہیں جاتیں؟“ ”گھر؟“ اُس نے چھڑی اپنے سر پر گھماتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ ”میں تو یہی رہتی ہوں، ان کبوتروں کے پاس۔“ میں نے جھک کر دانے کی پوٹلی اٹھائی اور اس کی جھولی میں ڈال کر مسجد دیکھے بغیر باہر آ گیا۔

سب سے پہلی مہم امیر معاویہ کے عہد میں عبدالرحمن بن خالد بن ولید کی قیادت میں بھیجی

گئی۔ محاصرے کے دوران سیف اللہ کا بیٹا وفات پا گیا اور ابوسفیان کو قائد چن لیا گیا۔ اس لشکر میں یزید بن معاویہ کے علاوہ حضرت ایوب انصاری بھی شامل تھے۔ محاصرہ چھ برس تک جاری رہا۔ اس دوران حضرت ایوب انصاری بھی رحلت فرما گئے اور ان کی وصیت کے مطابق انہیں استنبول کی فیصل کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ اس بہادر سپاہی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے رومی جرنیل بھی جنازے میں شریک ہوئے۔ مسلمانوں کو چونکہ رومیوں کی طاقت کا صحیح اندازہ نہ تھا، اس لیے یہ محاصرہ ناکام رہا۔

اس کے بعد خلیفہ سلیمان کے عہد میں مسلمہ کی قیادت میں ایک مرتبہ پھر شہر کا محاصرہ کیا گیا مگر اس بار بھی بڑی اور خاص طور پر بحری حملے ناکام رہے۔ مسلمانوں کے دونوں محاصروں کی ناکامی میں رومیوں کے مہلک ہتھیار ”یونانی آگ“ کا ہاتھ تھا جو ایک عیسائی کی ایجاد کردہ تھی۔ یہ ایک قسم کا تیل تھا جو ہوا لگتے ہی شعلوں میں بھڑک اٹھتا اور پانی کے اتصال سے آگ اور تیز ہو جاتی۔ مسلمان بحریہ کے لیے یہ آگ تباہ کن ثابت ہوئی۔

جس وقت وحشی منگول ایشیا پر حملہ آور ہوئے تھے تو اس سے بچنے کے لیے ایک جھاکش اور جری قبیلے نے دریائے فرات پار کیا اور وسط ایشیا کے سب سے بڑے شہر برساکو فتح کر کے ایک نئی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ یہ عثمان ترک تھے۔ روایت ہے کہ سردار عثمان نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ ایک تن آور درخت کے سائے میں پہاڑوں کے وسیع سلسلے ہیں۔ درخت کے تنے سے چار دریا جہ، فرات، ڈینیوب اور نیل اُبل رہے ہیں۔ ان پہاڑوں اور دریاؤں پر موذن کی آواز گونج رہی ہے۔ فتح و کامرانی کی ان نشانیوں میں سب سے عجیب بات یہ تھی کہ درخت کے تمام پتے قسطنطنیہ کی جانب جھکے ہوئے تھے۔ اس شہر کی فتح عثمان ترکوں کے مقدر میں لکھ دی گئی تھی۔

ترکوں کے لیے صرف ایشیائی کافی نہ تھا۔ انہوں نے بلقان کا تمام علاقہ بھی فتح کر لیا اور ایڈرین کو یورپی سلطنت کا دار الخلافہ قرار دیا۔ آہستہ آہستہ قسطنطنیہ کے گرد عثمان ترکوں کا گھیراؤ تنگ ہوتا گیا۔ ہر نئی فتح کے بعد شہر کے باشندوں کو ترکوں کے گھوڑوں کی ٹاپیں نزدیک ترسانی دینی شروع ہو گئیں۔ 402ء میں یہ آواز شہر کی فیصلوں تک پہنچ گئی اور رومیوں کو یقین ہو گیا کہ قسطنطنیہ کی فتح کا سہرا سلطان بایزید کے سر ہی بندھے گا لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ امیر تیمور وسط ایشیائی سلطنتوں کو روندنا عثمان ترکوں کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ بایزید نے فوراً قسطنطنیہ کا محاصرہ اٹھالیا اور اپنی سلطنت بچانے کے لیے افواج کا رخ انگوڑہ کی طرف موڑ دیا۔ اس بہادر ترک

کو میدان جنگ میں شکست ہوئی اور تیمور اُسے ایک آہنی ہنجرے میں قید کر کے سمرقند لے گیا۔ ترک اس شکست سے بددل نہ ہوئے اور سلطان محمد اول نے چالیس برس کے قلیل عرصے میں فوج کی تنظیم نو کے بعد بیشتر علاقے دوبارہ فتح کر لیے۔ محمد اول کا پوتا سلطان محمد دوم

اکیس برس کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ سلطنت کا انتظام سنبھالتے ہی سلطان محمد نے اپنے بزرگوں کی پیروی کرتے ہوئے قسطنطنیہ کی فتح کے لیے تیاریاں شروع کر دیں۔ باسفورس کے تنگ دڑے کے ایشیائی کنارے پر سلطان محمد اول کا تعمیر کردہ قلعہ موجود تھا۔ اب اس کے سامنے پورپی کنارے پر سلطان کی نگرانی میں ”رومیلی حصار“ تعمیر کیا گیا۔ اس طرح باسفورس کے دونوں کنارے ترکوں کے قبضے میں آ گئے اور یوں سمندر کے اس حصے میں غیر ملکی جہاز سلطان کو ٹیکس دے کر ہی گزر پاتے۔ یہ درہ قسطنطنیہ کی شاہ رگ تھا کیونکہ تمام سامان رسد اسی راستے سے شہر کو جاتا تھا۔

دونوں جانب اب پوری فوجی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ تمام موسم سرما سلطان اپنے انجینئروں اور سپہ سالاروں کی مدد سے شہر کے محاصرے کی منصوبہ بندی کرتا رہا۔ سرنگیں کہاں بچھائی جائیں؟ توپیں کس جگہ نصب ہوں! فیصل کا کونسا حصہ کمزور ہے؟ اس دوران اور نہ میں ایک نیا اسلحہ خانہ کھولا گیا جہاں تین ماہ کے عرصے میں ار بن نامی ایک انجینئر کے زیر نگرانی ایک ایسی توپ تیار کی گئی جو ساڑھے سات من کا گولہ پھینک سکتی تھی۔ اس توپ کو سات سو مزدوروں اور ایک سو بیلوں کی مدد سے گھسیٹ کر قسطنطنیہ کی فیصل کے سامنے لے جایا گیا۔

6 اپریل 1453ء کو قسطنطنیہ کا یادگار اور آخری محاصرہ شروع ہوا۔ سلطان محمد بارہ ہزار جانثاروں، بیس ہزار گھڑ سواروں اور ایک لاکھ پیدل فوج کی معیت میں آگے بڑھا اور شہر کے سینٹ رومالس دروازے کے سامنے ترک علم گاڑ دیا۔ ترک فوج کے خیمے شہر کے مغربی حصے کے علاوہ شاخ زریں کے شمال سے لے کر بحیرہ مرمر تک پھیلے ہوئے تھے۔ باسفورس کی جانب سلطان کی بحریہ تیار کھڑی تھی۔ محاصرے کو کئی روز گزر گئے مگر شہر کی فیصلیں نہ ٹوٹ سکیں۔ سلطان نے فیصلہ کیا کہ حملہ خشکی اور سمندر سے ایک ساتھ ہونا چاہیے مگر مصیبت یہ تھی کہ بحریہ کے راستے میں بندرگاہ کے دہانے پر کسی ہوئی آہنی زنجیر تھی اور دوسری طرف خشکی تھی۔ جب تک جہازوں کو بندرگاہ میں پہنچانے کی صورت نہ نکلے، محاصرہ مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ سلطان نے اس ناممکن صورت حال کا ایک ایسا بیباکانہ اور انوکھا حل سوچا جس کی مثال آج تک بحری تاریخ میں نہیں ملتی۔ باسفورس اور

بندرگاہ کے درمیان دس میل کا خشک علاقہ تھا جو الغلطہ کہلاتا تھا۔ راتوں رات لکڑی کے تختے بچھا کر بندرگاہ تک ایک راستہ بنالیا گیا اور پھر بے شمار جانور ذبح کر کے ان کی چربی ان تختوں پر مل دی گئی۔ جہازوں کے تلے چرخیوں اور پیسے لگا کر انہیں سینکڑوں سپاہ اور جانوروں کی مدد سے گھسیٹ کر لکڑی کے اس چکنے راستے پر لاکھڑا کیا۔ رات کے پچھلے پہر جب سمندر سے تیز ہوا آئی تو بادبان کھول دیئے گئے اور کچھ بادبانوں میں ہوا بھر جانے کی وجہ سے اور کچھ سپاہیوں اور جانوروں کے دھکیلنے سے یہ جہاز آہستہ آہستہ خشکی پر پھسلنے ہوئے خاموشی سے بندرگاہ میں اتر گئے۔ صبح کی پہلی روشنی میں رومنوں نے جو کچھ دیکھا وہ ایک معجزے سے کم نہ تھا۔ حفاظتی زنجیر جوں کی توں تھی اور ترکوں کے اسی جہازوں کے پھریرے ان کی بندرگاہ میں لہرا رہے تھے۔

شکست رومیوں کا مقدر بن چکی تھی۔ سلطان نے اپنی بھرپور کوشش کی کہ رومی ہتھیار ڈال دیں اور جان و مال کا زیاں نہ ہو مگر عیسائی ابھی تک کسی ایسے معجزے کے انتظار میں تھے جو انہیں ”کافروں“ سے بچالے گا۔ سانتا صوفیہ میں دن رات دعائیں مانگی جا رہی تھیں۔

28 مئی کو سلطان نے اپنے آخری احکام جاری کر دیئے۔ بارہ گھڑسواروں نے ناقوس بجا کر پوری فوج کو آگاہ کیا۔ ”شہر اور اس کی عمارتیں میری ہیں۔“ سلطان نے فوج سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”لیکن سونے اور چاندی کے خزانے تمہاری بہادری کا انعام ہوں گے۔ میری سلطنت ایشیا اور یورپ میں پھیلی ہوئی ہے اور کل صبح قسطنطنیہ کی فصیل پر سب سے پہلے پہنچنے والا نو جوان میری اس سلطنت کے سب سے خوبصورت صوبے کا حقدار ہوگا۔“

شب کی تاریکی میں گولہ بارود، توپیں اور دوسرا سامان حرب اس کھائی کے کنارے اکٹھا کر دیا گیا جس کے دوسری طرف شہر کی فصیل کھڑی تھی۔

29 مئی کو سورج نکلنے سے پہلے صبح کے دو بجے خشکی اور سمندر پر لاکھوں ترکوں کے نعرہ تکبیر کی صدا گونجی اور فصیل پر یلغار شروع ہو گئی۔ سلطان سب سے اگلی صفوں میں دس ہزار جانثاروں کے درمیان گزر ہاتھ میں لیے جوانوں کو آگے بڑھنے کا حکم دے رہا تھا۔ بندرگاہ کی طرف سے بحریہ گولے برسا رہی تھی، ساری فضا میں بارود اور خون کی مہک رچی تھی۔ اس نازک لمحے میں ”جانثار“ آگے بڑھے جو ترک فوج کے بہترین دستوں پر مشتمل نو جوان تھے، طاقتور اور ناقابل شکست، سلطان کے انعام کا پہلا حقدار حسن تھا۔ دراز قد، تنومند اور نڈر حسن۔ ایک ہاتھ میں

تلوار سونے دوسرے میں ڈھال تھا اے اپنے تین ساتھیوں سمیت وہ بڑی بے خوفی سے فصیل پر چڑھنے لگا۔ اس کے ساتھی شہید ہو گئے مگر وہ بے خطر آگے بڑھتا رہا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا قد آدرا جسم قسطنطنیہ کی ناقابل تسخیر فصیل کی بلندی پر دکھائی دیا اور پھر ساتھ ہی تیروں کی ایک بوچھاڑ اس کے سفید ریشمی لباس کو خون سے تر کر گئی۔ اس نے ایک گھٹنا ٹیک کر اٹھنے کی کوشش کی تو درجنوں برجھے اس کے خوبصورت جسم میں پیوست ہو گئے۔ حسن نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا اور ترک اس کی بے مثال شجاعت کی پیروی کرتے ہوئے دشمن پر پل پڑے۔ رومیوں کے قدم اکھڑنے شروع ہو گئے۔ ایک نیزا کا نطنطائے جسم میں پیوست ہو گیا اور وہ زخمی ہو کر اپنے ہی سپاہیوں کی لاشوں کے ڈھیر تلے دب گیا۔ شہنشاہ کے مرتے ہی رومیوں کی مدافعت ختم ہو گئی۔ ادھر فاتح فوج فصیل کے شکافوں میں سے شہر میں داخل ہوئی اور ادھر بحریہ کے جوان فصیل توڑ کر ان سے آئے۔ ترین دنوں کے محاصرے کے بعد قسطنطنیہ نے سلطان محمود کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور اس کے ساتھ ہی سلطنت روم کا گہنایا ہوا سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ آج سے سلطان محمد ”فاتح“ کے نام سے پکارا جانے لگا اور قسطنطنیہ استنبول کے نام سے..... اسی شام سلطان محمد فاتح سینٹ رومالس دروازے سے شہر میں داخل ہوا۔ اس کے پہلو میں وزراء، سپہ سالار اور جانثاروں کے دستے تھے۔ ان جانثاروں میں سے ہر ایک بقول ایک تاریخ دان کے ہر کولیس کی جسامت اور اپالو کے خوبصورت جسم کا مالک تھا۔ فاتح نے شہر کی عجوبہ روزگار عمارتوں پر ایک نظر ڈالی جواب اس کی ملکیت تھیں۔ چوڑا روم کے میدان میں اس کی نگاہ سانپوں کے مینار پر پڑی اور اس نے طاقت آزمائی کے طور پر گرز مار کر اس کا ایک حصہ منہدم کر دیا۔ سانتا صوفیہ کے دروازے کے باہر سلطان اپنے گھوڑے سے اترے اور عیسائیت کے اس عظیم معبد میں داخل ہوا۔ کہتے ہیں کہ ایک ترک سپاہی کلیسا کا قیمتی سنگ مرمر ادھیڑنے میں مشغول تھا۔ سلطان نے تلوار کے ایک ہی وار سے اسے وہیں ڈھیر کر دیا۔ اس کے حکم سے سانتا صوفیہ کو مسجد میں تبدیل کر دیا گیا۔ ایک سپاہی نے سب سے بلند گنبد پر کھڑے ہو کر اذان دی اور سلطان نے اس جگہ کھڑے ہو کر نماز ادا کی جہاں رومی شہنشاہوں کی رسم تاجپوشی ہوا کرتی تھی۔ مسجد صوفیہ سے سلطان شاہی محلات میں گیا جواب ویران ہو چکے تھے۔

”شاہی محلوں میں مکڑی اپنا جالا بن چکی ہے اور افراسیاب کے میناروں پر اُلو پہرہ

دے رہا ہے۔“ سلطان نے اجڑے ہوئے محلات کو دیکھ کر کہا۔

کانسطنٹائن کی مٹخ شدہ لاش جب لاشوں کے ڈھیر سے برآمد ہوئی تو اسے اس کے جوتوں پر کندہ شاہین کے شاہانہ نشان دیکھ کر شناخت کیا گیا۔ فاتح نے اپنے حریف کو پورے شاہانہ احترام سے دفن کیا۔

فتح کے تیسرے روز سلطان نے خواب میں دیکھا کہ حضرت ایوب انصاری شہر کی فصیل کے ساتھ بندرگاہ کے ایک کونے کی طرف اشارہ کر کے اپنے دفن کا پتہ بتا رہے ہیں۔ ان کی وفات کے سات سو اسی برس بعد سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ کے پہلے شہید کا شاندار مقبرہ بنوایا اور اس کے پہلو میں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کروائی۔ میں اب حضرت ایوب انصاریؑ کے مزار کی جالی کے سامنے کھڑا تھا۔ جنہوں نے جوانی میں بدر اور احد میں دادِ شجاعت دے کر اسلام کے پودے کی آبیاری کی اور بڑھاپے میں قرآن سینے سے لگائے مدینے سے ہزاروں میل دور اللہ کی راہ میں کام آئے۔ وہ اسلام کی خاطر پیہم جدوجہد پر یقین رکھتے تھے اور کون جانے یہ حضرت ایوبؑ کی بے قرار روح تھی جو ہر دور میں مسلمانوں کو کشاں کشاں کھینچ کر اس شہر تک لاتی رہی۔ مزار کے گرد بیشار عقیدت مند دعا میں مصروف تھے۔ میں نے فاتحہ پڑھی اور پھر مسجد کے اندر چلا گیا جہاں لوگ قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے۔ ”اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں کام آئے ان کو مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں اور ان کو رزق دیا جاتا ہے اپنے اللہ کے پاس۔“

حضرت ایوب انصاریؑ کے لیے ترک سلطانوں کی عقیدت کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان سب کی رسم تاج پوشی ہمیشہ ایوب مسجد میں ہوا کرتی تھی اور ان کی تدفین مسجد کے پہلو میں واقعی قبرستان میں..... میں مسجد سے نکل کر جب اس قبرستان میں پہنچا تو سورج غروب ہو رہا تھا اور پتھر کے کتبوں کے سائے لمبے ہو کر سڑک تک آرہے تھے۔ قبرستان کے ساتھ بلندی کی طرف ایک راستہ جاتا ہے جس کے آخر میں ایک چھوٹا سا قبوہ خانہ ”پیئر لوتی“ کے نام سے مشہور ہے۔ مصنف اور سیاح ”پیئر لوتی“ جس نے استنبول کے حسن میں ڈوب کر ”آئے زادے“ جیسی رومانوی تخلیق کی یہاں آیا کرتا تھا۔ سورج غروب ہونے پر شفق کی سرخی ہر سو پھیلی تو شاخ زریں بھی شاخ سرخ میں بدل گئی۔ دورانِ فراق پر آیا صوفیہ مسجد سلطانیہ اور مسجد سلیم کے مینار دکھائی دے رہے تھے۔

شہزادوں کے جزیرے

اگرچہ ہمیں استنبول آئے ہوئے کافی دن گزر چکے تھے مگر میرے لیے اس خوبصورت شہر سے جدائی کا تصور بے حد دشوار ثابت ہو رہا تھا، علی صرف میرے اسرار پر اتنے روز ٹھہرا رہا ورنہ اسے یہاں پر سوائے ترک تمباکو اور جادہ استقلال کے اور کچھ پسند نہ آیا تھا اور اب وہ ہر صورت یہاں سے جانے پر تلا ہوا تھا، میں نے بھی مستقبل کی طویل سیاحت کو مد نظر رکھتے ہوئے روانگی کا فیصلہ کر لیا چنانچہ ہم یورپ کے لیے ٹکٹ خریدنے کے ارادے سے باسفورس کے کنارے واقعی ریلوے اسٹیشن پر چلے گئے، دفتر معلومات میں اگلے سفید بالوں والی ایک چاک و چوبند دادی اماں براجمان تھیں جن کی شکل جاسوسی ناول لکھنے والی مصنفہ آگاتھا کرشی سے بے حد مماثلت رکھتی تھی۔

”بیٹو تم کہاں جاؤ گے؟“ انہوں نے نہایت شفقت سے دریافت کیا۔

”میں تو ولایت جاؤں گا۔“ علی نے خوش ہو کر کہا

”اور میرا ارادہ اٹالیہ تک جانے کا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”لنڈن کے لیے ڈائریکٹ اور نیٹ مرمر ایکسپریس ہر شام ساڑھے سات بجے چلتی

ہے ٹکٹ گھر سے بیٹنگی بنگ کر والیجے۔“

اسٹیشن کے بینک سے کرنسی تبدیل کروا کر ہم نے دوسری شام کے لیے دو نشستیں ریزرو کر والیں۔ لنڈن پانچ سو چھیانوے لیرے اور وینس اٹالیہ تین سو لیرے، ”برائے مہربانی سفر سے پہلے بخاریہ، یوگوسلاویہ اور اٹالیہ کے ویزے ضرور حاصل کر لیجئے،“ بنگ کلرک نے ہمیں تاکید کی،

”یہ سلطان سلیمان کی طلائی تلوار ہے جس پر ایک ہزار سے زائد ہیرے جڑے ہیں۔“

گاہ چنڈیا جوں کو بتا رہا تھا۔

”اس سے سلطان صاحب بادام ہی توڑتے ہوں گے“ علی نے اکتا کر کہا آدمی تو مرنے سے رہا۔ میں علی کو وہیں چھوڑ کر چینی ظروف کا کمرہ دیکھنے چلا گیا، وہاں سے واپسی پر جنگی سامان کے عجائب گھر کی طرف جا رہا تھا کہ سامنے ایک چھوٹا سا بورڈ نظر آیا ”لبادہ اس طرف ہے۔“ مجھے تجسس ہوا کہ یہ لبادہ کیسا ہے جس کے لیے خاص طور پر یہاں بورڈ لگایا گیا ہے، چنانچہ میں علامتی نشانات دیکھتا ایک پرانے کمرے تک چلا گیا، اندر بالکل خاموشی تھی، کمرے کے وسط میں شیشے اور لکڑی کا ایک کیس دھرا تھا..... میں نے بلب کی ناکافی روشنی میں کیس کے اندر جھانکا۔ میرے ذہن نے احترام اور جذبے کی ایک ایسی معراج کو چھو لیا جو مجھ جیسے گنہگار کے خواب و خیال میں بھی نہ تھی، میری روح کے درونہاں خانوں میں عقیدت کی ایک ایسی لہر اٹھی جس نے میری ہستی کو اپنے اندر سمویا، یہ میرے نصیب تھے کہ میں اپنی آنکھوں سے رسول اللہ کی مہر رسالت دیکھ رہا تھا، حضور کے مقدس ہاتھوں نے کئی بار اسے چھوا ہوگا۔ مہر کے ساتھ حضور کے ایک فرمان پر مہر کا نشان بھی تھا، اس کے علاوہ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ کی تلواں بھی اسی کیس میں رکھی تھیں۔

کمرے کے پہلو میں ایک چھوٹا سا دروازہ نکلتا تھا جس کے ساتھ آہنی سلاخوں کے پیچھے ایک اور نسبتاً چھوٹا کمرہ تھا ”لبادہ اس طرف ہے“ نشان کا رخ انہی سلاخوں کی طرف تھا، کمرے کی چاروں دیواریں چھت اور فرش بیش بہا قالینوں کی کٹی تھیں میں ڈھکے ہوئے تھے۔ عین وسط میں ایک چھوٹا سا صندوق دھرا تھا، میری آنکھیں آہنی سلاخوں کو پار کر کے صندوق کے ڈھکنے سے ٹکرائیں، صندوق میں حضور صلعم کا لبادہ مبارک تھا جسے فجر دعو عالم کے جسم مبارک کا قرب حاصل رہا تھا..... کاش اس صندوق کا ڈھکنا کھلا ہوتا اور میری آنکھیں لبادہ مبارک پر بچھ جاتیں۔ میں کتنی ہی دیر وہاں سلاخوں کو تھامے اپنی خوش بختی پہ نازاں کھڑا رہا، ساتھ والے کمرے سے سیاہ لباس میں ملبوس ایک ضعیف بڑھیا اپنے نوجوان پوتے کا سہارا لیے بڑی مشکل سے چلتی ہوئی آ رہی تھی، اس کے جھریوں سے بھرپور چہرے پر ایک تقدس آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ سلاخوں کے قریب آتے ہی بڑھیا نوجوان کا ہاتھ چھو کر آگے بڑھی، سر پر بندھا رو مال ماتھے پر

مجھے چونکہ بعد میں سوئٹر لینڈ بھی جانا تھا اس لیے سب سے پہلے ہم ”پی آئی اے“ کے دفتر سے متصل سوس قونسلٹ میں گئے، سنہری بالوں والی خوش مزاج رپیشنٹ لڑکی نے پہلے ہمیں چائے پلوائی اور پھر پانچ منٹ میں ویزا تیار کروادیا، اطالوی قونصل نے فارم کے ساتھ تین تصاویر کی بھی فرمائش کی چنانچہ استقلال کے ایک فٹ ہاتھ سٹوڈیو سے تصویر کھنچوا کر بھاگ بھاگ واپس پہنچے اور دو گھنٹے بعد ویزا مل گیا، بوگوسلاویہ والوں نے فارم پُر کروانے کا تردد کیے بغیر مفت میں ویزے کا ٹھپہ لگا دیا، بلغاریہ کے قونصل کے سامنے ویزا حاصل کرنے والوں کی ایک لمبی قطار تھی، ”پاسپورٹ، ویزا فارم اور دس لیرے جمع کرادیں، امید ہے پرسوں تک ویزا تیار ہو جائے گا۔“

”لیکن ہم تو کل شام کی گاڑی پر جا رہے ہیں۔“ میں نے گہرا کر کہا۔

”مجبوری ہے، دراصل بیشتر ترک مزدور چھٹیاں گزار کر واپس جرمنی جا رہے ہیں اس لیے کام کی زیادتی ہے، ہاں البتہ ایکسپریس ویزا ابھی مل سکتا ہے۔ دس لیرے زائد لگیں گے۔“

شام تک انتظار کے بعد ہمیں ایکسپریس ویزا فوراً مل گیا۔

آج استنبول میں ہمارا آخری دن تھا، دس بجے تک ہم نے اپنے سامان کی پیکنگ مکمل کر لی، گاڑی چونکہ شام ساڑھے سات بجے چلتی تھی اس لیے ہم نے سوچا کہ لگے ہاتھوں ہوٹل سے متصل ترک سلطانوں کا محل سرا بھی دیکھ لیا جائے جو ٹپ کاپی اور سرائلو کے نام سے بھی مشہور ہے..... بازنطینیوں کے عہد میں یہاں گھنا جنگل تھا جسے سلطان فاتح نے ایک خوبصورت باغ میں بدل دیا۔ پھلدار درختوں اور پھولوں کے تختوں کے درمیان فوارے اور بارہ دریوں تعمیر کروائیں، محلات اور حرم سرا کا اضافہ بعد میں ہوا..... ہم سب باب ہمایوں سے اندر داخل ہوئے تو سخت مایوسی ہوئی چند غیر موثر عمارتوں کے علاوہ وہاں کچھ بھی نہ تھا، یہ مراد سوئم کی خواب گاہ ہے۔ اس کمرے میں دی آنا سے مصر تک پھیلی ہوئی سلطنت کے فرمان جاری ہوتے تھے۔ یہ لاہیری تھی، یہاں شاہی باورچی خانہ تھا وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ مختلف کمروں میں چھوٹے چھوٹے عجائب گھر تھے جہاں سونے چاندی اور جواہرات کی بہتات دیکھ کر کوفت ہونی شروع ہو گئی، ٹپ کاپی کا مشہور ہیرا بھی دیکھا جسے اڑانے کی خاطر عالمی شہرت یافتہ چور حضرات موقع کی تلاش میں رہتے ہیں، ظاہر ہے ان کو اس کے حجم کے بارے میں غلط اطلاعات ملی ہیں، مرغی کے انڈے جتنا بھی نہیں۔

کھینچا اور گھٹنے ٹیک کر دیوانہ وار کبھی سلاخوں کو اور کبھی دیوار کو چومنے لگی ”محمد، محمد، محمد“ وہ بار بار پکار رہی تھی۔

”دادی اماں میں تمہیں اس شرط پر یہاں لایا تھا کہ تم یہ فرسودہ روایات نہیں دہراؤ گی۔“ نوجوان نے بڑھیا کو قدرے درشتگی سے کہا اور بازو سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔

”بس اب نہیں کروں گی بیٹے“ بڑھیا نے بے بسی سے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی اس کی بوڑھی آنکھیں بھیگ چکی تھیں اور وہ اب تک صندوق پر نگاہیں جمائے کھڑی تھی، قدیم اور جدید کے اس کھنور امتزاج نے مجھے دکھی کر دیا۔

دروازے پر کھڑے محافظ نے مجھے بتایا کہ سلطان سلیم اول کی فتح مصر کے بعد یہ تبرکات قاہرہ سے استنبول منتقل کر دیئے گئے، ان میں حضور کا لبادہ مبارک، عصا مبارک اور مہر رسالت بھی شامل تھیں، تبرکات کے لیے ایک خصوصی ہال کی تعمیر ہوئی۔ ہر سال ماہ رمضان میں لبادہ مبارک کے ایک کونے کو بھگو کر نچوڑا جاتا اور نچڑا ہوا پانی بلور کی شیشیوں میں بند کر لیا جاتا۔ اسی طرح مہر رسالت کاغذ کے پچاس پرزوں پر ثبت کی جاتی اور پھر شاہی خاندان کے علاوہ سلطنت کے تمام عہدے داروں کو ایک ایک شیشی اور مہر کا نشان عید کے تحفے کے طور پر روانہ کیا جاتا۔ عید کی نماز کے بعد عثمانی سلطنت کے ہر صوبے کا گورنر عوام کے سامنے مہر کا نشان منہ میں رکھ کر اسے اس پانی سے نگل لیتا جو لبادہ مبارک سے نچوڑا گیا تھا۔

محل سرا کی فیصل کے اندر ہی ”نرکش آر کیا لوجیکل میوزیم“ کی عمارت میں یونانی عہد کے نوادرات رکھے گئے ہیں۔ ہم سکندر اعظم کا خالی تابوت اور اپالو کے مندر کے چند ستون دیکھ کر چار دیواری سے باہر نکلے تو دھوپ کی شدت کا احساس ہوا، ابھی صرف بارہ بجے تھے اور ہماری گاڑی ساڑھے سات بجے شام چلتی تھی ”اب کیا کیا جائے“ میں نے سوچا، ایک دم مجھے خیال آیا کہ ایک روز ہوٹل میں وہی مرسان پائپ والا سویڈش لڑکا بحیرہ مرمر میں واقع ”شہزادوں کے جزیروں“ کے بارے میں بے حد جذباتی ہو رہا تھا، اسے یقین تھا کہ یہ جزیرے سحر زدہ ہیں فیصلہ ہوا کہ اس بارے میں تحقیق کی جائے اور وہیں چلا جائے۔

غلطہ پل کے ساتھ میڑھیاں اتر کر ہم عین پل کے نیچے پانی پر تیرتے ہوئے لکڑی کے

پلیٹ فارم پر آ گئے، باسفورس میں لہریں اٹھیں تو پلیٹ فارم ہمارے قدموں تلے جھولنے لگتا۔ پل کے نیچے مختلف سال تھے جن پر رسالے، مٹھائیاں، کباب اور تلی ہوئی مچھلی بک رہی تھی، بکٹ والی کھڑکی کے ساتھ بورڈ پر مختلف سمتوں کو روانہ ہونے والے سیٹروں کے اوقات درج تھے..... مرمرہ کے جزیرے، گیلی پولی، باسفورس..... ہم نے ”پرنسز آئی لینڈز“، یعنی ”شہزادوں کے جزیروں“ کے لیے ایک بجے چلنے والے سیٹر کے دو واپسی ٹکٹ خرید لیے، پلیٹ فارم کے ساتھ پھیرے بحیرہ اسود کی خاص مچھلی ”سورفش“ بیچ رہے تھے۔ ساتھ ہی امریکی بحریہ کا ایک جنگی جہاز لنگر انداز تھا، جزیروں کو جانے والا سیٹر ساحل کے ساتھ لگا تو عرشے پر کھڑے ملاحوں نے ایک چوٹی تختہ پلیٹ فارم پر پھینک کر اوپر جانے کے لیے راستہ بنا دیا۔ ہمارے سوا پلیٹ فارم پر کھڑے تمام مسافروں نے تمام تکلفات بالائے طاق رکھ کر سیٹر پر دھاوا بول دیا، بالکل ایسے ہی جیسے قندھار میں سینما کے دروازے کھلنے پر دیہاتی افغان واڑھیاں منہ میں دبائے سب سے پہلے ہال میں داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ پردہ سیمیں کے عین سامنے سیٹوں پر قبضہ جمایا جاسکے۔ کچھلی سیٹوں پر بیٹھنے سے جتنی مالا کے جسمانی خطوط میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ بہر حال لوگ عرشے پر پہنچی آرام کرسیوں کو قابو کرنے کی فکر میں ہوتے ہیں تاکہ سفر کے دوران دھوپ سینگی جا سکے۔ ہم بھی اسی دھکم پیل میں سیٹر کے اندرونی حصے تک پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر بعد سیٹر نے بھونپو بجایا اور پل غلطہ کے ساحل سے پیچھا چھڑا کر باسفورس میں تیرنے لگا، یوں محسوس ہوا جیسے ہم بھی سلطان فاتح کے کسی جہاز میں سوار ہیں جو خشکی سے پھسل کر سمندر میں چلا گیا ہے۔ ارد گرد کے سمندر میں حسب معمول خوب چہل پہل تھی، متعدد سیٹر یورپ اور ایشیا کے ”پھیرے“ لگا رہے تھے، پھیروں کی کشتیاں ڈول رہی تھیں اور ان کے درمیان ایک چٹان پر ”لینڈر کا مینار“ کھڑا تھا۔ پادریوں نے شہنشاہ کا نسطھان کو بتایا کہ اس کی خوبصورت بیٹی کی موت سانپ کے کاٹے سے ہوگی، شہنشاہ نے شہزادی کی مستقل رہائش کے لیے باسفورس کے نیچے مینار بنوادیا تاکہ وہ سانپوں کی پہنچ سے باہر رہے، شہزادی سارا دن مینار کی بلند کھڑکی سے سمندر کو دیکھتی رہتی۔ شاہی محل سے روزانہ ایک جی سجائی کشتی آتی اور شہزادی کو کھانے پینے کی چیزیں دے کر واپس چلی جاتی، ایک روز شہزادی نے چوری چھپے مینار کے قریب سے گزرتی ہوئی پھیروں کی کشتی سے انگوروں کی ایک ٹوکری خرید لی اور اسی شب کالے انگوروں کے نیچے چھپے ہوئے موڈی ناگ نے اسے ڈس لیا۔

مینار کے دوسری طرف فلانس نائٹ اکیلے ہسپتال واقع ہے۔ ہمارے بائیں ہاتھ محل سراگز رہا تھا جس کے عین نیچے ایک چھوٹی سی بندرگاہ ہوا کرتی تھی۔ سلطان کسی جنگی مہم سے واپس آتا تو جہاز سے اتر کر سیدھا محل سرا میں داخل ہو جاتا۔ دروازہ قامت حبشی خواجہ سرا نے پندیدہ اشخاص کو یورپوں میں باندھ کر نیچے لے آتے اور کشتی میں رکھ کر باسفورس کے وسط میں ڈبو دیتے۔ پل غلط پر سے گزرنے والی ٹریفک کا شور اور باسفورس میں چلنے والے جہازوں اور سیٹھروں کے بھونپوں کی آوازیں اب دور ہوتی جا رہی تھیں، ہمارے سیٹھرنے بھی اپنی رفتار تیز کر دی، سمندر کا پانی تیز دھوپ میں شیشے کی مانند چمک رہا تھا، دھوپ کی شدت کو سمندر کی نمی نے اپنے اندر سمولیا تھا، اب سیٹھر کی اپنی دنیا جاگ اٹھی۔

درمیانی منزل نہایت پرسکون تھی۔ آرام دہ صوفے اور سمندر کے نظارے کے لیے شیشے کی گول کھڑکیاں، یہاں زیادہ تر بوڑھے اور شادی شدہ لوگ اوتھ رہے تھے اور پرعشرے پراہم چاہوا تھا، بڑے فریبوں کی گول گول شیشوں والی عینکیں لگائے، منی سکرت پہنے چیونگم چباتی ہوئی مختلف قسم کی لڑکیاں، مسلمان نہیں لگتی تھیں، ایک لڑکا کارڈین بجا رہا تھا۔ لہروں کا شور زیادہ ہو جاتا تو تمام لڑکے لڑکیاں تال کے ساتھ ساتھ تالیاں پیٹنے لگتے، چند لوگ تاش کھیلنے میں مصروف تھے۔ ایک کونے میں دو امریکی ملاح گرد و پیش کے ماحول سے بے خبر بیڑے ڈبوں کو منہ لگائے دھوپ سینک رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ایک جزیرہ آیا اور لوگ اترنے لگے، میں کیمبرے سنبھال کر اٹھنے لگا تو ساتھ بیٹھی ہوئی ترک لڑکی نے کہا ”ابھی بیٹھے رہو۔ آخری جزیرے پر اترنا۔ زیادہ خوبصورت ہے۔“

آخری جزیرہ واقعی باقی جزیروں سے زیادہ خوبصورت تھا، سمندر کی نیلا ہٹ میں سرسبز اور شاداب درختوں کا ایک جھنڈ، خوبصورت سفید مکانات اور سرخ مٹی کی ایک لکیر جو ساحل کو چھو رہی تھی..... ساحل کے ساتھ سڑک پر ریسٹوران اور قبوہ خانوں کے ویٹر سفید ڈنر جیکٹوں میں ملبوس ہاتھ میں مینو کارڈ تھا۔ سیٹھر سے اترنے والے گاہکوں کا انتظار کر رہے تھے، اکثر لوگ سیٹھر سے اتر کر ساحل سے پرے خوبصورت پہاڑیوں پر نگاہ ڈالے بغیر فٹ پاتھ پر لگی کرسیوں پر بیٹھ کر دوپہر کے کھانے کی تیاری کرنے لگے۔ کارڈین بجانے والے لڑکے کے ساتھی چوک میں کھڑی بگیوں

پر سوار ہو کر جزیرے کے کسی پرسکون گوشے کی تلاش میں جا چکے تھے۔ ہم بھی سیٹھر سے اترے اور ساحل چھوڑ کر ڈھلوان سڑک پر چڑھتے ہوئے قصبے کے چھوٹے چوک تک آ گئے۔ ایک دکان کے باہر سوکھا گوشت، پنیر اور مچھلیاں لوہے کے کنڈوں سے لٹکی ہوئی جھول رہی تھیں۔ دروازہ کھول کر اندر گئے تو دکاندار نے مسکرا کر پوچھا ”مسلمان؟“ ہم نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”الحمد للہ“ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر زور سے ہلایا۔ ”فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”ہم چاہتے ہیں کہ جزیرے کے کسی خوبصورت گوشے میں بیٹھ کر پکنک منائی جائے اس کے لیے ہمیں کچھ کھانے کی چیزیں درکار ہیں۔“

دکاندار نے اپنے رومال سے اچھی طرح ہاتھ صاف کیے اور باہر جا کر گوشت کا بڑا ٹکڑا کنڈے سے اتار لایا ”کتنے؟“ اس نے ایک آری ہاتھ میں لے کر پوچھا ”دو لیرے“ میں نے جواب دیا۔ اس نے ایک چھوٹا سا ٹکڑا کاٹ کر علیحدہ رکھ دیا ”نہیں پانچ لیرے“ علی نے اپنے خالی پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ پانچ لیرے کا ٹکڑا خاصا بڑا تھا، اسی طرح پنیر، مچھلی، ڈبل روٹی اور ابلے ہوئے انڈوں کی قیتوں کا فیصلہ ہوا۔

”اور ہاں شراب۔“ دکاندار نے شیلف پر سجی رنگ برنگی بوتلوں میں سے ایک نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دی ”اسی جزیرے کے انگوروں سے بنی ہے۔“

”نہیں“ میں نے ہنس کر کہا ”ہمیں انگوروں کی بلیں دیکھ کر ہی نشہ ہو جاتا ہے۔“

”ہاں میں تو بھول ہی گیا تھا۔ مسلمان!“ اس نے مایوسی سے سر ہلایا اور بوتل اٹھا کر واپس شیلف میں رکھ دی۔

میں خوراک کا بنڈل اٹھا کر دکان سے باہر آنے لگا تو اس نے مشورہ دیا۔ ”اس چوک سے دائیں ہاتھ مڑ کر پہاڑی کی چوٹی تک چلے جائیے، چوٹی پر چڑھ کے درختوں کا جھنڈ ہی جزیرے کا حسین ترین گوشہ ہے۔“

چوک کے گرد درجنوں قدیم وضع کی بگیاں کھڑی تھیں، رنگین جھالروں اور گول پھندوں سے مزین، گھوڑوں کے ساز نہایت نفیس قسم کے تھے اور ان کے گلے میں چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں، ہم نے ایک بگھی کرائے پر لے لی۔

”جزیرے کا پورا چکر لگائیے گا یا صرف قمار خانے تک چلے گا۔“ کوچوان نے اپنی ٹوپی ماتھے پر سرکائی اور سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”فی الحال تو پہاڑی کی چوٹی کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ جاؤ۔“ میں نے بل کھاتی ہوئی سڑک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ہو ہو“ کوچوان نے نہایت پیار سے گھوڑے کی پیٹھ پر ہتھکی دی۔ بگھی حرکت میں آئی تو چھتکتی ہوئی گھنٹیوں کی مسلسل موسیقی شروع ہو گئی جس میں گھوڑے کی ٹاپ تال کا کام دے رہی تھی۔

کسی زمانے میں جب ترک شہزادے محل سرا کی کسی سازش میں ملوث پائے جاتے یا کسی وجہ سے سلطان کے زیر عتاب آ جاتے تو انہیں ان جزیروں میں نظر بند کر دیا جاتا، اسی نسبت سے انہیں ”شہزادوں کے جزیرے“ کہا جاتا، آج کل جب موسم گرما میں استنبول میں سخت تیش اور جس کا دور دورہ ہوتا ہے تو لوگ ان جزیروں کا رخ کرتے ہیں جہاں آب و ہوا خوشگوار اور ماحول پرسکون ہوتا ہے۔

اب ہماری بگھی بلندی کی طرف جا رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف سفید رنگ کے خوشنما مکان تھے جن کے گرد چھوٹے چھوٹے باغیچے سرخ، نیلے اور کاسنی پھولوں سے الٹے پڑے تھے، دھندلائے ہوئے سنگ مرمر کے پرانے فواروں کے گرد خورد و جنگلی بیلین لپٹی ہوئی تھیں، سرو اور چیز کے گہرے سبز درخت مکانون کی چھتوں تک چلے گئے تھے۔ سبزے اور خوشنما پھولوں نے مکانون کا مکمل گھیراؤ کیا ہوا تھا، سمندر سے نرم ہوا کے جھونکے آتے تو جنگلی گلاب کی بیلین دیواروں سے چھوٹ کر سفید ادھ کھلی کھڑکیوں میں جھانکنے لگتیں۔ ہر طرف ایک مکمل اور سرخ انگیز سکون تھا، ہماری بگھی کا سفید گھوڑا ایک مکا کی کھلونے کی مانند سر ہلاتا چلا جا رہا تھا اور اس کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیاں چھن چھن رہی تھیں۔ بیلوں کے جھنڈ میں سے ایک سفید کھڑکی کھلی اور اس میں سے ایک من موئی صورت نے جھانکا۔ ”چھن چھن کی اس موسیقی نے سحر توڑ دیا ہے۔“ میں نے سوچا ”اور سوئی ہوئی شہزادی جاگ اٹھی ہے۔“ شہزادی نے خوابیدہ آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر کھڑکی دوبارہ بند کر لی، یکدم موسیقی بھی بند ہو گئی۔

”بگھی آگے نہیں جاسکتی“ کوچوان نے باگیں کھینچ لیں ”یہاں سے آپ کو پیدل

جانا پڑے گا۔“

ہم نے کراہی ادا کیا اور سڑک کو چھوڑ کر اوپر جانے والی پگنڈی پر ہو لیے۔ چوٹی پر چیل اور سرو کا گھنا جنگل تھا۔ درختوں کی چھاؤں میں خورد و جنگلی گھاس کی تہیں بچھی تھیں جن میں اکا دکا زرد پھول بھی نظر آ رہے تھے۔ ہم اس چھوٹے سے جنگل کو پار کر کے دوسرے کنارے پر چلے گئے جہاں سے پھر ڈھلوان شروع ہو جاتی تھی یہاں سے بحیرہ مرمر اور اس میں بکھرے ہوئے خوبصورت جزیرے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے گھاس پر اپنی سفید برساتی بچھا دی اور لیٹ گیا۔ علی خوراک کا بندل زمین پر رکھ کر سنانے لگا۔

”پکنک کے لیے جگہ کا انتخاب غلط ہوا ہے“ میں نے تھوڑی دیر بعد وہاں سے اٹھنے ہوئے کہا۔

”کیوں یہاں کیا قباحت ہے؟“ علی نے جھنجھلا کر پوچھا۔

”یہاں سے سامنے والے جزیرے کا ایک کونہ نظر نہیں آ رہا۔“ میں نے برساتی سینٹے ہوئے جواب دیا اور درختوں کے جھنڈ کے ساتھ کھلی جگہ کی طرف چلا گیا۔

”یہ جگہ بہتر ہے۔“ میں نے برساتی بچھاتے ہوئے کہا۔

”کچکی بات ہے نا؟“ علی نے اکتاہٹ سے کہا ”پھر کہو گے سمندر میں فلاں کشتی کے بادبان کا زادیہ ٹھیک نہیں بن رہا۔“

علی کی بے چینی بجاتی تھی، ہم دونوں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں گھاس پر لیٹ گیا اور سرگٹ سلگایا، میرے کانوں میں کہیں سے اکارڈین کی دلنواز موسیقی اور تالیوں کی مدھم سی آواز آئی، سینئر میں ہمارے ساتھ سفر کرنے والے لڑکے اور لڑکیاں بھی آس پاس کہیں پکنک منا رہے تھے۔ میرے سامنے چھوٹے چھوٹے جزیروں کے گرد نیلے سمندر میں بادبانی کشتیاں جھول رہی تھیں، اگر ان بادبانوں کے گلے میں نقرئی گھنٹیاں باندھ دیں تو؟ خوشگوار خنک ہوا کا ایک جھونکا چیر کے درختوں کو چھوتا ہوا آیا اور میرے منتھنوں میں ہریا دل اور تازگی کی باس رچ گئی، میرے پوٹے سبز ٹھنڈک کے اس احساس کو برداشت نہ کر سکے اور خود بخود بند ہونے لگے۔ سفر کے اختتام پر جب سیاح پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے تو اس کے ذہن کے نیلگوں سمندر میں چند لمحے خوابوں کے جزیرے بن کر ابھرتے

ہیں، ایسے لمحے جو اس کی زندگی کا سرمایہ بن جاتے ہیں اور ان لمحوں کا جادو عمر بھر وقت کو زنجیر پہنائے رکھتا ہے، وادیِ نعلیم کی نیلی جھیلوں کی پہلی جھلک، ولایت میں کرمس کی شام کو پہلی بر فباری، جھیل جینوا کے کنارے گئی رات والٹر کا پہلا سبق، ماسکو کے سرخ چوک میں روسی لوگ دھنیں، کوہ آرات کا برف پوش لبادہ اور اب ڈھلتی دو پہر میں چڑ کے درختوں سے پرے نیلگوں بجیرہ مرمر میں بکھرے ہوئے جزیرے۔ مجھے نیند آ گئی۔ میری آنکھ کھلی تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ قصبے کے چوک سے پرے ساحل پر استنبول روانہ ہونے والا آخری سٹیمر متواتر بھونپو بجارہا تھا۔ میں نے جلدی سے برساتی سمیٹی اور ہم دونوں نیم تاریک پگڈنڈی پر تیزی سے نیچے اترنے لگے۔ ہمارے سٹیمر کے اندر داخل ہوتے ہی ملاحوں نے لکڑی کی سیرھی اٹھالی اور ہم اس سحر زدہ جزیرے سے ناطہ توڑ کر استنبول کی جانب روانہ ہو گئے۔ سٹیمر پر اب بے حد کم لوگ تھے۔ درمیانی منزل کے آرام دہ صوفے پر بیٹھے ہوئے میں نے گول کھڑکی سے جزیرے پر آخری نظر ڈالی ”شہزادوں کا جزیرہ“ میرے لیے ”خوابوں کا جزیرہ“ بن گیا تھا جو میرے ذہن کے نیلگوں سمندر میں ہمیشہ ابھرتا رہے گا۔ تھوڑی دیر میں دوران دھیرے میں استنبول کی روشنیاں چمکنے لگیں۔ ہمارا سٹیمر دھیرے دھیرے غلطہ پل پر سے گزرنے والی لاتعداد کاروں کے شور کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ یورپ کی لاتعداد روشنیاں باسفورس کے سمندر میں جھلجھل کر رہی تھیں۔

سٹیمر غلطہ پل کے پلیٹ فارم کے ساتھ لگا تو سات بج رہے تھے، ہم سیدھے ہوٹل پہنچے اپنا سامان سمیٹا اور ”والموش“ ٹیکسی میں بیٹھ کر سٹیشن پہنچ گئے جہاں کسٹم کے عملہ نے واجبی سی چیکنگ کے بعد ہمیں فارغ کر دیا۔

اورینٹ ایکسپریس

”اورینٹ مرمرہ ایکسپریس چلنے کے لیے تیار ہے“ لاؤڈ سپیکر میں سے اناؤنسر کی آواز گونجی ”ڈائریکٹ پیرس، لندن براستہ صوفیہ، بلغراد، تریسٹ، وینس، میلان، لوزان اور پیرس۔“ ہمارے سامنے مشہور زمانہ اورینٹ ایکسپریس کھڑی تھی، پلیٹ فارم تقریباً خالی پڑا تھا۔ ”انجن کی پشت میں لگے ہوئے ڈبے پیرس کے لیے ہیں، کہیں بھی بیٹھ جائے گا ڈی تقریباً خالی ہے“ بوڑھے گارڈ نے ہمارے ٹکٹ چیک کرتے ہوئے بتایا سامنے والے ڈبے کی کھڑکی میں سے دو موٹی جرمز لڑکیاں جھانک رہی تھیں۔

”یہیں بیٹھ جاتے ہیں“ علی کے چہرے پر رونق آ گئی۔

”بیٹے یہ ڈبے تو میونخ جائیں گے۔ میں نے کہا نا انجن کے پیچھے والے ڈبے ہی پیرس کے لیے ہیں“ گارڈ نے علی کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔

ہم اندر داخل ہوئے۔ گاڑی میں بین الاقوامی معیار کی سہولتیں میسر تھیں۔ ڈبے نہایت صاف ستھرے اور آرام دہ، شیشے کی بڑی کھڑکی اور اس کے اوپر خوبصورت پردے، روشنی گل کیجیے تو ایک ننھی منی بیڈ لائٹ خود بخود جل اٹھے گی اور پھر جگمگاتے ہوئے سفید غسل خانے، ہم نے سامان کھول کر پورے ڈبے میں سجا دیا۔ اگلے دو روز کے لیے یہ ہمارا گھر تھا، میں نے اپنا سونے کا تھیلیا نشست پر بچھایا اور گاڑی کے لمبے راستے کی کھڑکی میں آ کھڑا ہوا۔

پورے ساڑھے سات بجے اورینٹ ایکسپریس خاموشی سے ریگننے لگی۔ سٹیشن سے نکلتے ہی شہر کی روشنیاں اور باسفورس کا سمندر نظروں کے سامنے آ گئے، مجھے صدیوں پہلے کا وہ دن یاد آ

خنجر اور گولی کی زبان سے بھی طے کر لیے جاتے۔ آگاتھا کرسٹی نے اپنے مشہور ترین ناول ”اور نیٹ ایک پیرس میں قتل“ کا مرکزی خیال اسی نیلی ٹرین سے لیا تھا۔ ایک شخص کا قتل جس میں ٹرین کے سارے مسافر ملوث تھے، شاید اس کی بری شہرت کی وجہ سے ہی زیادہ لوگ اس پر سفر کرنا پسند نہیں کرتے، پورے ڈبے میں ہمارے سوا اور کوئی مسافر نہ تھا۔ میں نے ایک جھرجھری سی لی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پچھلے پہر کی مدھم چاندنی میں ہمارا کمرہ بھی بے حد پراسرار لگ رہا تھا۔ سامنے کی نشست پر علی بڑے اطمینان سے سو رہا تھا، میں نے اٹھ کر دروازے کی چنجی چڑھادی اور کھڑکی کا پردہ نیچے کر کے واپس اپنے تھیلے میں گھس کر سو گیا۔

دوسری صبح آنکھ کھلی تو گاڑی کا تمام عملہ راتوں رات ٹرک سے بلغار میں بدل چکا تھا، باہر مطلع ابر آلود تھا اور ہلکی ہلکی بوند اباندی ہو رہی تھی، کھڑکی سے باہر ہرے بھرے کھیتوں، باغوں اور کالی زرخیز زمین کے ”اجتماعی فارموں“ کا ایک سلسلہ تاحد نظر پھیلا ہوا تھا۔ گاڑی ایک قصباتی سٹیشن پر کی تو چند بھاری بھرکم دیہاتی عورتیں سبزیوں کی ٹوکریاں اٹھائے ہمارے ڈبے میں گھس آئیں۔ گاڑی دوبارہ چلی تو میں نے علی سے ناشتے کے بارے میں پوچھا جواب ایک کونے میں دبکا بیٹھا تھا۔ کہنے لگا ”ابھی رہنے دو ورنہ صلح کرنی پڑے گی اور اگر انہوں نے شکریہ کہہ کر قبول کر لی تو؟“ دیہاتی عورتوں کے بھاری تن و توش کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے مجھے علی کی دلیل خاصی وزنی معلوم ہوئی۔

بلغاریہ کا دارالخلافہ صوفیہ آیا تو وہ سب اتر گئیں۔ علی نے اطمینان کا سانس لیا اور ہم نے جلدی سے بریک فاسٹ اور لنچ ملا کر بقول صاحب لوگوں کے ”برنج“ کر لیا، گاڑی صوفیہ کے سادہ مگر صاف ستھرے سٹیشن پر ایک گھنٹہ تک کھڑی رہی۔ اس اثنا میں صفائی کے عملہ نے ہمیں نکال باہر کیا اور کمرے کی ہر چیز کو جھانپوٹ کر دیا، اس دوران علی سٹیشن پر ٹہلتا رہا اور چائے پیچنے والی چند بلغار لڑکیوں کے ساتھ گپ لگاتا رہا۔ واپس آیا تو میں نے ہنس کر پوچھا ”کہو کچھ ہوا؟“

منہ بنا کر کہنے لگا: ”ہونا کیا تھا مجھے تو ان کی انگریزی کا ایک لفظ سمجھ میں نہیں آتا۔“ میں نے اسے بتایا کہ بھائی انگریزی صرف ولایت میں بولی جاتی ہے یہ لڑکیاں بلغارین میں بات کر رہی ہوں گی۔

گیا جب حیدر پاشا سٹیشن سے نکلتے ہی میناروں اور گنبدوں کے ایک جنگل نے مجھے آغوش میں لے لیا تھا، میرے ذہن میں استنبول کی پہلی جھلک کے تاثرات ابھرے جو جوانی کے فریبوں اور پہلی محبت کی کمنائی کمک سے زیادہ حسین اور ہیجان خیز تھے لیکن اب میں چاہے کتنی بار ہی اس شہر میں کیوں نہ آؤں میرے احساسات میں وہ گرمی اور وارفتگی نہ ہوگی۔ جس طرح ادبی ذوق رکھنے والے ایک شخص سے پوچھا گیا کہ اگر وہ ایک مرتبہ پھر اس دنیا میں پیدا ہو تو نئی زندگی میں وہ کون سا ایسا تجربہ ہوگا جس کا اسے انتظار رہے گا، اس نے جواب دیا، ”تالستانی کا ناول“ جنگ اور امن ”پہلی مرتبہ پڑھنے کا شاندار تجربہ“ اسی طرح اگر مجھے بھی ایک نئی زندگی مل جائے تو میں استنبول کی پہلی جھلک کے احساسات سے روشناس ہونے کا بے چینی سے انتظار کروں گا، افسانوں اور کہانیوں کا شہر باز نطن، قسطنطنیہ، استنبول، بچپن میں املا لکھتے وقت قسطنطنیہ، ہمیشہ ہی غلط لکھا جاتا۔

گاڑی نے رفتار تیز کر دی اور ایک لمبا موڑ کاٹا، شہر کی آخری روشنیاں نظر سے اوجھل ہو گئیں۔

تھوڑی دیر میں ترک کشم آفیسر آیا اور پاسپورٹوں پر مہر لگا کر چلا گیا، اور نیٹ ایک پیرس رات کی تاریکی میں بلغاریہ کی جانب بھاگی جا رہی تھی، میں نے اپنے سونے کے تھیلے کی زپ کھولی اور نرم پروں کی اس سفری رضائی میں گھس کر سو گیا۔ رات کے پچھلے پہر گاڑی ترک، بلغار سرحد پر کی تو ایک بلغار کشم آفیسر نے ڈبے کا دروازہ کھول کر بتی جلادی ”پاسپورٹ پلزز“ میں نے وہیں لیٹے لیٹے کھونٹی پر ٹنگے کوٹ کی طرف اشارہ کر دیا جس کی اندرونی جیب میں ہم دونوں کے پاسپورٹ رکھے تھے۔ کشم آفیسر نے پاسپورٹ نکال کر ویزے کے صفحات پر مہر ثبت کر دی۔

”آپ کے آرام میں نخل ہونے کی معافی چاہتا ہوں“ اس نے اکڑوں کھڑے ہو کر سیلوٹ کیا اور روشنی گل کرنے کے بعد دروازہ بند کر دیا۔

میں نے دوبارہ سونے کی کوشش کی مگر نیند کوسوں دور تھی۔ شیشے کی کھڑکی سے باہر بلغاریہ کے وسیع میدانوں میں چاندنی چھٹکی ہوئی تھی ”میں نیلی ٹرین میں سفر کر رہا ہوں“ میں نے کروٹ بدلتے ہوئے سوچا، نیلی ٹرین جو کسی زمانے میں بلقان کی تاریخ میں رومان اور اسرار کی ایک علامت بن گئی تھی، اس گاڑی میں بلقان کے شاہی خاندانوں کے فرد، سفیر، ایٹلی اور طرح طرح کے مشتبہ حضرات سفر کرتے اور دوران سفر سیاسی جھگڑے، سفارتی بات چیت سے بڑھ کر

پچھلے پہر تین بجے کے قریب بلغاریہ اور یوگوسلاویہ کا سرحدی قصبہ دمتری گراڈ آ گیا، یوگوسلاو کسٹم آفیسر دیر تک ہمارے پاسپورٹوں کی ورق گردانی کرتا رہا۔ ”آپ میرے ساتھ کسٹم ہاؤس میں تشریف لائیے“ اس نے پاسپورٹ وردی کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

میں کسٹم آفیسر کے ساتھ گاڑی سے نیچے اترا تو باہر ابھی تک ہلکی ہلکی بوند باندی جاری تھی۔ کسٹم ہاؤس سٹیشن کے آخری سرے پر تھا اور وہاں پہنچنے تک میرا سفید کرتہ پا جامہ بالکل بھیگ چکا تھا، برآمدے میں ایک موٹا یوگوسلاو جو شاید کسٹم ہاؤس کا انچارج تھا بغیر فریم کے شیشوں والی عینک لگائے رجسٹروں پر جھکا خانہ پڑی میں مصروف تھا، آفیسر نے سیلوٹ کیا اور ہمارے پاسپورٹ اس کے سامنے رکھ کر اپنی زبان میں کچھ کہا، موٹے یوگوسلاو نے رجسٹر بند کر کے ہمارے پاسپورٹوں کا سرسری معائنہ کیا۔

”آپ کے پاسپورٹ یوگوسلاویہ کے لیے کارآمد نہیں ہیں“ اس نے شستہ انگریزی میں کہا، دفعتاً مجھے خیال آیا کہ پاسپورٹوں پر ہم نے یوگوسلاویہ کی تصدیق تہران کے پاکستانی سفارتخانے سے کروائی تھی جو صرف پندرہ یوم کے لیے کارآمد تھی، یعنی یہ میعاد پانچ روز قبل استنبول میں ہی ختم ہو چکی تھی۔

”آپ کو یہاں سے واپس استنبول جانا پڑے گا۔ اپنا سامان اتار لیجیے“ اس نے دونوں پاسپورٹ میری طرف بڑھادیئے اور رجسٹر کھول کر پھر لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ یہ صورت حال میرے لیے نہایت تشویشناک تھی، میں نے پاسپورٹ کھول کر ویزے کا صفحہ دیکھا تو اس پر ٹھیک تین روز پہلے کی مہر تھی، میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ”دیکھیے جناب“ میں نے ویزا کی مہر پر انگلی جما کر موٹے یوگوسلاو کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ”استنبول میں آپ کے سفارت خانے نے ہمیں صرف تین روز قبل ویزا دیا تھا حالانکہ یہ پاسپورٹ آج سے پانچ روز پہلے ہی یوگوسلاویہ کے لیے کارآمد نہ رہے تھے، اب اگر ہم سے غلطی ہوئی تو قصور وار آپ کا سفارت خانہ بھی ٹھہرتا ہے“ موٹے نے اپنی عینک کو انگلی سے ٹھوکا دے کر ناک پر درست کیا اور ویزے کی مہر کو بغور دیکھنے لگا۔

”ہوں“ اس نے سر ہلا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بالکل ہوں۔“ میں نے بھی اسی طرح سر ہلایا۔

کسٹم ہاؤس سے خلاصی کروا کے جب میں باہر پلیٹ فارم پر نکلا تو گاڑی کے اکثر

مسافر کھڑکیوں سے سر نکالے مجھے قہر آلود نظروں سے گھور رہے تھے..... میری وجہ سے اورینٹ ایکسپریس تقریباً پندرہ منٹ لیٹ ہو گئی تھی میں نہایت اطمینان سے بارش میں بھیگتا اپنے ڈبے کی طرف چلنے لگا اور ساتھ ساتھ کھڑکیوں میں سے جھانکتے مسافروں کو خوشدلی سے ہاتھ بھی ہلاتا رہا، سب منہ بنائے کھڑے رہے۔ کمرے کے اندر داخل ہوا تو علی نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ ”اتنی دیر کیا کرتے رہے ہو؟ مسافروں نے میرا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ کہتے تھے تمہارا ساقی شکل ہی سے نامی گرامی سمگلر لگتا ہے، چرس لائے ہو یا افیم؟“ میں نے پوری تفصیل بتائی کہ کس طرح ہم استنبول واپس جاتے جاتے بچے ہیں تو اس کا غصہ کا فور ہو گیا بلکہ شکرانے کے دوغل بھی مان لیے۔ جب تک گاڑی ”دمتری گراڈ“ کے پلیٹ فارم سے باہر نہ نکلی ہم دم سادھے بیٹھے رہے مبادا اس موٹے کسٹم آفیسر کو کوئی اور نکتہ یاد نہ آ جائے، گاڑی یوگوسلاویہ میں داخل ہوئی تو پورا عملہ بھی بدل چکا تھا۔

یوگوسلاویہ بھی بلغاریہ کی طرح سرسبز و شاداب تھا۔ حدنگاہ تک ہریالی اور پیچھے پہاڑ، پھلدار درختوں اور سرو کی قطاریں، جنگل، کھیت اور دریا، گوریلا جنگ کے لیے نہایت موزوں علاقہ، دوسری جنگ عظیم میں نیٹو اور اس کے ساتھیوں نے انہی قدرتی مزاحمتوں کا فائدہ اٹھا کر قابض فوجوں کو ناکوں چنے چبوائے۔

رات کے نو بجے یوگوسلاویہ کا دارالخلافہ ”بیوگراڈ“ یا بلغراد آیا، شہر کی روشنیوں کے درمیان ایک ہل کھاتا ہوا دریا دکھائی دیا۔ نقشہ اٹھا کر دریا کے نام کا تعین کیا تو معلوم ہوا کہ ”نیل ٹرین“ ابھی ابھی ”نیلے ڈینیوب“ پر سے گزری ہے۔

گاڑی بلغراد سے چلی تو ہم سونے کی تیاری کرنے لگے، اورینٹ ایکسپریس میں یہ ہماری دوسری شب تھی۔

دوسری صبح آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ ”سیرانا“ کے راستے اطالیہ میں داخل ہو چکے ہیں اور گاڑی ”ولا آپ سینا“ کے سٹیشن پر کھڑی ہے۔ باہر بادل چھٹ چکے تھے اور خوشگوار دھوپ چمک رہی تھی، اطالوی کسٹم آفیسر نے پاسپورٹوں پر مہر لگائی اور مسکرا کر پوچھا ”سینور، الکوئل، سگرت؟“ ”سگرت ہی۔“ الکوئل ”نو“ میں نے جواب دیا۔

”ولا آپ سینا“ سے گاڑی نکلی تو ایڈری آنک کا نیلا اور خوشگوار سمندر ساتھ ہولیا۔

”تریست“ آیا تو اکثر مسافر اتر گئے یہ اورینٹ ایکسپریس کا پہلا مغربی یورپی سٹاپ ہے، صبح کی دھوپ میں پورا شہر چمک رہا تھا، تریست جانے کے لیے گاڑی مرکزی پٹری سے ہٹ کر ایک علیحدہ اور چھوٹی پٹری پر ہو جاتی ہے چنانچہ مسافر اتار کر گاڑی نے بیک گیر لگایا اور تھوڑی دیر میں دوبارہ مرکزی پٹری پر آ گئی۔ ایک مرتبہ پھر گاڑی کا پورا عملہ تبدیل ہو چکا تھا، بھورے بالوں والے یوگوسلاو کی بجائے اب پستہ قد اطالوی ٹکٹ چیک کر رہے تھے میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو سمندر اب ایک وسیع دلدل کی صورت میں گاڑی کے دونوں طرف بڑے اطمینان سے پھیلا ہوا تھا۔ کنڈکٹر ٹکٹ دیکھنے آیا تو میں نے اگلے سٹاپ کے بارے میں دریافت کیا۔

”دی نیزیسیٹور“ اس نے بائیں ہاتھ کی انگلیوں کو چوم کر کہا۔

میں نے کپڑے بدلے اور اپنا سامان باندھنا شروع کر دیا۔ علی اسی گاڑی پر سیدھا لنڈن جا رہا تھا مگر میں چند روز کے لیے ونیس میں ٹھہرنا چاہتا تھا۔ سٹیشن آیا تو میں نے اپنا سامان ڈبے سے نکال کر پلیٹ فارم پر رکھ دیا۔ علی خاموشی سے کھڑا سگرت کے کش لگا رہا تھا۔ ہم دونوں کے لیے جدائی کا یہ لمحہ بے حد کٹھن ثابت ہو رہا تھا۔ لاہور سے یہاں تک کی رفاقت ختم ہو رہی تھی ”اچھا دوست اب انشاء اللہ واپسی پروٹن میں ملاقات ہوگی“ میں نے افسردگی سے علی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

وہ میرے ہاتھ کو نظر انداز کر کے مجھ سے لپٹ گیا ”میں تو کہتا ہوں میرے ساتھ لنڈن چلو۔ اب اکیلے کہاں مارے مارے پھر دو گے“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور پھر مسکرا دیا۔

”خدا حافظ“ میں نے اپنا سفری تھیلا اٹھاتے ہوئے کہا ”چھ ماہ بعد لاہور کی مال روڈ پر ملاقات ہوگی۔“

”انشاء اللہ“ اس نے ایک سگرت سلگا کر میرے منہ سے لگا دیا ”ترک تمباکو خوشبو اور مزے کے لحاظ سے دنیا بھر میں بہترین ہے۔“

باہر جانے کے پھانک سے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو علی ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔ میں نے سٹیشن کے ایک کونے میں واقع سیاحوں کے لیے دفتر معلومات سے کیمپنگ کی جگہ کا پتہ دریافت کیا تو کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی خوش روا اطالوی حسینہ نے شہر کا ایک تفصیلی نقشہ نکالا اور ایک جگہ سرخ پنسل سے نشان لگا کر مجھے تھما دیا۔ ”لیڈو کیمپنگ میں چلے جائیے۔“

ونیس میں موت بھی خوبصورت ہے

سٹیشن کی عمارت سے باہر نکلا تو پانی میں گرتے گرتے بچا، ٹریفک سے بھری پری تارکول کی سڑک کے بجائے سامنے ونیس کی سب سے بڑی نہر ”گرینڈ کنال“ رواں تھی۔ جس جگہ بسوں اور ٹیکسیوں کا ڈاڈا ہونا چاہئے تھا وہاں سینئر اور نازک گنڈولے پانی میں جھول رہے تھے۔ ایک سینئر مسافروں سے پُر ہو جاتا تو بھونپو بجا کر ”گرینڈ کنال“ کے پانیوں میں تیرنے لگتا اور اس کی جگہ دوسرا سینئر لے لیتا، میں نے ٹکٹوں کی کھڑکی کے اندر جھانکا۔

”مجھے لیڈو کیمپنگ جانا ہے ٹکٹ دے دیجیے۔“

گنجانے اطالوی نے میری طرف تین ٹکٹ بڑھا دیئے۔

”لیکن مجھے تو صرف ایک ٹکٹ درکار ہے۔ اونو“ میں نے انگلی نچا کر کہا۔

”ایک ٹکٹ تمہارے لیے، ایک سوٹ کیس کا اور ایک سامان کے تھیلے کا۔“ میرے احتجاج کا

جواب ملا۔

سینئر کے عرشے پر بیٹھا سیاح کھڑے تھے جو کیمروں میں نظر جمائے گرینڈ کنال کے دونوں طرف گزرنے والے محلات اور خوبصورت مکانوں کی تصویریں بنا رہے تھے۔ میں نچلے حصے میں چلا گیا۔

لیڈو کیمپنگ ”ایڈری آف ٹک“ سمندر کے کنارے درختوں کے ایک گھنے جھنڈ میں واقع تھی..... ابھی مئی کا آخر تھا اس لیے کیمپنگ میں وہ گہما گہمی نہ تھی جو جولائی اگست کے ٹورسٹ سیزن کا خاصہ ہوتی ہے۔

یورپ میں ہولٹوں کے ہوشربا کرائے میرے جیسے سیاح کے لیے سواہن روح بن جاتے ہیں، اگر سفر ایک دو ہفتوں کا ہو تو شاید جیب اجازت دے دے مگر طویل سفر کے لیے متبادل انتظام نہایت ضروری ہو جاتا ہے، اس مصیبت کا واحد حل کیمپنگ ہے، یورپ کے کونے کونے میں ہزاروں ”کیمپنگ سائٹس“ بکھری پڑی ہیں۔ خاص طور پر مشہور شہروں اور پر فضا مقامات پر تو ان کی بہتات ہے۔ اگر کیمپنگ درمیانے درجے کی بھی ہو تو وہاں صاف ستھرے غسل خانے اور کھانے پینے کی اشیاء کے لیے ایک دکان تو ضرور ہوتی ہے۔ اول درجے کی کیمپنگ میں نہانے کا تالاب، ریسٹورنٹ، سٹور اور دوسرے تمام لوازمات ملیں گے جو آپ کو اس سے کئی گنا زیادہ پیسے خرچ کر کے ایک اچھے ہوٹل میں دستیاب ہوتے ہیں۔ کیمپنگ میں داخل ہو کر دفتر میں اپنا نام پتہ درج کروائیے اور پھر مناسب جگہ تلاش کر کے اپنا چھوٹا سا گھر ایستادہ کر لیجیے اگر آپ کسی ”بین الاقوامی کیمپنگ کلب“ کے رکن ہیں تو جگہ ملنے میں آسانی رہتی ہے اور کرائے میں بھی تخفیف کر دی جاتی ہے، ماحول اتنا دوستانہ ہوتا ہے کہ کئی لوگ اپنی پوری چھٹیاں کیمپنگ کی جگہ میں ہی گزار دیتے ہیں اور شہر کا رخ تک نہیں کرتے، چند سال پیشتر میں فرنیفرٹ (جرمنی) کے سٹیشن پر اترا تو تلاش کے باوجود کہیں بھی رہائش کا بندوبست نہ ہو سکا، تمام رات بارش میں بھیگتا اور سردی سے ٹھٹھرتا رہا، دوسری صبح دکانیں کھلنے پر میں نے ایک خیمہ سونے کا تھیلا، ربڑ کا گدا اور کھانے پکانے کا سامان خرید لیا، وہ دن اور آج کا دن مجھے کہیں بھی غریب الوطنی کا احساس نہیں ہوا، جہاں کہیں شام ہوئی تو نزدیکی کیمپنگ کا رخ کیا یا وہیں کہیں مناسب جگہ تلاش کر کے اپنا خیمہ جما دیا..... لیڈ و کیمپنگ کے دفتر میں اپنا پاسپورٹ بطور ضمانت جمع کروا کے میں نے سمندر کے کنارے اپنا خیمہ نصب کر لیا۔ استنبول سے وینس تک کے طویل سفر نے مجھے تھکا دیا تھا اور میں اب دوبارہ شہر تک جانے کے موڈ میں نہیں تھا..... کیمپنگ کے ریسٹوران میں کھانا کھا کر ساحل کی طرف چلا گیا جہاں بیشار مرد اور عورتیں ریت پر اوٹھنے منہ لیٹے دھوپ سینک رہے تھے۔ نہانے میں کسی کو بھی دلچسپی نہ تھی، ہر ایک کی یہی کوشش تھی کہ کسی طرح جسم ”براؤن“ ہو جائے۔ دو خواتین ایک دوسرے کو ”ٹین لوشن“ ملنے میں مصروف تھیں، جس طرح ہمارے ہاں رنگ گورا کرنے کی کریمیں دھڑا دھڑکتی ہیں اسی طرح یورپ میں ”ٹین لوشن“ یعنی رنگ بھورا کرنے کی کریم کی بے حد مانگ ہوتی ہے۔ یورپ کے ٹھنڈے ملکوں یعنی سیکنڈے نیویا، جرمنی، ولایت وغیرہ میں ہلکی بھوری رنگت اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ حامل حال قریب

میں ہی ہسپانیہ یا اطالیہ کے حسین ساحلوں کی ریت چھان کر واپس لوٹا ہے اور یہ قابل فخر کارنامہ گنا جاتا ہے۔ فدوی پر چونکہ دھوپ سینکنے کا اثر افریقہ سے واپسی ظاہر کرتا ہے اس لیے ”دھوپ میں نہانے“ کا ارادہ ترک کر کے ساحل کے ساتھ ایک درخت کی چھاؤں میں لیٹ گیا، اسی رات کیمپنگ میں پارٹی ہوئی اور خوب دھما چوڑی مچی بلکہ ہم نے بھی مچائی۔

اگلی صبح تیار ہو کر کیمپنگ سے باہر نکلا تو دروازے پر شہر جانے والی بس تیار کھڑی تھی۔ کشادہ سڑک کے دونوں طرف بلند قامت درختوں کی قطاریں تھیں اور ان سے پرے خوبصورت باغات اور یورپ کے امیر ترین آدمیوں کی شاہانہ رہائش گاہیں۔ میں ”پلازا ڈیل سینما“ کے چوک میں اتر گیا جہاں ہر سال وینس کا مشہور فلمی میلہ منعقد ہوتا ہے۔ چوک کے ساتھ ہی میونسپل قمار خانے کی عمارت ہے جو باہر سے ہو بہو کلیڈ لگتی ہے۔ یورپ میں اکثر قمار خانے میونسپل کمیٹیوں کے تحت چلائے جاتے ہیں۔ اس طرح پبلک بھی خوش رہتی ہے اور کمیٹی والے ٹھٹھرائیں اور ریڑھی ٹیکس کی بدنامی مول لیے بغیر خاصی رقم اکٹھی کر لیتے ہیں، یہاں پر ادھر کا مال صرف ادھر کے اصول پر سختی سے عمل ہوتا ہے۔ ویسے شہر والوں کا کچھ نہیں بگڑتا عام طور پر غریب سیاح ہی مارے جاتے ہیں۔

میں ایک دفعہ مائٹی کارلو کے قمار خانے میں دس دس روپے کے پانچ ٹھپے جیب میں ڈال کر اس شان سے داخل ہوا تھا جیسے آج تو قمار خانے کے بینک کا دیوالیہ نکال کر ہی باہر نکلوں گا۔ روایت کی چند میزوں کا چکر لگانے پر معلوم ہوا کہ ہر کرسی پر یا تو کسی یونانی جہاں ران کمپنی کا مالک بیٹھا ہے اور یا پھر کوئی مہاراجہ جو بوریوں کے حساب سے سو سو روپے کی مالیت کے ٹھپے داؤ پر لگا رہے تھے۔ میں چپکے سے بار میں چلا گیا اور ایک اور نچ جو س پیدا دو ٹھپے یعنی بیس روپے، سگرٹ خریدے ایک ٹھپے، باہر نکلتے ہوئے دربان نے سلام کیا تو میں نے باقی دو ٹھپے اس کی نذر کر دیئے۔ اس نے جھک کر یوں دروازہ کھولا جیسے میں کسی ریاست کا ”کراؤن پرنس“ ہوں۔

وینس کا یہ حصہ جہاں پلازا ڈیل سینما اور قمار خانہ واقع ہے ”لیڈو“ کہلاتا ہے جس کی سب سے بڑی سڑک سانتا ماریا کے دونوں طرف فیشن ایبل ہوٹلوں اور قہوہ خانوں کی قطاریں ہیں، باقی شہر کے برعکس اس حصے میں کاروں اور بسوں کی آمد و رفت پر کوئی پابندی نہیں، سانتا ماریا کے سامنے گھاٹ پر ہر پانچ منٹ بعد ”موٹو سکاٹو“ یعنی موٹر بوٹ سان مارکو چوک کے لیے چلتی

ہے فاصلہ تقریباً ایک میل کے قریب ہوگا، انتظار گاہ کے ساتھ خود کار ٹکٹ کی مشینیں لگی تھیں۔ میں نے آدھ لیرے کا سکہ سوراخ میں ڈالا تو مشین کے نچلے حصے نے ٹکٹ یوں اگل دیا جیسے کوئی شرارتی بچہ بیل گم کو پھونک مار کر اپنے ہونٹوں پر پھیلا لے، لیڈ واور سان مارکو چوک کے درمیان بالکل باسفورس ایسی رونق تھی، تیز موٹر بوٹوں اور سیٹروں کے بیچ ست رفتار نازک گنڈولے بالکل ساکن لگ رہے تھے اور ان سے پرے وینس کا آبی شہر ایک دیو قامت گنڈولے کی مانند پانی پر جھول رہا تھا۔

کئی صدیاں پیشتر ونیتی قبیلے کے لوگ وحشی حملہ آوروں سے بچنے کے لیے پہاڑوں اور میدانوں کو چھوڑ کر چند بے آباد ساحلی جزیروں پر آباد ہو گئے، آہستہ آہستہ ان جگہاں کسانوں کی محنت نے ایک ایسے شہر کو جنم دیا جو اطالیہ کی طاقتور ترین ریاست بن گیا۔ اس کے باشندے تجارت کی خاطر دنیا کے کونے کونے میں پھیل گئے، مشرق کو جانے والی تمام اہم آبی شاہراہوں پر اہل وینس کا قبضہ تھا، مشرق سے کمائی ہوئی اور متعدد بار لوٹی ہوئی دولت نے نہروں کے کنارے سنگ مرمر کے محلات اور عالی شان گرجوں کی تعمیر میں مدد دی۔ دولت کے ساتھ فنون لطیفہ کو بھی فروغ حاصل ہوا، بیلینی اور ٹیان نے انہی نہروں کے کنارے شاہکار تخلیق کیے۔

ہماری موٹر بوٹ سان مارکو کے گھنٹہ گھر کے سامنے والے گھاٹ پر پہنچ کر رک گئی اور میں نیچے اتر کر ”ڈوبے محل“ کے برآمدے میں چلنے لگا، سامنے سینٹ مارک کا کلیسا تھا جس کے نام پر اس چوک کو پکارا جاتا ہے، وینس کے دو تاجروں نے سینٹ مارک کی لاش کو سکندریہ سے یہاں منتقل کیا اور پھر اس کی قبر کے لیے یہ شاندار کلیسا تعمیر کیا، کلیسا کے مشرقی طرز کے گنبد اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ اہل وینس قسطنطنیہ کے گرجوں کے گنبدوں سے بے حد متاثر تھے۔ تیرہویں صدی میں ایک قانون بنادیا گیا جس کے تحت شہر سے باہر جانے والے ہر تاجر کے لیے یہ لازمی قرار دیا گیا کہ وہ سفر سے واپسی پر کلیسا کے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ ساتھ لائے۔ اس قانون کا بہت فائدہ ہوا، کلیسا جو پہلے خالی پڑا تھا دنوں میں طرح طرح کے نوادرات سے پُر ہو گیا، گیلری میں گھوڑوں کے وہ چار مجسمے بھی نصب ہیں جو صلیبی جنگ کے دوران قسطنطنیہ سے لوٹ کر لائے گئے تھے۔

سان مارکو چوک کے گرد برآمدوں میں بنے ہوئے کئی قبوہ خانے بین الاقوامی شہرت

کے مالک ہیں، اکثر قبوہ خانوں کے اپنے آرکسٹرا ہیں جن کے موسیقار سر شام چوک میں کرسیاں بچھا کر کلاسیکی موسیقی کا الاپ شروع کر دیتے ہیں، یہاں خوب رونق تھی، گھنٹہ گھر اور کلیسا کے سامنے خوش پوش اطالوی نوجوانوں کے غول کے غول بے مقصد گھوم رہے تھے، سیاحوں کی ٹولیاں آتیں تو ان میں سے چند ایک اپنے لمبے بالوں پر ہاتھ پھیرتے، ٹائی کی گرہ ٹوٹتے کسی خوبصورت لڑکی کے پیچھے ہو جاتے، نتیجہ خاطر خواہ برآمدہ نہ ہونے پر کمال ڈھٹائی سے سیٹیاں بجاتے واپس آ کر اپنے غول میں شامل ہو جاتے۔ درمیانی عمر کے اطالوی بھی سیڑھیوں پر بیٹھ کر ہر آنے جانے والی سیاح عورت کو ہیٹ اٹھا اٹھا کر سلام کر رہے تھے، یورپ کے ہر بڑے چوک کی طرح یہاں بھی کبوتروں کی بھرمار تھی، جنہیں دیکھ دیکھ کر ہمیشہ مجھے اپنے محلے کی مسجد کے امام یاد آ جاتے جن کے پاس میں پڑھنے جایا کرتا تھا ہر جمعہ کی نماز کے بعد وہ غلیل لے کر شاہی قلعہ کی طرف چلے جاتے اور شام تک پانچ چھ کبوتر مار لاتے، ان کبوتروں سے ”ماء اللحم“ قسم کا کوئی کشتہ تیار کیا جاتا، مولوی صاحب اور ان کی غلیل وینس کے سان مارکو چوک میں پہنچ جائیں تو ماء اللحم کے کریٹ تیار کیے جاسکتے ہیں۔

چوک کے احاطے میں سے ایک تنگ دروازہ مریر یا سٹریٹ کو نکلتا ہے۔ اس تنگ اور بیل کھاتی ہوئی گلی کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی نفیس اور دیدہ زیب دکانیں اور سٹور ہیں جن کے شوکیسوں میں اطالیہ کے نرم چمڑے کی مصنوعات، چینی اور گلاس کے بنے ہوئے ظروف، سلک کی ٹائیاں اور دوسرے ملبوسات کمال خوبصورت سے سجے ہیں، دکانوں کے اشتہار اور بورڈ بھی صناعت کا بہترین نمونہ ہیں، زیادہ تر خریدار سیاح ہوتے ہیں جنہیں چیز کے ساتھ شوکیس کی سجاوٹ کی قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ تمام وینس میں میکا کی ذرائع آمد و رفت کے استعمال پر پابندی ہے۔ شہر کے مختلف حصوں میں آنے جانے کے لیے سیٹرسپیڈ بوٹ اور وینس کی پتلی اور لمبی کشتیاں گنڈولے استعمال ہوتے ہیں۔ مریر یا سٹریٹ کے عین درمیان میں چلتے ہوئے مجھے بے حد الجھن ہوئی، ہر آن یہی دھڑک لگا رہتا کہ ابھی پیچھے سے ٹھٹھہ بچابی میں ”بیچ موڑتوں“ کا نعرہ لگے گا اور ٹن ٹن کرتے لاہوری ٹانگے کا ”ہم“ میری کمر میں آگے گا۔ انسان اجنبی ماحول میں جا کر بھی اپنے فطرتی شعور کا تابع رہتا ہے، میں نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ میاں یہ وینس کی مریر یا سٹریٹ ہے گوالمندئی کا چوک نہیں جو گھبرائے پھرتے ہو۔ بہر حال تھوڑی دیر میں میں بھی اس

سست روہجوم کے دوسرے افراد کی طرح بڑے سکون سے گلی کے درمیان میں چلنے لگا اور گاہے گاہے نفیس شوکیسوں میں بھی تاک بھانک کرنے لگا۔ کچھ دیر اسی طرح بے مقصد گھومنے کے بعد اپنی ضرورت کے لیے ایک نہایت ہی خوبصورت سنور میں جا کر ٹوتھ پیسٹ اور بلیڈ خریدے تو سبز گرل اپنا کاؤنٹر چھوڑ کر باہر نکل آئی۔ اس کی کالی بھور آنکھیں میری ہراتی پوتین پر جمی ہوئی تھیں اور وہ ہاتھ اور کندھے ہلا ہلا کر مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی۔ اس کی شدہ اطالوی میری سمجھ سے باہر تھی، جب بھی وہ فقرے کے اختتام پر سانس لینے کے لیے رکتی تو میں کندھے سیکڑ کر مسکرا دیتا "میرے پلے کچھ نہیں پڑ رہا۔"

تھوڑی دیر میں سنور کی آدھی سبز گرل اپنا کام چھوڑ کر ہمارے گرد جمع ہو چکی تھیں۔ ان میں سے ایک صاحبہ نے جنہیں انگریزی میں شدہ بدھ تھی مترجم کے فرائض سنبھال لیے اور مجھ سے کہنے لگیں کہ اس لڑکی کو تھرا کوٹ بے حد پسند ہے کیا تم اسے بچنا پسند کرو گے؟ میری طرف سے معذوری کا اظہار ہوا تو ادھر سے فرمائش ہوئی کہ میں ذرا پہن کے دیکھ لوں، میں نے پوتین اتار کر لڑکی کو پہنا دی، وہ بالکل گڑیا لگ رہی تھی، کاؤنٹر پر لگے ہوئے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ اپنے آپ کو مختلف زاویوں سے جانچنے لگی، وہ بالکل چھوٹے بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔ اس کے کاؤنٹر کے آگے بے شمار گاہک ہاتھوں میں اپنی ضرورت کی اشیاء تھامے اس کی واپسی کے منتظر تھے۔ ایک گاہک نے جو شاید جلدی میں تھا تنگ آ کر اسے ہاتھ کے اشارے سے واپس کاؤنٹر پر آنے کو کہا۔

"مومنٹو" گڑیا نے پلٹ کر بڑے غصے سے کہا اور ایک بار پھر اپنے آپ کو آئینے میں دیکھ کر بڑے اطمینان سے پوتین اتار کر مجھے واپس کر دی "گراسیا سینور" اس نے اپنا خوبصورت گدگد ہاتھ آگے کر دیا۔ میں نے ہاتھ ملایا اور جلدی سے باہر آ گیا۔ پوتین میں قراقلی کھال کی ہلکی بو کے ساتھ گڑیا کے جسم کی بھینی بھینی مہک بھی شامل ہو چکی تھی۔

پوری صبح وینس کی گلیوں اور بازاروں میں گھومنے کے بعد میں ایک مرتبہ پھر سان مارکو چوک میں آ گیا جہاں اب دوپہر ہونے کی وجہ سے بہت کم لوگ رہ گئے تھے، یہ اطالویوں کے قیلولہ کا وقت تھا۔ دوپہر کے کھانے کے لیے میں "لا اسٹبلو" قہوہ خانے کے باہر برآمدے میں بیٹھی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور ویٹر کو مشہور اطالوی کھانے "قیوے اوسویوں" کا آرڈر دے دیا۔ قہوہ

خانے کے اندر شاید اور لوگ بھی ہوں مگر برآمدے میں لگی اکثر میزیں خالی پڑی تھیں سوائے ایک کے جس پر ایک ادھیڑ عمر اطالوی سرخ شراب کا گلاس سامنے رکھے اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔ میں نے جیب سے یورپ کا نقشہ نکالا اور اپنے آئندہ سفر کا راستہ طے کرنے لگا۔ وینس سے یورپی ممالک کے لیے تین بڑے راستے نکلتے تھے، پہلا مارسیلز فرانس کے راستے، ہسپانیہ، دوسرا پیرس سے گزر کر ولایت تک اور تیسرا سوئٹزرلینڈ، جرمنی، ڈنمارک اور سویڈن کے راستے ناروے تک جو شمالی یورپ کے آخری کونے پر واقع تھا۔ ان راستوں میں سے میں نے آخر الذکر کا انتخاب کیا۔ ولایت اور ہسپانیہ بعد میں دیکھا جائے گا، میں نقشے پر سرخ لکیریں کھینچنے میں مگن تھا کہ ساتھ والی میز پر بیٹھے ہوئے ایک دراز قد بوڑھے نے مجھ سے مخاطب ہو کر کچھ کہا۔ اس کے ہمراہ درمیانی عمر کی ایک سنجیدہ خاتون اور سنہری بالوں والی ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔ غالباً وہ مجھ سے اطالوی میں گفتگو کر رہا تھا۔

"معاف کیجیے گا میں اطالوی زبان نہیں جانتا" میں نے خوشدلی سے انگریزی میں جواب دیا۔

"بہت خوب! میں تمہیں اطالوی سمجھ رہا تھا" بوڑھے نے ایک زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "دراصل میں تم سے ویٹر کے بارے میں دریافت کرنا چاہتا تھا۔ جانے کہاں چلا گیا ہے" مجھے بھی احساس ہوا کہ وہ "قیوے اوسویاں" بھی ابھی تک نہیں آئے۔

"میں قہوہ خانے کے اندر جا کر دریافت کرتا ہوں" میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا، "کہیں قبولہ کرنے نہ چلا گیا ہو۔"

"شکریہ، شکریہ" بوڑھے نے سر ہلا کر کہا۔

میں نے اندر جا کر مالک سے بات کی تو وہ کہنے لگا پچھلے پہر اکثر لوگ صرف سستانے کے لیے برآمدے کی کرسیوں پر آ بیٹھتے ہیں اس لیے ویٹر ان کے آرام میں مغل نہیں ہوتے۔

"آپ باہر تشریف رکھتے ہیں آرڈر لینے کے لیے خود حاضر ہوتا ہوں" مالک نے جھک کر کہا۔ واپس باہر آیا تو بوڑھے نے مجھے اپنی میز پر بیٹھنے کی دعوت دی جو میں نے قبول کر لی اور پھر اس نے اپنا تعارف کروایا "میرا نام فراسٹ ہے جان فراسٹ، اور یہ ہیں مسز فراسٹ" سنجیدہ خاتون نے مسکرا کر اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دی "اور یہ ہے میری لڑکی ربیکا۔ ہارورڈ میں

طالب علم ہے“ میں نے ربیکا کی طرف دیکھا۔ وہ ہماری گفتگو سے بے نیاز ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھ سان مار کو چوک کے کبوتروں کو دیکھنے میں مگن تھی۔
”ہیلو“ میں نے خوش اخلاقی سے کہا۔

”ہائے“ اس نے بے دلی سے ماتھے پر پڑی ہوئی سنہری لٹ کو ہاتھ سے ایک طرف کرتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے اپنا تعارف کروایا تو دونوں میاں بیوی نے میرے سفر کے بارے میں بے حد دلچسپی کا اظہار کیا اور لاتعداد سوال پوچھ ڈالے۔ اکیلے سفر کرتے اکتانہیں جاتے؟ وینس میں کتنے روز ٹھہرو گے؟ امریکہ کیوں نہیں جاتے؟ اتنی دیر میں ویٹر کھانا لے آیا۔ اطالوی سوایاں شیطان کی آنت کی طرح لمبی تھیں اور کسی طرح کانٹے اور چھری کی زد میں نہ آ رہی تھیں۔ میں نے ربیکا کی جانب دیکھا وہ بڑی بے دلی سے سلا کا ایک پتا کانٹے پر اٹکائے منہ بسورے بیٹھی تھی اس کی نظریں اب بھی کبوتروں کا پیچھا کر رہی تھیں۔

”کاش ہمارے پاس بھی اتنا وقت ہوتا کہ ہم تمہاری طرح یورپ کی سیاحت کر سکتے“ خاتون کے لہجے میں تاسف تھا ”ہمارے سفری ایجنٹ نے یہ نوٹر ترتیب دیا ہے، دس روز میں پانچ یورپی دارالحکومتوں اور چھٹا وینس۔ آج صبح ہم پیرس میں تھے اور کل روم کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ ربیکا تو اس سفر کے ہر لمحے سے لطف اندوز ہو رہی ہے۔ کیوں ڈارلنگ“ اس نے پیار سے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں مہی“ لڑکی نے کبوتروں سے نظریں ہٹائے بغیر تیزی سے جواب دیا، کافی کے بعد بل آیا تو بوڑھے نے میرے انکار پر بھی زبردستی میرے حصے کی رقم بھی ادا کر دی۔

”تم برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟“ ہم میز سے اٹھنے لگے تو خاتون نے بڑی ملائمت سے پوچھا۔

”یہ تو بات پر منحصر ہے“ میں نے ہنس کر جواب دیا ”بہر حال فرمائیے“
”اگر تم آج شام فارغ ہو تو.....“ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا ”تو پھر تم دونوں اکٹھے

شہر کی سیر کے لیے کیوں نہیں چلے جاتے؟“ میرا مطلب ہے تم اور ربیکا“
”مہی“ لڑکی کے لہجے میں درستی تھی۔

”ربیکا میں نے غلط کہا تھا کہ تم اس سفر کے ہر لمحے سے لطف اندوز ہوتی رہی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ پورے سفر کے دوران تم ایک لمحے کے لیے بھی نہیں مسکرائیں..... آج شام مستنصر کے ساتھ وینس کا خوبصورت شہر دیکھ آؤ تو طبیعت بہل جائے گی۔ کیوں مستنصر؟“ اس نے پرامید نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اب جو صورت حال پیدا ہوئی وہ میرے لیے قطعی طور پر خوشگوار نہ تھی۔ خاتون اور اس کے خاوند کے شریفانہ برتاؤ کے مد نظر میں انکار بھی نہ کر سکتا تھا۔ اُدھر وہ محترمہ منہ پھلائے بڑی لاپرواہی سے میز سے ڈبل روٹی کے بچے کھچے کھڑے چن چن کر کبوتروں کو ڈال رہی تھیں۔

”مجھے تو شاید کوئی اعتراض نہ ہو“ میں نے قدرے سنجیدہ ہو کر کہا ”مگر میرا خیال ہے کہ آپ کی بیٹی کو اس پروگرام سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔“

”ربیکا پلیز“ بوڑھے نے اس گفتگو کے دوران پہلی مرتبہ لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا۔
”چلے جیسے آپ کی مرضی۔ میں شام سات بجے اسی قہوہ خانے میں پہنچ جاؤں گی۔ ٹھیک ہے نا؟“ اس نے اکتاہٹ سے مجھے پوچھا۔

میں نے بیوقوفوں کی طرح اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر انہیں خدا حافظ کہہ کر واپس کیمپنگ میں آ گیا۔ وینس کی دوپہر قدرے گرم تھی، میں نے اپنا جامہ غسل تن کیا اور اپنے خیمے کے سامنے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ سمندر کا نمکین پانی بے حد خوشگوار اور فرحت بخش تھا۔ ٹھوڑی دیر نہانے کے بعد میں اپنے خیمے میں آ کر سو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو باہر شام ہو رہی تھی اور پورے سات بج چکے تھے ”اول تو وہ آئے گی ہی نہیں“ میں نے خیمے میں لیٹے لیٹے سوچا ”بالفرض محال اگر آ بھی گئی تو ایک اکتائی ہوئی منہ بسورتی لڑکی کے ساتھ شام گزارنا کچھ ایسا خوش آئند خیال نہیں“ بہر حال میں وینس کی شام تو ہر صورت دیکھنا چاہتا تھا اس لیے کیمپنگ کے ”استری روم“ میں اپنے بھورے کارڈرائے کے کوٹ کو لاہور سے وینس تک کی ٹکٹوں سے پاک کیا۔ سوٹ کے ساتھ سفید رنگ کا ہائی نیک سویٹر پہنا اور لیڈو کے گھاٹ سے موٹو سکا فو پر بیٹھ کر سان مار کو چوک میں اتر گیا۔ چوک میں اب پھر خوب رونق تھی۔ اکثریت سیاحوں کی تھی جو مختلف قہوہ خانوں کے برآمدوں میں بجنے والی موسیقی سے

لطف اندوز ہو رہے تھے۔ صبح والے نکتے اطالوی نوجوان اب بھی ادھر ادھر گھوم رہے تھے اور سیاح لڑکیوں پر آوازے کس رہے تھے۔ پورا چوک بجلی کے بڑے ققموں سے روشن کیا گیا تھا، خاص طور پر ڈوبے پیل اور کیسا بے حد بھلے لگ رہے تھے۔ میں لوگوں کی بھیڑ سے بچتا تیز قدم اٹھاتا لا اسٹبلو قبوہ خانے تک پہنچا تو برآمدے میں رکھی تمام میزیں سیاہوں سے پڑھیں۔ یہاں بھی ایک آرکسٹرا پورے زور شور سے ”زور بادی گریک“ کی دھن بجا رہا تھا۔ میں نے ایک اچھٹی ہوئی نظر میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں پر ڈالی لیکن کہیں بھی سنہری بال نظر نہ آئے۔ ربیکا وہاں نہیں تھی۔ میرے ذہن سے ایک بوجھ اتر گیا کم از کم میں نے تو اپنا فرض پورا کیا اب وہ خاتون جانیں اور ان کی چپیتی لڑکی، میں واپس جانے کے لیے پیچھے مڑا تو وہ سامنے کھڑی تھی۔

”تم پورے پینتالیس منٹ دیر سے آئے ہو۔“

موسیقی کا شور دم ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے پورا سامان مار کو چوک خالی ہو چکا ہے اور اس کے بچے صرف ربیکا کھڑی مسکرا رہی ہے۔ سنہری بالوں سے ملتا ہوا پھولدار لباس اور اس کے اوپر ہلکا زرد کوٹ پہنے وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔

”دیر سے آنے کی معذرت بھی نہیں کر سکتے؟“ اس نے میری طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”اوہ بالکل“ میں نے قدرے گھبرا کر اس کے بیٹھنے کے لیے ایک خالی کرسی آگے کر دی۔

”دراصل“ اس نے اپنا کوٹ اتارتے ہوئے کہا ”تم صرف مئی کی وجہ سے مجھے ملنے آ گئے ہو؟“

”تم بھی تو اپنی مرضی سے نہیں آئیں“ میں نے اس کا کوٹ لے کر پاس کھڑے ویٹر کو تھما دیا۔

”یہ بات تو نہیں“ وہ کرسی پر بیٹھ کر ماتھے پر پڑی سنہری لٹ کو تھیلی سے سمیٹتے ہوئے بولی ”میری مئی بہت سویٹ ہیں ہم سفر کے دوران جہاں بھی جاتے ہیں ان کی بھرپور کوشش ہوتی ہے کہ میں اکتانہ جاؤں اور خوب خوش رہوں لیکن اس کوشش میں وہ کئی مرتبہ بہت آگے نکل جاتی ہیں جیسا کہ آج دوپہر ہوا۔ تم نے ان کی باتوں سے جانے کیا تاثر لیا ہوگا؟“

”فرض کرو کہ مئی ڈیڑھ گھنٹہ کا اس ملاقات کے طے کرنے میں کوئی ہاتھ نہ ہوتا۔ کیا پھر بھی تم مجھ سے ملنا پسند کرتیں؟“

”کیا میں نے پورے پینتالیس منٹ یہاں تمہارا انتظار نہیں کیا۔“ اس نے اپنے لمبے ناخنوں سے سفید میز کے رنگ کو کھرچتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں ہنستی ہوئی شرارت تھی۔

”بات ہوئی نا“ میں نے ویٹر سے جواب تک بڑے تحمل کے ساتھ وہیں کھڑا ہمارے آرڈر کا انتظار کر رہا تھا ربیکا کا کوٹ واپس لے کر اپنے کندھے پر ڈالا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا ”کسی ایسی جگہ چل کر بیٹھا جائے جہاں سکون ہو۔ یہاں تو لوگوں کے شور اور تیز موسیقی کی وجہ سے بات کرنی بھی مشکل ہو رہی ہے۔“

”بالکل درست“ ربیکا نے میری تجویز کو پسند کرتے ہوئے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ویٹر نے بڑے ادب سے کرسی پیچھے کھینچ لی۔ میں نے پانچ سو لیرے کا ایک نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

”گراسیاسینور“ وہ کمر تک جھک گیا۔

ہم ہجوم میں سے گزر کر کیسا کی سیڑھیوں کے پاس پہنچے تو وہاں بیٹھے نوجوان اطالویوں میں سے ایک نے میری طرف رشک بھری نگاہوں سے دیکھا اور منہ میں انگلیاں گھسیڑ کر بڑے زور سے سیٹی بجا دی۔ ربیکا نے اسے قہر آلود نظروں سے گھورا اور میرے قریب آ کر میرا بازو تھام لیا۔ ہم چوک کے دالان میں سے کھلتے ہوئے تنگ دروازے سے گزر کر مرسیر یا سٹریٹ میں آ گئے اور وہاں تھوڑی دیر نفیس شوکیسوں میں جھانکنے کے بعد ”گرانڈ کنال“ کے سب سے بڑے اور خوبصورت پل ریا لٹو کے پاس آنکے۔ پل کے پہلو میں نہر کے عین کنارے پر ایک پرسکون قبوہ خانے کو سیڑھیاں جاری تھیں۔ کنارے پر ہری بھری بیلوں کے جھنڈ میں میزیں لگی تھیں جن پر چند لوگ بیٹھے کافی اور گرانڈ کنال کے حسن سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ہم نیچے اترے تو ایک ویٹر نے ہمارا استقبال کیا ”بانوسیراسینور۔ سینوریتا۔ آپ اندر ہال میں بیٹھنا پسند کریں گے یا باہر گرینڈ کنال کے کنارے میز سجادی جائے۔“

”سینوریتا کی پسند؟“ میں نے اطالوی ویٹر کی نقل اتارتے ہوئے ربیکا کے سامنے جھک کر کہا۔

”نہر کے کنارے“ اس نے سر ایک طرف جھٹک کر مسکراتے ہوئے کہا۔ سنہری لٹ پھر

ماتھے پر آ گئی۔

ہماری میز کے ساتھ ہی ریستورنٹ کا چھوٹا سا گھاٹ تھا جہاں درجنوں نازک اور سبے ہوئے گنڈو لے جھول رہے تھے۔ ان میں سے اکثر ان لوگوں کی ذاتی ملکیت تھے جو ریستوران میں شام کے کھانے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ میز بڑی نفاست اور سلیقے سے سجائی گئی تھی۔ مرینو کے بنے ہوئے شیشے کے گلدان میں سرخ رنگ کے درجن بھر پھول بڑے قرینے سے ترتیب دیئے گئے تھے۔ ان کے درمیان دو لمبی اور پتلی موم بیٹوں کی لو شام کی ہلکی ہوا میں تھر تھرا رہی تھی۔

”آج صبح ہم لوگ مرینو گئے۔ اس چھوٹے سے جزیرے میں چند کاریگر ایک پھکنی اور سانس کے مدد جزر سے شاہکار تخلیق کر رہے تھے، شیشے کا اتنا خوبصورت کام میں نے کہیں نہیں دیکھا۔“ ربیکا نے اپنی لمبی انگلیوں سے گلدان پر ابھرے ہوئے نقوش کو پیار سے چھوتے ہوئے کہا، ”تمہارا کیا خیال ہے مرینو کا بنا ہوا یہ گلدان خوبصورت ہے نا؟“

”ہاں ہے، لیکن شاید اتنی خوبصورت انگلیاں مرینو کے کاریگر صدیوں میں بھی تخلیق نہ کر سکیں،“ اس نے ایک دم گلدان سے ہاتھ کھینچ لیا اور میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کا چہرہ مسرت سے دمک رہا تھا۔

”تم اب اطالویوں کی طرح جھوٹی مگر خوبصورت باتیں کر رہے ہو۔“

”میں صرف خوبصورت باتیں کر رہا ہوں۔“

ریستوران کے ہال کے اندر موسیقاروں نے اطالوی لوک دھنیں چھیڑ دیں۔ ویٹر مینو کارڈ لے کر آیا تمام کھانوں کے نام اطالوی اور فرانسیسی میں لکھے تھے۔

”سکول میں پڑھی ہوئی تھوڑی بہت فرانسیسی آج کام آ گئی۔“ اس نے مینو کارڈ کے اوراق پلٹتے ہوئے کہا ”سویاں اور قیمہ؟“ نہیں وہ تو تم نے آج دوپہر کھایا تھا۔ ہاں مینڈک کی تلی ہوئی ٹانگیں۔ میں اب کافی لیتے لیتے بچا، فیصلہ چاول کے سوپ اور بھنی ہوئی پھلی پر ہوا۔

ہمارے سامنے گرانڈ کنال ایک عظیم شاہراہ کی مانند ٹریفک سے پُر تھی۔ کارواں اور بسوں کی بجائے سینئر اور گنڈو لے لہروں پر رواں تھے۔ فرق اتنا تھا کہ ڈرائیونگ کے دوران سڑک پار کرنے والوں کو بچانے کا تردد نہیں کرنا پڑتا تھا، کبھی کبھار کوئی تیز رفتار سینئر گزرتا تو جھلکتی ہوئی لہریں کناروں کو پاٹ کر ہماری میز تلے بچھ جاتیں۔ ربیکا نے اپنے سنہری جوتے اتار کر ویٹر کے

حوالے کر دیئے۔ ”گیلی زمین کے لمس میں کتنی آسودگی ہے،“ اس کے ہونٹ لذت کے ایک انجانے احساس کی شدت سے بھجھ گئے۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم نے کافی منگالی اور دیر تک وہاں بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم مدت سے ایک دوسرے سے آشنا ہیں اور یہ ہماری پہلی ملاقات نہیں ہے، وہ بے حد خوش نظر آ رہی تھی۔ آج دوپہر ”لا انجلو“ قبوہ خانے میں بیٹھی منہ بسورتی اداس لڑکی سے یکسر مختلف۔

”آج صبح وینس کتنا پچکا اور بے کیف نظر آ رہا تھا، مجھے سان مارکو چوک کے کبوتر بھی بھڑے اور موٹے لگ رہے تھے بالکل ان اطالوی لفظوں کی طرح جو ہر سیاح لڑکی کے پیچھے تیر کی طرح جاتے ہیں“

”صرف خوبصورت سیاح لڑکی کے پیچھے“ میں نے لقمہ دیا۔

”تم اب پھر اطالویوں کی طرح.....“ اس نے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور ہنس کر فقرہ

ادھورا چھوڑ دیا۔

موسیقار اب اندر ہال سے فارغ ہو کر ہماری میز کے گرد ہو گئے۔

”سینوریتا کون سی دھن سننا پسند کریں گی؟“ موسیقاروں کے گنبے اور پستہ قد لیڈر

نے دامن کا سراٹھوڑی تلے دبا کر پوچھا۔

”اریوی ڈاچی روما“ ربیکا نے مچل کر فرمائش کی۔ گنبے موسیقار نے دوسرے

سازندوں کی طرف دیکھ کر سر ہلایا اور تین واکمنوں کی مدد بھری گونج فضا کو چیرتی ہوئی سارے

ماحول پر حاوی ہو گئی۔ دھن مدھم ہوتی تو گرانڈ کنال کی لہروں کا شور ابھرتا۔

”یہ تو روم سے جدائی کی دھن ہے اور تم کل صبح وہاں جا رہی ہو؟“

اس کی مسکراتی ہوئی آنکھیں سنجیدہ ہو گئیں ”یہی تو میں بھول جانا چاہتی تھی“ اس نے

اداس ہو کر کہا ”مستمنہ تم کل ہمارے ساتھ روم کیوں نہیں چلتے“ اس نے ایک دم خلاف توقع

میرے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر کہا ”ہم دونوں جی بھر کے روم کی سیر کریں گے“ صبح کو دینیتو

میں گھومیں گے، پچھلے پہر ہسپانوی زینوں پر بیٹھ کر پھول بیچنے والوں کی صدائیں سنیں گے اور شام

کو..... شام کو ہم ”تریوی فورے“ کے شفاف پانی میں سکے ڈالیں گے تاکہ ہم دوبارہ روم واپس

آئیں کیوں ٹھیک ہے نا؟“

”یوں لگتا ہے جیسے پچھلی مرتبہ ”تریوی فورے“ میں ڈالے ہوئے چند سکوں کا اثر ہو گیا ہے اور میں دوبارہ روم جاؤں گا۔“

”تو پھر تم چلو گے نا“ اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

”نہیں ربیکا، ونیس کی اس حسین شام نے مجھے ایک لمحہ کے لیے بھلا ہی دیا تھا کہ میں ایک سیاح ہوں۔ چاہتے ہوئے بھی تمہاری یہ خواہش پوری کرنے سے قاصر ہوں۔“

”تم شاید مجھے پسند نہیں کرتے“ اس نے آہستہ سے کہا اور اپنے ہاتھ پیچھے کھینچ لیے۔

”یہ بات نہیں۔ شاید تم ایک مرتبہ اور کہو تو میں سچ سچ تمہارے ساتھ چل دوں مگر اس سے کچھ نہیں بدلے گا، میں کبھی نہ کبھی تو واپس چلا ہی جاؤں گا۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا ”میں اب یہاں نہیں

بیٹھنا چاہتی“ اور پھر مڑ کر اس نے گنبجے والسن نواز کا شکریہ ادا کیا ”دھن بے حد خوبصورت تھی“
والسن نواز نے مسکرا کر سر ہلایا اور ہال کے اندر چلا گیا۔ ہمیں میز سے اٹھتا دیکھ کر گھاٹ پر کھڑے ایک گنڈولے کا ناچھی ہمارے پاس آ گیا۔

”سینور اور سینوریتا گنڈولے کی سیر کرنا پسند کریں گے؟“ اس نے اپنا گول کنارے کا ہیٹ سر سے اوپر کرتے ہوئے پوچھا۔

گراڈ کنال میں تیرتے ہوئے چند گنڈولوں کے علاوہ سینوروں اور سپیڈ بوٹوں کی آمد و رفت تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ ٹریفک کی کمی کی وجہ سے پانی کی سطح پُر سکون تھی یہاں پر دستور ہے کہ گنڈولے والا نہر کے کنارے گزرنے والے مشہور اور تاریخی عمارتوں کے نام بلند آواز سے گاہک سنا سنا ہے ”برنارڈ محل، دائیں ہاتھ“ اس نے تان لگائی ”سینی محل بائیں طرف“ اس نے ہاتھ ہلا کر

نہر میں کہا۔

”یہ کسی طرح چپ نہیں ہو سکتا“ ربیکا نے بیزاری سے کہا۔

”میرے ایک پسندیدہ مصنف کے تجربے کے مطابق اس کا علاج ایک سگرٹ ہے“

چنانچہ اسے سگرٹ پیش کیا گیا اور وہ فوراً چپ ہو گیا۔

ربیکا ابھی تک کونے میں بیٹھی کڑھ رہی تھی۔

”تمہیں معلوم ہے“ میں نے قدرے بشاش ہو کر کہا ”پورے ونیس میں ایک سو

پندرہ جزیرے ہیں جنہیں ایک سو ساٹھ نہریں اور چار سو مخرابی پل آپس میں ملاتے ہیں“ یہ نادر معلومات بے اثر ثابت ہوئیں اور ربیکا اسی طرح منہ پھلا کر بیٹھی رہی۔ میں نے ہمت نہ ہارتے ہوئے پھر کوشش کی۔ ”اور پھر اسی نہر کے کنارے شاید سامنے والے محل میں ہی مارکو پولو نے چین سے واپسی پر ایک شاندار دعوت دی۔ دعوت کے بعد اس نے اپنا بوسیدہ لبادہ الٹا تو اس کے اندر بیش قیمت جواہرات لٹکے تھے، اہل ونیس اتنی مدت بعد اسے پہچان بھی نہ سکے۔“

”اس کو بھی تمہاری طرح سیاحت کا خط تھا۔“ اس نے جل کر کہا۔

”بالکل۔ خوب آدمی تھا۔“ میں نے خوش ہو کر کہا۔

”تبھی جیل میں جا کر مرا تھا۔“

مجھ پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا ہو۔ اب میرے کڑھنے کی باری تھی، تھوڑی دیر کی خاموشی

کے بعد اس نے کن اکھیوں سے میری طرف دیکھا ”ناراض ہو گئے؟“

وہ مسکرا رہی تھی۔

”نہیں تو“

وہ کھسک کر میرے ساتھ آ گئی۔ ”مجھے معاف کر دو۔ میں بہت بیوقوف ہوں“ ہمارا

گنڈولا گریڈ کنال سے دائیں ہاتھ مڑ کر ایک چھوٹی سی نہر میں داخل ہو گیا جہاں مکمل تاریکی تھی۔

گنڈولا کوئی موڑ مڑتا تو کہیں کہیں کنارے پر واقع پرانے مکانوں کی ادھ کھلی کھڑکیوں میں سے

ہلکی روشنی آ رہی ہوتی جس سے تاریکی قدرے کم ہو جاتی۔ قدرے نیچے پل آتے تو گنڈولے

والا اپنا لمبا بانس کشتی میں لٹا کر خود جھک جاتا۔ ہر پل کی محراب کے وسط میں قدیم وضع کی ایک

لائین روشن تھی تاکہ کشتیوں کو نیچے سے گزرنے میں آسانی ہو۔ ڈوبے پیلس کے ساتھ ”آہوں

کے پل“ کے نیچے سے گزر کر ہم کھلے سمندر میں آ گئے۔ یہاں خنکی نسبتاً زیادہ تھی۔ وہ سرک کر اور

قریب آ گئی۔ بغیر آستین کے لباس میں اس کی دودھیا بانہوں سے ونیس کے نم سنگ مرمر کی

خوشبو اٹھ رہی تھی۔

”ہم سان مارکو چوک میں اتر جاتے ہیں وہاں سے تمہارا ہوٹل قریب ہے“ میں نے

آہستہ سے کہا۔

”نہیں اس وقت ”لیڈو“ کے لیے آخری موٹر بوٹ جا چکی ہوگی۔ میں تمہیں وہاں تک چھوڑ آتی ہوں۔“

سمندر کے اس حصے میں لہریں تیز تھیں جن کی وجہ سے ہانچی کو گنڈولا چلانے میں خاصی دشواری پیش آرہی تھی۔ ہمارے پاس سے سیاہ جمل میں لپٹے چھ گنڈولے بڑی آہستگی سے گزر گئے درمیان والے گنڈولے میں ایک سیاہ تابوت رکھا تھا جس پر پھولوں کی ایک چادر بچھی تھی، پانی کی سطح پر تیرتا یہ خاموش اور اداس قافلہ ”سان مثل“ کے قبرستان کی جانب رواں تھا۔

”وینس میں موت بھی خوبصورت ہے“ ربیکا کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

لیڈو کے ساحل پر گنڈولا رک گیا۔

”وینس کی یہ رات مجھے کبھی نہ بھولے گی۔“

”اور میں..... اس نے میرے ہونٹوں پر اپنے خنک ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، ”روم کے ”تریوی فورے“ میں سکے ڈال کر دعا کروں گی کہ ہم دونوں پھر وینس میں ہی ملیں۔“

میں نے اس کے ماتھے پر پڑی سنہری لٹ کو بڑے پیار سے ایک طرف کیا اور گھاٹ کی میڑھیاں چڑھ کر ساحلی دیوار پر آ گیا۔ گنڈولے والے نے اپنے لمبے بانس سے ساحل کی دیوار کو دھکیلا اور گنڈولا واپس سان مارکو کی طرف تیرنے لگا۔

”جب موسم بہار میں ابا بیلوں کی ڈاریں

”مچیں ترانو“ کے ساحل کو واپس لوٹیں گی

یہ وہی دن ہوگا.....

جب تم میرے پاس لوٹ آؤ گے۔“

(ایک اطالوی لوک گیت)

اپس کے آسیب زدہ قصبہ

برقی ریل گاڑی ایک فراری سپورٹس کار کی مانند اطالیہ کے شہر میلان کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ تیز رفتار مگر پرسکون۔ میں نے آج صبح وینس سے سوئٹزرلینڈ کے دارالحکلافے برن تک کا ٹکٹ کٹا لیا تھا جس کے راستے میں میلان بھی پڑتا تھا۔ یورپ میں ریل کا ٹکٹ تین ماہ کے لیے کارآمد رہتا ہے۔ اس دوران آپ اپنی منزل کے راستے میں کسی بھی مقام پر اتر سکتے ہیں اور پھر بعد میں وہیں سے سفر جاری رکھ سکتے ہیں۔ میں ہمیشہ اس سہولت کا پورا پورا فائدہ اٹھاتا تھا جہاں کہیں بھی کوئی قصبہ یا شہر نظر کو بھایا وہیں اتر گئے۔

اب میرا خیال تھا کہ اگر میلان میں کوئی خاص بات ہوئی تو آج شب وہیں گزرے گی۔

گاڑی دھند میں لپٹے ہوئے ایک خوبصورت شہر کے پلیٹ فارم پر کھڑی ہوگئی۔ یہ

دیرونا تھا۔ ”شیکسپیر کی جولیٹ بھی تو اسی شہر میں رہتی تھی“ مجھے خیال آیا ”اور ایک جولیٹ اس وقت

روم کے ”تریوی فورے“ میں سکے ڈال رہی ہوگی۔“ دھند اور اداسی آپس میں مدغم ہو گئے۔

میلان آیا۔ بلند و بالا جدید عمارتوں پر ٹیلی ویژن کے ایریل جنگلی گھاس کی طرح اگے

ہوئے تھے۔ بے پناہ ٹریفک اور موسلا دھار بارش۔ یورپ کے اکثر بڑے شہر اندر سے بالکل کھوکھلے

ہوتے ہیں۔ شیشے، لوہے اور سیمنٹ کے بنے ہوئے دیواروں پر بے جو انسان سے اس کا بے ساختہ

پن چھین کر اسے ناکارہ کر دیتے ہیں۔

”نہیں یہاں پڑاؤ نہیں ہو سکتا، سوئٹزرلینڈ ہی چلا جائے تو بہتر ہے“ میں نے سوچا۔

گاڑی جونہی میلان سے باہر نکلی بلند پہاڑوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ دھند

سٹیشن سے نظر آیا تھا۔ کیمپنگ کی مالکہ نے بتایا کہ اس موسم میں پہلا مسافر تھا جو وہاں قیام کی غرض سے آیا تھا۔ میں نے اپنا خیمہ ندی کے کنارے سیب کے ایک درخت کے تلے نصب کیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ معلوم ہوا کہ کیمپنگ کی مالکہ کو مجھے موسم کا پہلا مسافر کہنے کی بجائے پہلے بیوقوف کا خطاب دینا چاہئے تھا۔ تیز ہوا کے تھپڑے پہاڑ پر جے گلشیئر پر سے پھسلنے نیچے کیمپنگ کے میدان میں آتے اور میرے خیمے کو چیرتے مجھے بخ کر جاتے۔ ہرانی پوتین اوڑھ کر سونے سے بھی کچھ افاقہ نہ ہوا۔ تمام رات ٹھٹھرتا رہا۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی میں اپنے خیمے سے باہر آ گیا۔ کیمپنگ کے میدان کی سبز گھاس پر کورے کی سفید تھیں جمی ہوئی تھیں۔ غسل خانے میں گیا تو پانی کا ٹٹے کو آچٹا نیچہ منہ دھونے کی سرد جنگ شہادت کی انگلی بمشکل پانی میں بھگو کر دونوں آنکھوں میں سرچوکی مانند پھیر لینے سے ہی جیت لی گئی۔

ہرانی پوتین اپنے گردختی سے لپٹائے جب میں ناشتے کے لیے برگ کے قصبے میں آیا تو گنبدوں والے قلعے کے پہلو میں ایک چھوٹے سے قبوہ خانے کے علاوہ سارا بازار بند پڑا تھا۔ الپس کے دیہاتی لباس میں ملبوس ایک لڑکی قبوہ خانے کے سامنے فٹ پاتھ پر کھڑی میزوں کرسیوں کی جھاڑ پونچھ میں مصروف تھی۔

”کلن مارگن ہرن“ اس نے مجھے دیکھ کر کہا اور ایک کرسی آگے کر دی۔

”گڈ مارنگ“ میں نے ٹھٹھرتے ہوئے جواب دیا۔ بھلا اس کہر آلود بخ بستہ صبح میں اچھائی

کی کون سی بات تھی۔ ”میں اندر بیٹھنا پسند کروں گا“ میں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا ”باہر سردی ہے۔“

قبوہ خانے کے اندر صورت حال بہتر تھی۔ میز پر دھرا مینو کارڈ فرانسیسی اور جرمن زبان میں تھا۔ میں نے کھانے کے ناموں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف قیمتوں پر نظر ڈالی۔ چندہ بیس روپوں سے کم قیمت کا کوئی کھانا نہ تھا۔ ویٹرس ہاتھ میں کاغذ پنسل لیے میرے سر پر کھڑی مجھے یوں دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو جو کچھ کھانا ہے جلدی سے کہو مجھے صبح اور بھی کام ہیں۔ میں نے ایک نظریہ مینو کارڈ پر درج قیمتوں پر ڈالی اور پھر اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔

”ہاں جناب۔ کیا پسند کریں گے؟“ اس نے جھک کر پنسل کا سکہ کاغذ پر جھکا دیا۔

”دام بہت ہیں“ میں نے سر کھجا کر کہا۔

”وہ تو ہیں۔“ اس نے اکٹھا ہٹ سے جواب دیا اور پھر سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی۔

کا ایک سیلاب چوٹیوں سے اتر کر پٹلی وادیوں تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ اطالوی سلسلہ کوہ الپس تھا۔ اب ہم ”جھیل مگوری“ کے کنارے کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ دھند سے ڈھکے ہوئے ننھے منے گاؤں آتے اور گاڑی رکے بغیر فرارے بھرتی ہوئی وہاں سے گزر جاتی۔ کسی جگہ لمحہ بھر کے لیے دھند صاف ہوتی تو جھیل کا نیلا پانی اور سرسبز جزیرے نظروں کے سامنے آ جاتے۔

”ڈومسڈ ولا“ کا قصبہ اطالوی اور سوس سرحد پر واقع ہے۔ کسٹم آفیسرز نے پاسپورٹ چیک کیے اور ہم سوئٹزر لینڈ میں داخل ہو گئے۔ الپس کا سلسلہ کوہ اب اپنی قومیت بدل کر اطالوی سے سوس ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی طویل سرنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ گاڑی ایک سرنگ سے نکلتی اور دو چار سو گز تاڑہ ہوا میں سانس لے کر پھر دم سادھے ایک اور سرنگ میں جا گھتی۔ آخر میں سمپلان سرنگ آئی جس کی لمبائی سوا بارہ میل ہے۔ اندر داخل ہوتے ہی گاڑی کی تمام روشنیاں جل اٹھیں۔ دوسرا سرا آیا تو اکثر مسافر اذگہ رہے تھے۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا گاڑی ایک قصبہ شٹین کے پلیٹ فارم کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ یہ ”برگ“ تھا۔ سوئٹزر لینڈ کا پہلا قصبہ۔

”برن پہنچنے تک رات ہو جائے گی اور اتنے بڑے شہر میں رات کے وقت رہائش کی جگہ تلاش کرنے میں وقت ہوگی“ میں نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا۔ ”یہ قصبہ خوبصورت ہے کیوں نہ ایک دو روز کے لیے یہیں رک جاؤں۔“

گاڑی کھڑی ہوئی تو میں سامان کا تھیلہ کا ندھے پر ڈال کر پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ ”دفتر معلومات“ سے کیمپنگ کا پتہ پوچھا اور سٹیشن سے باہر نکل آیا۔ سامنے ایک چھوٹا سا خوبصورت بازار نیم تاریکی میں بارش سے بھیگا کھڑا تھا۔ سوس طرز تعمیر کے قدیم چوبی مکان۔ دیدہ زیب دکانیں جو کوہ پیما کی اور برف پر پھسلنے والے سامان سے بھری پڑی تھیں۔ بازار کے خاتمے پر پورے قصبے کو آغوش میں لیے گردن میں بل ڈال دینے والا ایک بلند برف پوش پہاڑ کھڑا تھا۔ پہاڑ کی چوٹی دھند میں روپوش تھی۔ یکدم ہوا کا ایک سرد تھپڑا آیا، پھر دوسرا، معلوم ہوا کہ یہاں دن رات ایسی ہی جنگ ہوا چلتی رہتی ہے۔

برگ سوئٹزر لینڈ کے بلند ترین پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے۔ الپس میں کوہ پیما کی کے بلے کوہ پیما اپنی مہموں کا آغاز اسی قصبے سے کرتے ہیں۔ بازار سے گزر کر میں ایک ندی کے کنارے کنارے چلتا ہوا کیمپنگ تک آ گیا جو اس سفید ریش پہاڑ کے عین دامن میں واقع تھی جو مجھے

”اچھا تو پھر ٹائلر چاکلیٹ اور الپائن دودھ کی ایک بوتل“ میں نے سوئٹزرلینڈ میں پیٹ بھرنے کا ارزاں ترین نسخہ آزمایا۔

”دودھ کی بوتل؟“ پنسل ویٹرس کے ہاتھ سے گرتے گرتے پچی۔ یورپ کے اکثر ملکوں میں دودھ یا تو بچوں کی غذا کے طور پر استعمال میں لایا جاتا ہے اور یا پھر کافی اور چائے کا رنگ بدلنے کے لیے پُکایا جاتا ہے۔ دودھ کے لیے میری رغبت یہاں اکثر لوگوں کو درط حیرت میں ڈال دیتی تھی۔ یہ ویٹرس محترمہ بھی اب اسی مرحلہ سے گزر رہی تھیں۔

”ہاں دودھ کی بوتل“ میں نے اس کی حیرت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ ”سنا ہے الپس کی گائیں موسم بہار میں گھاس کی بجائے وادیوں میں بکھرے ہوئے خوش رنگ پھول کھاتی ہیں اور ان کے دودھ میں ان پھولوں کی مہک ہوتی ہے۔“

”ہوتی ہوگی“ اس نے روکھے پن سے کہا ”میں نے آج تک دودھ نہیں پیا۔“ چاکلیٹ اور دودھ کے ناشتے کے بعد جب میں قہوہ خانے سے باہر نکلا تو قصبے کی اکلوتی سڑک پر آمدورفت شروع ہو چکی تھی۔ سکول کے بچوں کا ایک گروہ چمڑے کی ٹیکروں اور بھاری اوننی سویٹروں میں ملبوس سامان کے تھیلے کا ندھوں پر اٹھائے ندی کے پل کے پار جا رہا تھا۔ ان کا رخ اس بل کھاتی سڑک کی طرف تھا جو الپس کے بلند پہاڑوں میں جاتی تھی۔ الپس کے دیہاتی کسان چھکڑوں پر دودھ کے کنستروں اور سبزیوں کی ٹوکریاں لا کر قصبے میں لا رہے تھے۔ چھکڑوں کو پستہ قدموٹے گھوڑے کھینچ رہے تھے جن کے نتھنوں سے سردی کی وجہ سے بھاپ خارج ہو رہی تھی۔ بازار کی دکانیں اور قہوہ خانے کھل چکے تھے۔ سامنے ”ٹورسٹ آفس“ کا بورڈ آویزاں تھا۔ میں سڑک پار کر کے اندر چلا گیا۔ ایک دہلی پتلی عینک زدہ لڑکی کاؤنٹر پر بکھرے رسالوں اور کتابچوں کو ترتیب دینے میں مصروف تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے سر اٹھایا اور ایک پھسکی مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا۔

”گلن مارگن“ اس نے عینک درست کرتے ہوئے کہا۔ ”فرمائیے میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟“

میں نے بھی ہونٹوں پر برابر کی پھسکی مسکراہٹ سجائی اور پوچھا ”میں قصبے اور اس کے گرد و نواح کے قابل دید مقامات کی تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔“

”برگ کا قلعہ جو پندرہویں صدی میں تعمیر ہوا اور قدیم ٹاؤن ہال“ لڑکی نے کاؤنٹر سے چند نگین کتابچے اٹھا کر میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

برگ کا قلعہ ششے کی بڑی کھڑکی سے صاف نظر آ رہا تھا۔ چار گنبدوں والی اس غیر موثر چار دیواری کو قلعے کا پرہیز نام دینا سراسر زیادتی تھی۔ قدیم ٹاؤن ہال بھی یونہی سی عمارت تھی۔ ”اور کچھ“ میں نے ”بلند الپس“ نامی کتابچے کی ورق گردانی کرتے ہوئے پوچھا۔

”اس کے علاوہ کیمپنگ کے ساتھ والی سڑک الپس میں گھرے خوبصورت دیہات اور برف کے وسیع تودوں تک جاتی ہے۔ شاید آپ وہاں جانا پسند کریں۔ وہاں کے لیے بسیں شیش کے باہر ہر ایک گھنٹے بعد چلتی ہیں۔“

میں شیش کی طرف جانے کی بجائے سیدھا اس سڑک پر چل دیا جس پر تھوڑی دیر پہلے میں نے سکول کے بچوں کو جاتے دیکھا تھا۔ میں آج عام ذرائع آمدورفت کی بجائے ”ہیج ہانگنگ“ کے ذریعے سفر کرنا چاہتا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران جب فوجی محاذ سے چند روز کی چھٹی پر گھر کی راہ لیتے تو عام طور پر ان کی جیب خالی ہوتی۔ وہ اپنے شہر یا قصبے جانے والی سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر انگوٹھے سے اشارہ کرتے تو احسان مند ہم وطن فوراً اپنی کارروک کر انہیں اپنے ساتھ بٹھا لیتے اور کسی قسم کے معاوضے کے بغیر جلد از جلد منزل مقصود پر پہنچا دیتے۔ جنگ ختم ہوئی تو اس طریق کار کو شہریوں اور خاص طور پر نوجوان سیاحوں نے اپنالیا۔ کار یا ٹرک ڈرائیور عام طور پر اس لیے لفٹ دے دیتا ہے کہ اسے طویل سفر کے دوران خوش گوار فاقہ کی تلاش ہوتی ہے یا پھر ان دنوں کی یاد میں جب وہ خود اسی طریقے سے سفر کیا کرتا تھا۔ ادھر سیاح بسوں اور ٹرینوں کے کرایوں سے بچ جاتا ہے۔ ”ہیج ہانگنگ“ میں فوائد کے ساتھ قباحتیں بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً آبادی سے دور سڑک کا کوئی ایسا کنارہ تلاش کرنا جہاں کاریں آسانی سے رک سکیں۔ منزل پر پہنچنے کی بجائے کسی انجان جگہ پر سفر کا اختتام، لیکن میرے نزدیک یہ قباحت ہی ہانگنگ کی سب سے بڑی خوبی بھی ہے اور اسے باقی تمام ذرائع سفر سے ممتاز کرتی ہے۔ جہاں ایک عام سیاح بس یا گاڑی پر سفر کرتے ہوئے گرد و پیش کی خوبصورتیوں سے بے خبر ایک بڑے شہر سے دوسرے بڑے شہر پہنچ جاتا ہے وہاں ”ہیج ہانگنگ“ گرد و نواح کے نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے علاوہ کئی بار انجانے ملک کے

ایسے کونوں اور حصوں تک رسائی حاصل کر لیتا ہے جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتے۔ ملک کے باشندوں کے ساتھ قریبی رابطہ بے شمار تجربات کو جنم دیتا ہے اگرچہ کبھی کبھی حادثات سے بھی واسطہ پڑ جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ کئی برس پیشتر جب میں پہلی مرتبہ ہانگنگ کے لیے سڑک کے کنارے کھڑا ہوا تو میں انگوٹھے کا اشارہ دیتے ہوئے گھبرا ہوا تھا۔ جانے کوئی ڈرائیور کتا بھی ہے یا نہیں۔ پندرہ منٹ کے بعد ایک دم ایک دیوڑا ٹرک مجھ سے کچھ فاصلے پر جا رکھا۔ مجھے بالکل یقین نہ آیا کہ وہ میرے لیے ہی رکا ہے اور میں بھاگ کر اس میں سوار ہونے کی بجائے وہیں بت بنا کھڑا رہا۔ مجھے تذبذب میں پا کر ڈرائیور نے ٹرک بیک کیا اور کھڑکی میں سے سر نکال کر بڑے غصے سے کہنے لگا ”کہیں چلنا ہے یا یہاں پر پکنک منانے کے لیے کھڑے ہو؟“

میں آج برسوں بعد پھر اسی طریقے سے سفر کرنے والا تھا۔ میں سڑک کے ایک موڑ کے پاس ایک ایسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں کاریں باقی ٹریفک کے راستے میں حائل ہوئے بغیر بڑی آسانی سے رک سکتی تھیں مگر یہاں مصیبت یہ تھی کہ پہاڑوں میں جانے والی اس سڑک پر کاروں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس لیے کافی دیر کھڑے رہنے کے باوجود مجھے کوئی لفٹ نہ ملی۔ میرے بائیں ہاتھ بلند پہاڑوں کا ایک سلسلہ تھا جس کی چوٹیاں دھند کی وجہ سے نظر نہیں آ رہی تھیں۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر سڑک کے دائیں ہاتھ چند کھیت تھے جن میں بھوسے کی بڑی بڑی گانٹھیں ایک خاص ترتیب سے پڑی تھیں۔ ایک کسان جس نے رنگ برنگے پروں والا الپائن جیٹ پہن رکھا تھا ان گانٹھوں کو اٹھا اٹھا کر لکڑی کے بنے ہوئے گودام کی طرف لے جا رہا تھا۔ اسی کھیت کے ایک کونے میں دس بارہ سال کا ایک لڑکا ایک ہاتھ میں پانی کی بالٹی اور دوسرے میں ایک کھر درابرش لیے بھورے رنگ کے ایک فربہ گھوڑے کو نہلانے میں مصروف تھا۔ کھیت سے بھوسہ اڑا کر لڑکے کے سنہری بالوں میں اٹک جاتا تو وہ برش گھوڑے کی پشت پر رکھ کر اپنے لمبے بالوں میں ایک مرتبہ انگلیاں پھیرتا اور دوبارہ کام میں جُست جاتا۔ ان کھیتوں سے پرے ندی کے کنارے ایک خوش نظر مکان تھا۔ مکان کی کھڑکیوں میں سرخ رنگ کے پھولوں کے گلمے دھرے تھے۔ سب کے جنگلی درخت صحن سے شروع ہو کر پانی کی سطح تک چلے گئے تھے۔ مکان کا ڈروازہ کھلا اور ایک صحت مند عورت ہاتھ میں بالٹی لیے باہر نکلی اس کی نظریں سامنے سڑک کے موڑ پر پڑیں جہاں میں کوہلوں پر ہاتھ رکھے اسے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھکی اور پھر سب کے درختوں میں

سے ہوتی ہوئی ندی کے کنارے چلی گئی۔ یکا یک میرے بہت ہی قریب کار کا ہارن زور زور سے بجا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو سفید رنگ کی ایک کار میرے پاس کھڑی تھی۔ ”کہاں چلو گے؟“ کار کی ڈرائیور نے پوچھا۔ وہ درمیانی عمر کی ایک خوبصورت عورت تھی۔ میں نے کار کا دروازہ کھولا اور اگلی نشست پر اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ ”اس بارے میں ذہن بالکل خالی ہے۔ کہیں بھی اتار دیجیے گا۔“

”تمہارا سامان کہاں ہے؟“

”برگ میں۔ میں شام تک واپس چلا جاؤں گا۔“

”میں گرافن کے قصبے تک جا رہی ہوں“ اس نے کار سٹارٹ کرتے ہوئے کہا ”وہیں اتار دوں گی۔“

”بہت بہت شکریہ۔ آپ اس سے پہلے بھی کبھی اس طرف آئی ہیں؟“ میں نے گفتگو شروع کرنے کی خاطر پوچھا۔

”نہیں۔ کبھی نہیں۔“ اس کے لہجے میں سوگوار کی تھی۔

”کیا آپ گرافن میں اپنے عزیزوں سے ملنے جا رہی ہیں؟“

”ہاں بچھڑے ہوئے عزیزوں سے“ یہ کہتے ہوئے وہ بے حد اداس ہو گئی۔

نیچے وادی میں اور اس سے پرے پہاڑوں پر سوئٹزرلینڈ کے دیہی وضع کے گھر ”شیے“ بکھرے پڑے تھے۔ یہ گھر ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے۔ مجھے یاد آیا کہ پہلے زمانوں میں ان گھروں کے کینن وادی کے پار اپنے ”ہمسایوں“ کو ایک خاص طریقے سے پیغام پہنچایا کرتے تھے۔ لکڑی کے بنے ہوئے گزروں لمبے قرنے کو زور سے پھونکا جاتا اور پوری وادی اس کی بھیانک آواز سے گونج اٹھتی۔ ہمسایوں کو میلوں دور قرنے کی آواز کے زیر و بم سے پیغام کا اندازہ ہو جاتا۔ برف باری اور شدید طوفان کے دوران جب پیغام رسانی کے دوسرے وسائل ختم ہو جاتے تو وادی کے لوگ ایک دوسرے سے رابطہ قائم رکھنے کے لیے اسی طریقے پر انحصار کرتے۔ اسے ”یوڈلنگ“ کہا جاتا ہے۔ جس سڑک پر ہم جا رہے تھے اس کے گرد کے تمام پہاڑوں پر بے پناہ دھند تھی۔ کسی جگہ دھند صاف ہوتی تو قصبوں کے دیدہ زیب کلیساؤں کے سرخ گنبد نظر آ جاتے۔ بلندی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ دھند میں اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ ہم بھی اس کی لپیٹ میں آ گئے۔

ونڈسکرین کے سامنے دھند کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ عورت نے کار کی روشنیاں جلا لیں اور رفتار آہستہ کر دی۔ کبھی کبھی گائیوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی سریلی آواز ہمارے کانوں میں پڑتی۔ پہاڑ کی کسی ڈھلوان پر چرتی ہوئی گائیں ہماری نظروں سے اوجھل تھیں۔

”گرافن“ کے قصبے کے وسیع اور پتھریلے چوک میں عورت نے کار روک لی اور فوارے کے ساتھ کھڑے ایک موٹے دیہاتی سے کچھ دریافت کیا۔ دیہاتی نے کلیسا کے پہلو سے نکلتی ہوئی سڑک کی طرف اشارہ کر دیا۔ عورت نے کار اسی جانب موڑ دی۔ قصبے کے دوسری طرف پہاڑوں پر بے پناہ برف تھی۔ پگھلتی ہوئی برف کا پانی سڑک کی سطح پر بہ رہا تھا۔

”یہاں سے چند میل کے فاصلے پر ایک گاؤں تھا“ عورت نے سڑک پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہنا شروع کیا۔ ”آج سے پورے چھ سال قبل رات کے پچھلے پہر وہ سامنے والا برفانی تودہ پہاڑ سے پھسلا اور پورے گاؤں کو اپنی سرد بانہوں میں سمیٹ لیا۔ سینکڑوں لوگ برف تلے دب کر ہلاک ہو گئے۔ ان میں میرا مگتیر بھی تھا۔“

”مجھے آپ سے بے حد ہمدردی ہے۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ اب میں اس کی سوگوار خاموشی کا سبب جان چکا تھا۔

”وہ انجینئر تھا اور اس علاقے میں ایک سڑک تعمیر کر رہا تھا۔ حادثے کی خبر سن کر بے شمار لوگ اس بد قسمت قصبے کو دیکھنے آئے اور مرنے والوں کی آخری رسوم میں شرکت کی۔ میں اپنے آپ کو شادی کے سفید لباس کی بجائے سیاہ ماتمی لباس پہننے پر آمادہ نہ کر سکی اور وہیں جینڈا میں اپنے سکول روم میں بیٹھی روتی رہی۔ میں اب بھی اسی سکول میں پڑھاتی ہوں۔ آج اس حادثے کی برسی ہے اور میں پہلی مرتبہ اس کی قبر دیکھنے جا رہی ہوں۔“

کار نے ایک موڑ کا ناتو دوسری جانب سڑک کے بیچ خطرے کے سرخ نشان کا تختہ نظر آیا۔ تختے کے ساتھ کھڑے پولیس کے سپاہی نے ہمیں ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔

”رات کو برف کا ایک تودہ بھسلے سے سڑک بالکل بند ہو چکی ہے۔ آپ واپس چلے جائیں۔“ سپاہی نے کار کی کھڑکی کے قریب آ کر کہا۔

عورت کو شاید سپاہی کی بات کا اعتبار نہ آیا اور وہ کار سے باہر نکل آئی۔ واقعی ہم سے چند گز کے فاصلے پر برف کی ایک دیوار ہمارا راستہ روکے ہوئے تھی۔

”یہاں سے حادثے میں مرنے والوں کا قبرستان کتنی دور ہے؟“ عورت چلتی ہوئی برف کے تودے کے پاس پہنچ گئی۔

کم از کم پانچ میل۔ وہاں پیدل جانا بھی خطرے سے خالی نہیں۔ ہر طرف برف ہی برف ہے۔“

عورت نے اپنے بائیں ہاتھ کا گرم دستان اتارا اور مٹھی بھر برف اٹھا کر اسے اپنے گالوں پر رگڑنے لگی۔

”مادام آپ اس تودے سے دور ہی رہیں تو بہتر ہے۔ ابھی یہ حرکت میں ہے۔“ سپاہی نے آگے بڑھ کر عورت کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے برف کی سفید دیوار کو گھورتی رہی اور پھر کار میں واپس آ گئی۔ اس کے ماتھے پر اور بالوں میں پانی کے قطرے اٹکے ہوئے تھے۔

”اور ہاں مادام“ سپاہی نے جھک کر کھڑکی میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”موسم بہار میں جب برف پگھلنے لگتی ہے تو خاص طور پر اس علاقے میں برف کے تودے پھسلنے لگتے ہیں آپ آئندہ موسم گرما میں آئیں۔“

عورت نے رومال سے پانی کے قطرے ماتھے سے پونچھے اور دستانہ پہن کر کار شارٹ کر دی اور ہم واپس گرافن آ گئے۔ پتھریلے چوک کے فوارے کے پاس ابھی تک وہ موٹا دیہاتی کھڑا تھا۔ ہم کار سے باہر نکلے تو وہ ہمارے پاس آ گیا اور عورت سے جرمن میں گفتگو کرنے لگا۔

”یہ دیہاتی کہہ رہا ہے کہ سامنے والا کلیسا حادثے میں مرنے والوں کی یاد میں تعمیر کیا گیا تھا۔“ عورت نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا اور کلیسا کی جانب چل پڑی۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ ہولیا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے کوٹ کی جیب سے ایک سیاہ رومال نکالا اور سر پر اوڑھ کر ٹھوڑی تلے گرہ دے لی۔

”میں ذرا اندر جا رہی ہوں“ اس نے مڑ کر کہا۔ ”تم بھی اگر آنا چاہتے ہو تو چلے آؤ۔“ دیودار کی لکڑی کا بنا ہوا کلیسا اندر سے بالکل سنسان اور تاریک تھا۔ اگرچہ اسے تعمیر ہوئے پانچ سال سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا تھا مگر ابھی تک لکڑی کی کرسیوں اور بنجوں میں سے دیودار کی ہلکی ہلکی مہک آ رہی تھی۔ سامنے دیوار پر مقامی باشندوں کا لکڑی سے تراشا ہوا

حضرت عیسیٰ کا مجسمہ نصب تھا اور اس کے عین نیچے ایک چوبی تختے پر حادثے میں ہلاک ہونے والوں کے نام کندہ تھے۔ عورت نے میز پر بڑی موم بتیوں کے بنڈل سے ایک موم بتی اٹھائی اور قیمت کی صندوقچی میں ایک سکہ ڈال کر مجسمے کے قدموں تلے چلی گئی جہاں پہلے سے ہی لاتعداد موم بتیاں جل رہی تھیں۔ اس نے اپنی موم بتی روشن کی اور اسے ان سب کے درمیان میں رکھ دیا۔ وہ تھوڑی دیر وہاں خاموش کھڑی رہی اور پھر گھٹنے ٹیک کر سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے عبادت میں مصروف ہو گئی۔

میں نے اپنے آپ کو اس ماحول میں اجنبی سا محسوس کرنا شروع کر دیا۔ میں اس عورت کا غم اور تقدس بانٹنے سے قاصر تھا اس لیے دبے پاؤں چلتا ہوا باہر آ گیا۔ کلیسا کی طرح قصبہ بھی سنسان پڑا تھا۔ یہاں کی بیشتر آبادی کسانوں پر مشتمل تھی جو صبح سویرے کھجلی وادیوں میں اپنے کھیتوں کی دیکھ بھال کے لیے چلے جاتے تھے اور رات گئے لوٹتے تھے۔ کلیسا کے پہلو میں ایک وسیع اور سرسبز میدان تھا جہاں صرف چند روز پہلے برف کی تہیں تھیں مگر اب سارا قطعہ کروکس، سالویا اور اینی مون کے الپائن پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ میدان کے عقب میں سوئٹزرلینڈ کی سب سے بلند چوٹی ”میٹر ہارن“ ایک نوکیلے سینک کی مانند دھند اور بادلوں میں دھنسی ہوئی تھی۔ ان بلند یوں پر ایک سیاہ اور ہیبت ناک قسم کی خوبصورتی تھی جیسے ایک بے حد حسین عورت کی دلکش ہنسی میں اس کے نوکیلے اور خون آلود دانت دکھائی دیے لگیں۔

”ٹن۔ ٹن۔“ کلیسا کا گھڑیاں بجنا شروع ہو گیا اور اس کی گمبھیر آواز گرد و نواح کے پہاڑوں اور وادیوں میں گونج گئی۔ ”جانے اس گھڑیاں کے بجنے میں کس کی موت کا پیغام ہے“ میں نے خوفزدہ ہو کر سوچا۔ مجھے معلوم تھا کہ ان اونچے پہاڑوں میں گھڑیاں کی آواز ہمیشہ کسی حادثے یا موت کا پتہ دیتی ہے۔ دھند جواب تک چوٹیوں پر اٹکی ہوئی تھی نیچے قصبے تک آ گئی اور تھوڑی دیر بعد ہلکی ہلکی بارش بھی شروع ہو گئی۔ میں نے برساتی کا کارواں نچا کر کے گلے کے گرد اچھی طرح لپیٹ لیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا کلیسا کے لمبے برآمدے میں آ گیا۔

”میں اس کی کھوپڑی دیکھ کر آئی ہوں۔“ عورت نے کلیسا سے باہر قدم رکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔

”کھوپڑی!“ میں اچھل پڑا۔ گھڑیاں اب زور زور سے بج رہی تھیں۔

”ہاں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آج سے چند روز پیشتر حادثے میں مرنے والوں کی قبریں کھود کر ان کی کھوپڑیاں اس کلیسا میں رکھ دی گئی ہیں۔ الپس میں رواج ہے کہ قبرستان کا رقبہ ایک خاص حد سے تجاوز نہیں کر سکتا اس لیے جب بھی قبریں زیادہ ہو جائیں تو پرانی قبریں کھود کر ہڈیاں ایک مشترکہ قبر میں دفن کر دی جاتی ہیں اور کھوپڑیاں قصبے کے کلیسا کے تہ خانے میں واقع ایک خصوصی ”کھوپڑیوں کے کلیسا“ میں سجادی جاتی ہیں۔ ہر کھوپڑی پر نام کی چٹ چسپاں کر دی جاتی ہے۔“

”سبحان اللہ“

”کیا کہا تم نے؟“

میں نے ترجمہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔

”میں نے آج اپنے منگیتر کی کھوپڑی دیکھ لی ہے۔ اب میں چین سے زندگی بسر کر سکوں گی۔“ وہ بے حد مسرور نظر آ رہی تھی۔

میں جب بھی سوئٹزرلینڈ کے خوبصورتی سے ترتیب دیئے ہوئے رنگ برنگے پھولوں سے آراستہ قبرستان دیکھتا تو دل سے ہوک اٹھتی کہ بس ایس جا است۔ آدمی مرے اور الپس کے دامن میں کسی نفیس قبرستان میں دفن ہو جائے۔ آج معلوم ہوا کہ یہ سلیقہ آدمی کا مردہ خراب کر کے برقرار رکھا جاتا ہے اور تدفین کے چند سال بعد یار لوگ نیچے لے کر آ دھمکتے ہیں کہ مردہ صاحبان انھیں اور کھیر کھائیں۔ یہاں کے قبرستانوں کی ہری بھری گھاس اور پھولدار جھاڑیوں سے میانی صاحب کی دھول اور لیکر کے درخت بدرجہا بہتر ہیں کم از کم وہاں قیامت تک مردہ صاحبان کو آرام کرنے کا موقع تو مل جاتا ہے۔

”تم چاہو تو میں تمہیں واپس برگ بھی لے جاسکتی ہوں کیونکہ میں نے آج شام تک ہر صورت جینوا پہنچنا ہے۔“ عورت نے اپنے بیگ سے کار کی چابی نکالتے ہوئے کہا۔

”بہت بہت شکریہ۔“ میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ میرے ذہن میں ابھی تک کھوپڑیاں ناچ رہی تھیں۔

”کوئی بات نہیں۔ تم ایک اچھے رفیق ثابت ہوئے ہو“ اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”شام ہونے کو ہے بہتر ہے کہ ہم ابھی روانہ ہو جائیں اور مکمل تاریکی چھانے سے پہلے ہی نیچے وادی تک پہنچ جائیں۔“

بوند باندی ابھی تک جاری تھی البتہ گھڑیاں بجنا بند ہو چکا تھا۔ وہی موٹا دیہاتی جو پہلے فوارے کے پاس کھڑا تھا اب ایک شراب خانے کے برآمدے میں کھڑا ہاتھوں میں ایک خوبصورت مگ لیے بارش سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ہم کار میں بیٹھنے لگے تو اس نے ہماری طرف دیکھ کر گدگداتا ہوا ہاتھ فضا میں بلند کیا اور مسکرانے لگا۔ یہ بات بے حد حیران کن تھی کہ گرافن میں نے سوائے ایک سپاہی کے جو برف کے تودے کے پاس کھڑا تھا اور اس موٹے دیہاتی کے کسی ذی روح کو نہیں دیکھا۔

واپسی پر صرف اترائی تھی جو زیادہ پرخطر تھی۔ دھند اور بارش کی وجہ سے سڑک بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ کسی موٹر پر دھند زیادہ گہری ہو جاتی تو میں کار سے اتر کر آگے آگے چلنا شروع کر دیتا اور اشارے سے عورت کی رہنمائی کرتا۔ اب تار کی بھی زیادہ ہو چکی تھی اور ابھی ہم برگ سے کافی فاصلے پر تھے۔ میں نے کار کی کھڑکی سے باہر دیکھا سڑک کے ساتھ بائیں ہاتھ پر برف کا ایک عظیم تودہ بالکل جھانک رہا تھا۔ ایک دم زور کا دھماکہ ہوا اور ساتھ ہی عورت نے پوری قوت سے کار کی بریک لگا دی۔ دھماکے کی آواز ابھی تک گونج رہی تھی۔

”ضرور کہیں برف کا تودہ پھسلا ہے۔“ عورت نے دوبارہ کار شارت کرتے ہوئے کہا۔ برگ پہنچ کر اس نے مجھے نشین کے پاس اتار دیا اور خود جینوا جانے والی سڑک پر مڑ گئی۔ میں وہاں سے پیدل کیمپنگ کی طرف آ رہا تھا کہ سرخ گنبدوں والے قلعے پر نظر پڑی پرانا اور آسیب زدہ جیسے بدروحوں کا مسکن ہو۔ ”ٹن ٹن“ ٹاؤن ہال کے گھڑیاں نے نو بجائے اور میں ٹھنک گیا۔ قلعے کی جانب دیکھا تو ایک گنبد دھند میں غائب..... یا وحشت..... مجھے یقین تھا کہ ابھی دروازے میں سے سیاہ چغہ پہنے کاؤنٹ ڈریکولا برآمد ہو جائے گا۔ میرے قدم اور تیز ہو گئے۔ کیمپنگ میں پہنچا تو سب کے درخت کے نیچے میرے اکلوتے خیمے کے علاوہ پورا میدان سنسان پڑا تھا۔ میں ابھی تک اس کیمپنگ میں آنے والا پہلا مسافر ہی تھا۔ مالک اپنا دفتر بند کر کے قصبے کو واپس جا چکی تھی۔ میں کپڑے بدلے بغیر ہی اپنے سونے کے تھیلے میں گھس گیا اور زپ اوپر چڑھا کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

ساری رات عجیب عجیب خواب آتے رہے۔ کبھی گھڑیاں زور زور سے بجتے اور کبھی کھوپڑیاں دھما دھم میرے خیمے پر برستیں۔ ڈر کے مارے سردی کا احساس بھی جاتا رہا۔ صبح اٹھ کر

باہر آیا تو خیمے کے ساتھ کھوپڑیوں کی بجائے ڈھیروں جنگلی سیب بکھرے پڑے تھے جو رات تیز ہوا چلنے سے درخت کی شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر میرے خیمے پر گرتے رہے اور مجھے خواہ مخواہ خوف زدہ کرتے رہے۔ میں نے جلدی سے اپنا خیمہ اکھاڑا اور کپیٹ کر سامان کے تھیلے میں رکھ لیا۔ کیمپنگ کا کرایہ ادا کرنے کے بعد میں سیدھا سٹیشن پر آیا اور سوئٹزر لینڈ کے دارالحکومت برن جانے والی پہلی گاڑی پر سوار ہو گیا۔

برگ سے برن دو گھنٹے کی مسافت پر ہے اور اس دوران گاڑی ایک سرسبز و شاداب وادی کے وسط میں سے گزرتی ہے۔ وادی کے آخری کناروں پر برف پوش پہاڑوں کی قطاریں کھڑی ہیں اور ان کے ساتھ پرسکون نیلی جھیلیں دکھائی دیتی ہیں۔ شیشے کی بڑی کھڑکی سے پرے نیلے سفید اور سبز رنگ اس تیزی سے گزرتے ہیں جیسے کسی رنگین تصویر دار کینڈر کے اوراق خود بخود تیزی سے الٹتے جائیں۔ راستے میں ٹھن اور انٹرلاکن جیسے خوبصورت شہر آتے ہیں۔ ”بنک فرا“ یعنی ”نئی دہن“ کی برف پوش چوٹی کا ایک رخ نظر آتا ہے۔ جھرنوں آبشاروں اور پارے کی مانند چمکتی ندیوں کا تو حساب ہی نہیں۔ زمین کے اس چھوٹے سے ٹکڑے پر قدرتی نظاروں کی بہتات نے اسے لیزیز سٹیشن کو ”پلے گراؤنڈ آف یورپ“ کا نام دینے پر مجبور کر دیا۔ شاید اسے مختصر مصوری کا ایک شاہکار کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ سوئٹزر لینڈ کے حسن میں نفاست کے ساتھ ساتھ معصومیت اور لڑکپن بھی ہے۔ ایسی نفاست جسے انسان نے اپنی تفریح طبع کے لیے ایک خاص منصوبے کے تحت ترتیب دیا ہو، لیکن یہاں وادی بنلم کا وحشی حسن اور نگہیرنا مفقود ہے جہاں انسان قدرتی نظاروں کے مقابلے میں ثانوی حیثیت کا حامل ہو جاتا ہے۔

برن کے سٹیشن پر بے حد گہما گہمی تھی۔ میں ”دفتر معلومات“ سے کیمپنگ کا پتہ دریافت کر کے سٹیشن سے باہر نکلا تو مجھے یاد آیا کہ فرٹز بھی برن میں ہی رہتا ہے۔ کئی سال پیش تر وہ مجھے تیرک میں ملتا تھا جہاں وہ اپنے خاندان کے ہمراہ چھٹیاں گزار رہا تھا۔ کچھ عرصہ تو خط و کتابت جاری رہی مگر چند سالوں سے مجھے اس کے بارے میں کچھ علم نہ تھا کہ وہ برن میں ہی قیام پذیر ہے یا کہیں اور چلا گیا ہے۔ سٹیشن کے ہال میں لگے ہوئے فون بوتھ سے میں نے انکوآری کا نمبر ملایا اور انہیں فرٹز کا پتہ بتا کر اس کے فون نمبر کے بارے میں دریافت کیا۔ نمبر ملنے پر میں نے فون کیا تو

دوسری طرف سے آواز آئی ”کیفر انٹرنیشنل ٹرانسپورٹ“ میں نے سوچا شاید غلط نمبر مل گیا ہے ”یہاں کوئی فرٹز صاحب کام کرتے ہیں؟“ میں نے بے دلی سے پوچھا۔ ”آپ شاید ہماری کمپنی کے ڈائریکٹر سے ملنا چاہتے ہیں۔“ ادھر سے جواب دیا گیا۔ ”فون انہیں ملا دیں تو پھر پتہ چلے گا۔“ مجھے یقین تھا کہ فرٹز جیسا الابا لی نو جوان نودرات کی دکان تو کامیابی سے چلا سکتا ہے مگر کسی ٹرانسپورٹ کمپنی کا ڈائریکٹر؟ ناممکن

”فرٹز کیفر بول رہا ہوں۔“ فون میں سے آواز آئی۔

میرا اندازہ غلط تھا فرٹز واقعی برن کی سب سے بڑی ٹرانسپورٹ کمپنی کا مالک تھا۔ ”کہاں سے بات کر رہے ہو؟ شیشن سے؟ تو پھر وہیں ٹھہرو میں آ رہا ہوں۔“ اس نے جلدی سے کہا اور فون بند کر دیا۔ میری آمد پر اس نے قطعاً حیرت کا اظہار نہ کیا۔ تھوڑی دیر میں فرٹز اپنی کار میں آ گیا اور بڑی گرمجوشی سے ملا ”کہاں سے آ رہے ہو؟ کتنی دیر ٹھہرو گے؟ میں نے دفتر سے فون کر کے تمہارے لیے ہوٹل میں کمرہ مخصوص کروا دیا ہے“ اس نے ایک ہی سانس میں لاتعداد سوال پوچھ ڈالے۔

”برگ سے۔ تین روز۔ میں ہوٹل کی بجائے کیمپنگ میں ٹھہرنا پسند کروں گا“ میں نے بھی سلسلہ وار جوابات دے دیئے۔

”تم شاید اخراجات سے گھبراتے ہو“ اس نے تیزی سے کہا۔ ”اس کی فکر مت کرو۔ ہوٹل کا کرایہ میری کمپنی ”تفریحی بجٹ“ کے کھاتے میں ڈال دے گی۔ یہ بجٹ اگر ہم خرچ نہ کریں تو ویسے ہی ٹیکس کی صورت میں حکومت کے خزانے میں چلا جاتا ہے۔“

مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ کیمپنگ کے دوران سخت زمین پر سونے کے بعد ایک صاف ستھرے نرم بستر پر دراز ہونے کا خیال بے حد خوش آئند تھا۔

ہوٹل برن کی مشہور سڑک ”مارک گاسے“ میں واقع تھا۔ صدر دروازے کے باہر لمبے کوٹ اور بوتائی میں ملبوس ایک دربان نے آگے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا۔ میں نے اپنا دھول سے اٹا ہوا سامان کا تھیلہ اس کے ہاتھوں میں تھما دیا اور ہم دونوں ہوٹل کے اندر چلے گئے۔ ”تم جلدی سے تیار ہو جاؤ میرے والدین اور چھوٹی بہن تم سے ملنے کے لیے بے چین ہیں۔ تمہیں ٹیلیا تو یاد ہے نا؟“ ہم کمرے میں پہنچے تو فرٹز نے دربان کو بخشیش دے کر دروازہ بند کر دیا۔ ”شاید تم نے

ناہیں ٹیلیا یاد ہے نا؟“ اس نے میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر دوبارہ کہا۔ دراصل میں ٹیلیا کو ہی یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور پھر یکا یک میری نظروں میں آج سے کئی برس پیشتر کی ایک پسے قد لڑکی گھوم گئی۔ کالے بال۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ بالکل سوس نہ لگتی تھی۔ بلا کی پھرتیلی اور عجائبات و نوادرجع کرنے کی شوقین۔ پیرس میں سارا وقت فلی مارکیٹ کے کھوکھوں میں الابا ڈھونڈتے گزرتی۔ ”ٹیلیا کو بھلا کون بھلا سکتا ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”کیسی ہے وہ؟“

”قدرے موٹی ہو گئی ہے۔ دو ماہ کے لیے شادی شدہ بھی رہی ہے اور اب میری بڑس پارٹنر بھی ہے۔“

”ٹیلیا اور شادی شدہ؟“ میں نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں سسلی کے ایک نواب گھرانے کے صاحبزادے پر فدا ہو گئی تھیں محترمہ۔ دوروز اکٹھے کھانے پر گئے اور تیسرے دن ناشتے سے پہلے شادی رچا لی۔“

”پھر علیحدگی کیسے ہو گئی؟“

”ٹیلیا کو سسلی پسند نہیں آیا۔ کہتی ہے وہاں گرد اور گرمی بہت ہے۔ بہر حال تم جلدی سے نہالو، میں تمہاری تاریخ کی کتابوں کی ورق گردانی کرتا ہوں۔“ اس نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ ”کاروبار میں پڑھنے لکھنے کی عیاشی کا موقع کم ہی ملتا ہے۔“ فرٹز کی سرخ آنکھیں اور چہرے کی تھکن بتا رہی تھی کہ کام کی زیادتی کی وجہ سے اسے سونے کی عیاشی کا موقع بھی کم ہی ملتا تھا۔

میں تو لیا لے کر غسل خانے میں گیا تو وہاں درجنوں صابن اور جھانوائے پڑے تھے۔ ایک کونے میں تولیوں کا ایک بندل رکھا تھا۔ میں نے اپنا تولیہ باہر پھینک دیا اور دروازہ بند کر کے نلکی کی ٹونٹی کھول دی۔ گرم پانی کی دھار نے برگ کے طوفانی تودوں کی خنکی اور سرد ہواؤں کا اثر جسم سے نچوڑ کر رکھ دیا۔

ہوٹل سے نکل کر ہم سیدھے فرٹز کے دفتر پہنچے۔ دفتر کی جدید سہ منزلہ عمارت کی آخری منزل پر وہ اپنے خاندان کے ساتھ رہائش رکھتا تھا۔ اس کے والدین بے حد خلوص کے ساتھ پیش آئے۔ ٹیلیا میں بالکل کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی سوائے اس کہ وہ اب عینک لگاتی تھی اور صرف یورپی معیار کے مطابق قدرے موٹی ہو گئی تھی۔ وہ کمرے کے ایک کونے میں بیٹھی بڑی سنجیدگی سے اپنے سینے کو کوئی کاروباری خطوط لکھوا رہی تھی۔ میرے ”ہیلو“ کہنے پر اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے

ہاتھ ہلا دیا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

رات کو فرزند اور میں برن سے چند میل کے فاصلے پر ایک ریستوران میں گئے۔ دریا کے کنارے لگی ہوئی میزوں کے گرد شام کے لباس میں ملبوس بے شمار مرد اور عورتیں کھانا کھا رہے تھے۔ ماحول بے حد سنجیدہ اور اکتادینے والا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے لوگ وہاں صرف کھانے کی خاطر آتے ہیں اور انہیں دریا اور ساتھ والے گھنے جنگل سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ انہیں ایک دوسرے سے بات چیت کرنا بھی گوارہ نہ تھا۔ ایک نہایت سنجیدہ اور کرجت قسم کی ویٹرس نے ہمارا آرڈر لیا اور بچوں کے بل گھوم کر بغیر مسکرائے واپس چلی گئی۔

”یہ برن کا سب سے مہنگا اور بہترین ریستوران ہے لیکن یہاں زندگی مقفود ہے۔ صرف امیر ترین لوگ ہی یہاں کی قیمتوں کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ ان کمبائنوں کی شکلیں تو دیکھو دنیا جہاں سے اکتائے ہوئے کرجت چہرے۔“ فرزند پر لوزان انگوروں سے بنی ہوئی شراب کا اثر ہو رہا تھا جو اس نے وہاں آتے ہی پینی شروع کر دی تھی۔

”اگر تمہیں یہ جگہ پسند نہیں تو یہاں آنے کی کیا ہمت ہے؟“ میں نے دشی واٹر کی چسکی لگاتے ہوئے پوچھا۔

”کسی چھوٹے ریستوران میں کھانا کھاتے دیکھا جاؤں تو میرا کاروبار آدھا ہو جائے، مجبوری ہے۔“

کھانے کے دوران فرزند ایک بوتل اور پی گیا۔

”جتنی میں پی چکا ہوں۔“ اس نے تلی ہوئی مچھلی کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا ”اس کجٹ مچھلی کو میرے پیٹ میں تیرنا چاہئے۔“

”بالکل“ میں نے ہنسنے کا کام کوشش کی۔ دراصل میں فرزند کے اچھے برتاؤ کے باوجود اس کی رفاقت سے سخت اکتا چکا تھا۔ وہ اس ریستوران میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں سے بالکل مختلف نہ تھا۔ اس کے چہرے پر بھی تھکن اور اکتاہٹ کے آثار تھے۔ کھانا کھاتے وقت اس کا ذہن بھی کاروبار کی پیچیدہ گتھیوں میں الجھا ہوا تھا۔

”اوہو میں تو بھول ہی گیا تھا۔“ اس نے چھری کا نا میز پر رکھ کر جیب میں سے ڈائری نکال کر ورق پلٹنے شروع کر دیئے۔ ”بالکل بھول گیا تھا۔ مجھے کل ایک شپنگ آرڈر کے سلسلہ میں

مارسبز جانا ہے۔ میں ٹیلیا سے درخواست کروں گا کہ وہ تمہیں برن کی سیر کرائے۔ پلیز برا نہ ماننا مجبوری ہے۔“ اس نے ڈائری جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ اس کی یہ مجبوری کم از کم میرے لیے نہایت خوشگوار تھی۔

دوسری صبح میں ابھی سو رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجنی شروع ہو گئی۔

”ہیلو“ میں نے جمائی لے کر چوٹنگے میں کہا ”مستضر بول رہا ہوں“

”گڈ لارڈ۔“ دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز آئی۔ ”تم ابھی تک سو رہے ہو۔ فرزند

نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہیں برن کی سیر کے لیے صبح سویرے ہی لے جاؤں۔ فوراً تیار ہو کر نیچے ڈیسک پر آ جاؤ۔ میں انتظار کر رہی ہوں۔“ ٹیلیا کا لہجہ اتنا نپا تلا تھا جیسے کوئی کاروباری تارکھواری ہو۔ میں کپڑے بدل کر نیچے گیا تو وہ ڈیسک کے ساتھ ٹیک لگائے اخبار پڑھ رہی تھی۔

”مجھے افسوس ہے کہ تمہیں انتظار کرنا پڑا۔“ میں نے معذرت کی۔

”تقریباً ساڑھے بارہ منٹ“ اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا اور مجھ سے بالکل

مردوں کی طرح ہاتھ جھٹک کر مصافحہ کیا۔

ہم ہوٹل کے باہر آئے جہاں فٹ پاتھ کے ساتھ اس کی سفید مرسدیز کار کھڑی تھی۔ اگرچہ آٹھ بج چکے تھے مگر کھر کی وجہ سے شام کے دھندلکے کا گمان ہوتا تھا۔ سڑک اور دکانوں کے شوکیسوں کی روشنیاں ابھی تک جل رہی تھیں۔ ٹیلیا نے سرخ آونی لباس پہن رکھا تھا اور وہ تقریباً خوبصورت ہی لگ رہی تھی۔ میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ عینک نہیں پہن رکھی۔ میرے پوچھنے پر کہنے لگی ”کار چلاتے وقت میں عینک نہیں پہن سکتی۔ اتنی ساری ٹریفک نظر آتی ہے کہ میں بوکھلا جاتی ہوں۔“ وہ کار نہایت تیز چلا رہی تھی۔ شاید عینک کے بغیر اسے پوری سڑک بالکل خالی لگ رہی تھی۔

”ریچھ“ برن کا امتیازی نشان ہے اور اگر اسے ”ریچھوں کا شہر“ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ ہوٹلوں، دکانوں اور بڑے چوک میں جھنڈے لٹک رہے ہیں تو ان پر ریچھ کی تصویر، دریا کے کنارے کلیسا کے نورے کے گرد ریچھوں کے مجتھے اور پھر نائیڈک پل کے پاس ایک گڑھے میں سچ مچ کے جیتے جاگتے درجنوں ریچھ جنہیں اہل شہر دن رات ابلا کھلاتے رہتے ہیں۔ یہ شہر

1848ء میں ملک کا صدر مقام قرار پایا۔ وہ دن اور آج کا دن اس کی ہیئت میں قطعاً کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ شہر کے افقی خطوط پر آپ کی نظریں جدید وضع کی ہونے کی عمارتیں دیکھ کر دکھنے نہیں لگتیں بلکہ یوں گمان ہوتا ہے جیسے ملک کے صدر مقام کی بجائے کسی پرسکون پہاڑی قصبے میں آئے ہوں۔ اب بھی ہر چوک میں پرانی وضع کے خوبصورت فوارے اور تل موجود ہیں جہاں آب رسانی کی جدید سہولتیں مروج ہونے سے پہلے شہر کی عورتیں نہانے دھونے کے علاوہ گھریلو استعمال کے لیے پانی بھرنے بھی آیا کرتی تھیں۔ پرانے بازاروں میں دکانیں سڑک سے اونچی ہیں اور ان کے ساتھ لمبے برآمدے ہیں جہاں ایک زمانے میں صرف شاہی خاندان کے افراد کو چلنے کی اجازت تھی۔ عوام کے لیے نشیبی سڑک تھی۔ پورے سوئٹزرلینڈ میں اور خاص طور پر برن میں یہ رواج ہے کہ ہر مکان یا فلیٹ کی کھڑکی میں لکڑی کے سفید مستطیل چوکھٹوں میں مٹی اور کھاد ڈال کر جرنیم کے سرخ پھول اگائے جاتے ہیں۔ ایک خصوصی سوس طرز کے مکان کی کھڑکی کا تصور ان سرخ پھولوں کے بغیر ممکن نہیں۔ موسم بہار میں پھول صرف گھریلو باغیچوں اور باغوں میں ہی نہیں کھلتے بلکہ شہر کی ہر کھڑکی سے جھانک رہے ہوتے ہیں۔

پونے بارہ بجے ٹیلیانے کارکارخ بڑے گھنٹہ گھر کی جانب موڑ دیا جہاں بے شمار سیاح منہ اٹھائے گھڑیاں کو دیکھ رہے تھے۔

”بارہ بجے یہاں تماشہ ہوتا ہے“ ٹیلیانے کار سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

بارہ بجے تو گھڑیاں کے پہلو میں ایک کھڑکی کھلی۔ لکڑی کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے رینچھ نکلے اور ٹن ٹن کی آواز پر سر ہلاتے پورا چکر کاٹ کر پھر کھڑکی میں غائب ہو گئے۔ ان کے بعد مرغ، مرغیاں اور موٹے پادری آئے اور تماشہ دکھا کر گھڑیاں کے اندر چلے گئے۔ بچوں نے خوش ہو کر تالیاں بجانیں۔ کھیل ختم پیسہ ہضم۔

”یہ گھڑیاں 1517ء میں تعمیر ہوا تھا۔“ ٹیلیانے کار سٹارٹ کی اور ہم فیڈرل پبلس کے چوک میں آ گئے۔ اندر گئے تو معلوم ہوا کہ سوس پارلیمنٹ کا اجلاس ہو رہا ہے اس لیے سوئٹزرلینڈ کے اکلوتے جنگی ہیرو ”ولیم ٹیل“ کا مجسمہ دیکھا اور باہر آ گئے۔

اسی شام ٹیلیانے مجھے اپنے فلیٹ میں کھانے پر مدعو کیا۔ فلیٹ کیا تھا پورا عجائب گھر تھا۔ دیواروں پر افریقہ کے قبائلی دیوتاؤں کے قد آدم مجسمے، مصری فراعنہ کی شبیہیں، مراکوکا بنا ہوا

چمڑے کا فرنیچر، سرخ ایرانی قالین، ڈریز ڈن کے چھینی ظروف ڈماسک کے میز پوش، بل فائٹنگ کی درجنوں تصاویر اور پھر بے شمار ساکن اور خاموش گھڑیاں، ایک کونے میں ہاتھی دانت کی میز پر مختلف ملکوں کی موسیقی کے ریکارڈ رکھے تھے۔ یہاں تک کہ غسل خانے میں چکیو سلاو یکیا کا بلورین فانوس لٹک رہا تھا۔ ٹیلیانے فلیٹ پر نوادرات کی دکان کا شائبہ ہوتا تھا۔

”کاروبار کے سلسلے میں مجھے اکثر ملک سے باہر جانا پڑتا ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ مجھے شروع سے ایسی چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے۔“ اس نے اپنا کوٹ اتار کر دیوار پر آویزاں ہرن کے سینگوں پر ٹانگ دیا۔ ”تم یہاں بیٹھو میں کھانا گرم کر کے لاتی ہوں۔“ اس نے باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ باورچی خانے میں بھی ایک فانوس لٹک رہا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم دیر تک موسیقی سنتے رہے۔

”میں سارا دن مشین کی طرح کام کرتی ہوں۔“ ٹیلیانہ کہہ رہی تھی۔ ”دفتر سے واپسی پر صرف موسیقی ہی مجھے سکون پہنچاتی ہے اور وہ بھی خالصتاً مشرقی موسیقی۔ سب سے پہلے ہم نے رومانیہ کی لوک دھنیں سنیں جن میں مشرقیت جھانکتی اور چلی جاتی۔ پھر مشرق وسطیٰ کے نغمے، عبدالوہاب کی ترتیب دی ہوئی موسیقی پر عبدالحلیم حافظ اور فیروزہ کی تانیں۔ ایران کا پیراہن گل۔ آخری نغمے نے مجھے چونکا دیا۔“ جب سے گئے پیالا گے تاہیں اکھیاں“ نور جہاں نغمہ سرا تھی۔

”تمہیں بھی نور جی ہاں پسند ہے۔“ ٹیلیانے پوچھا۔

”صرف پسندیدگی تو نہایت عام سا جذبہ ہے۔“ میں نے ہنس کر جواب دیا۔ اجنبی ماحول میں اس جانی پہچانی آواز نے وطن سے دوری کا احساس اور بھی شدید کر دیا۔

”مجھے اب چلنا چاہئے۔“ میں نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میرا ارادہ ہے کہ میں کل صبح جرمنی کے لیے روانہ ہو جاؤں۔“

”میں تمہیں ہوٹل تک چھوڑ آتی ہوں۔“ اس نے میز پر سے کار کی چوبیاں اٹھائیں اور عینک اتار کر جیب میں رکھ لی۔ ہوٹل کے صدر دروازے کے باہر کار سے اترتے وقت میں نے ٹیلیانہ کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا۔ وہ اب بھی کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی جو یقیناً کاروباری تھی۔

جاؤں۔ چنانچہ ان کے مشورے کے مطابق فرائی برگ شیش سے ٹرام پر سوار ہو کر میں اس قصبے میں پہنچ گیا جس کا نام بد قسمتی سے میرے ذہن سے اتر چکا ہے۔ قصبے کی کیمپنگ جنگل کے دامن میں تھی۔ میں ایک کونے میں اپنا خیمہ نصب کر کے قصبے کی سیر کو نکل گیا۔

اس چھوٹی سی دیہی آبادی کی خصوصیت اس کے دیدہ زیب مکان تھے جو زیادہ تر پنشن یافتہ فوجی افسروں اور متول بوڑھوں کی ملکیت تھے۔ ان کے مکین شہر کے شور و غوغا سے تنگ آ کر اس پرسکون ماحول میں زندگی کے آخری ایام گزارنے چلے آئے تھے۔ مکانوں کے گرد باڑھ کی غیر موجودگی میں پوری عمارت اور ملحقہ باغیچے سڑک پر سے نظر آ رہے تھے۔ ہر مکان کا طرز تعمیر منفرد تھا اور باغیچے کی سجاوٹ میں قرینہ اور نفاست پسندی، ایک ایک پتہ اپنی جگہ پر تھا۔ اس قصبے کے تمام مکان جرمن تنظیم کی بھرپور مثال تھے۔ آبادی کے بچوں بچ ایک چھوٹی سی پرسکون ندی بہ رہی تھی جس پر لوہے کی سلاخوں کے ننھے منے پل بنے ہوئے تھے۔ میں ایک پل پر سے گزرا تو وہاں ندی کی سطح قدرے بلند ہونے کی وجہ سے میرے پاؤں بھیگ گئے۔

پلوں کے ساتھ پانی کی سطح کے قریب پرانی پن چکیاں رواں تھیں۔ جہاں قصبے کی آبادی ختم ہوتی تھی وہاں سے جو کے کھیت شروع ہو جاتے تھے۔ کھیتوں سے پرے بلیک فارسٹ تھا۔ میں ایک تنگ گڈنڈی پر ہولیا۔ میرا رخ جنگل کی طرف تھا۔ جو کے پودوں کا سنہری رنگ جنگل کے گہرے سیاہ پس منظر سے اور بھرپور ہو گیا تھا۔ آج صبح سے ہی آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور جنگل کے کنارے تک پہنچتے پہنچتے اب بارش بھی شروع ہو گئی۔ میں نے بھاگ کر ایک اونچے اور گھنے درخت کے تلے پناہ لی۔ مجھے اب معلوم ہوا کہ اس جنگل کو ”بلیک فارسٹ“ یعنی ”کالا جنگل“ کیوں کہا جاتا ہے۔ یہاں پر درخت اتنے بلند اور گھنے ہیں کہ سورج کی روشنی زمین تک پہنچنے ہی نہیں پاتی اور آپس میں گتھی ہوئی شاخوں اور پتوں میں ہی انگی رہتی ہے۔ اس طرح جنگل کے اندرونی حصوں میں دن کو بھی شب کی سیاہی کا گماں ہوتا ہے۔ بادلوں کی وجہ سے اب تاریکی اور بھی گہری ہو گئی تھی۔ بارش قدرے کم ہوئی تو میں واپس کیمپنگ میں آ گیا۔

دوسری صبح میں فرائی برگ شہر سے باہر فرینکلن فورٹ جانے والی عظیم شاہراہ ”آٹو بہان“ کے کنارے لفٹ کے انتظار میں کھڑا تھا۔

فرینکلن فورٹ کا کبڑا بوڑھا

صنعتِ دوا سازی کی نسبت سے مشہور شہر باسل کے شیش پر تھوڑی دیر رکنے کے بعد اب ہماری گاڑی جرمن سرحد کی طرف جارہی تھی۔ میں نے برن سے فرائی برگ تک کا ٹکٹ کٹا لیا تھا۔ فرائی برگ جرمنی کے خوبصورت ترین علاقے بلیک فارسٹ کا سب سے بڑا شہر ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ میں ایک دو روز بلیک فارسٹ کے کسی چھوٹے سے قصبے میں ٹھہروں اور پھر وہاں سے فرینکلن فورٹ چلا جاؤں۔ اس سے پہلے میرے ذہن میں بقیہ سفر کے بارے میں مبہم سا خاکہ تھا جو اب آہستہ آہستہ واضح ہوتا جا رہا تھا۔

”ابھی موسم بہار کا آغاز ہے جو جرمنی، ڈنمارک اور سویڈن میں بسر ہو جائے گا“ میرے ذہن میں یورپ کا نقشہ ابھر آیا ”ناروے اور وہاں سے واپسی پر ہالینڈ، بلجیم اور ولایت کے لیے موسم گرما کافی ہوگا اور پھر خزاں کا موسم فرانس اور سپین میں گزرے گا۔“

میں چاہتا تھا کہ کہ یورپ میں سخت سردی شروع ہونے سے پہلے ہی وطن لوٹ جاؤں۔ نقل وطن کرنے والے ان پرندوں کی مانند جو سردیاں شروع ہوتے ہی واپس آبائی وطن کو پرواز کر جاتے ہیں۔

گاڑی سوئٹزر لینڈ کی سرحد عبور کر کے اب جرمنی اور فرانس کی سرحد پر جارہی تھی۔ یہاں پر گاڑی کی پٹری کئی میل تک دونوں ملکوں کی سرحد کا کام دیتی ہے۔ میرے ڈبے میں چند جرمن طالب علم بھی سوار تھے انہوں نے مجھے بتایا کہ اگر مجھے بلیک فارسٹ کا حسین ترین حصہ دیکھنے کا اشتیاق ہے تو فرائی برگ سے بارہ میل کے فاصلے پر ایک نہایت ہی خوبصورت قصبے میں چلا

”ہم آدھ گھنٹے میں فرینکلورٹ پہنچنے والے ہیں۔“ جرمن نے بتایا ”لیکن رات کے

اس پہر تمہیں ہوٹل کی تلاش میں بے حد دشواری ہوگی۔“

بارش ایک دم تیز ہو گئی اور کار کے وائپر بڑی تیزی سے وینڈسکرین پر حرکت کرنے لگے۔ آسان پہنچ سکتی تو چوڑی آٹو بہان کی گیلی سٹح روشن ہو جاتی۔

”آپ مجھے شہر کے باہر ہی اتار دیجیے گا۔ شب ب سری کے لیے میرے پاس خیمہ موجود

ہے۔“

”اس بارش میں کیہ پیگ؟“ جرمن کی بیوی نے انگوٹھے سے کار کی چھت کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے کہا جس پر چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔

”تم اگر پسند کرو تو ہم تمہیں ہنوور تک لے جاسکتے ہیں۔“ جرمن نے پیش کش کی۔

”آپ کا بہت بہت شکریہ۔“ میں نے تھیلے میں سے برساتی نکالتے ہوئے کہا۔ ”بس

مجھے یہیں کہیں اتار دیجئے۔“

انہوں نے کار سڑک کے کنارے کھڑی کر دی اور مجھے اتار دیا۔ میں نے برساتی کے

بٹن بند کر کے کار اوپر کر لیا اور حالات کا جائزہ لیا۔ آٹو بہان پر مکمل تاریکی تھی۔ دور سے کوئی کار

آتی تو بارش کی بوندیں روشنی میں چمکتیں۔ کار گزرنے پر پھر اندھیرا چھا جاتا۔ سڑک کے ساتھ نیچے

مجھے ہموار جگہ نظر آرہی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہیں خیمہ لگا کر رات بسر کر لی جائے اور صبح ہونے پر

ہی شہر جایا جائے۔ میں سڑک کے اونچے کنارے سے اتر کر کھیتوں میں چلا گیا۔ یہاں بھی تاریکی

کی وجہ سے ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک دفعہ بجلی چمکی تو میں نے اندازہ لگایا کہ یہاں

جگہ ہموار ہے اس لیے خیمہ بخوبی نصب کیا جاسکتا ہے۔ میں نے سفری تھیلے میں سے خیمہ نکال کر

زمین پر بچھا دیا اور اس کے کونوں میں میخیں گاڑنے لگا۔ ابھی بمشکل خیمے کا ایک حصہ نصب ہوا تھا

کہ مجھ پر ایک کار کی تیز روشنیاں پڑیں۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو عین سامنے ایک کار تیزی سے

میری طرف آرہی تھی۔ کار کی چھت پر سرخ روشنی کا ایک گولہ تیزی سے گھوم رہا تھا۔ میں نے میخیں

ٹھونکنے والا ہتھوڑا مضبوطی سے ہاتھ میں تھام لیا اور کھڑا ہو گیا۔ کار ایک زوردار جھٹکے سے میرے

خیمے کے پاس آ کر رک گئی۔ دونوں دروازے چوٹ کھل گئے اور دو لمبے تڑنگے جرمن فوجی باہر

نکل آئے۔ ان کے کولہوں پر لٹکے ہوئے پستولوں کے ہینڈل کار کی روشنیوں میں چمک رہے

استنبول سے اطالیہ اور سوئٹزر لینڈ تک ریل کے ہوشربا کرایوں نے میرے سفری بجٹ کو خاصے چر کے لگائے تھے۔ اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب جہاں تک ممکن ہو سکے، چچ ہائیٹنگ پر ہی انحصار کیا جائے۔ خاص طور پر جرمنی میں جو اس ذریعہ سفر کے لیے نہایت موزوں ہے لیکن اُس روز جرمنوں کی روایتی ”لفٹ نوازی“ اپنے عروج پر نہ تھی۔ صبح سے دو پہر ہو گئی لیکن کسی کاریٹرک ڈرائیور نے میرے لیے رکنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ میں نے سامان کے تھیلے سے دودھ اور ڈبل روٹی نکالی اور سڑک سے پرے گھاس پر بیٹھ کر دودھ پھر کے کھانے کی تیاری کرنے لگا۔ میں اپنا سامان سڑک کے کنارے پر ہی چھوڑ آیا تھا۔ ڈبل روٹی پر مکھن اور پنیر کی تہ ہمارے میں نے ابھی پہلا والہ ہی منہ میں ڈالا تھا کہ ایک کار میرے سامان کے قریب آرکی اور ڈرائیور نے میرا اتنا پتہ معلوم کرنے کے لیے زور زور سے ہارن دینا شروع کر دیا۔ ایک ہاتھ میں ڈبل روٹی اور دوسرے میں دودھ کی بوتل اٹھائے میں بھاگتا ہوا واپس سڑک پر پہنچ گیا۔

”کہاں چلو گے؟“ ڈرائیور کی نشست پر بیٹھے نوجوان جرمن نے پوچھا۔ ساتھ والی نشست پر اس کی بیوی براجمان تھی۔

”فرینکلورٹ“ میں نے پرامید نظروں سے جرمن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے سر کی خفیف جنبش سے مجھے کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے ڈبل روٹی میں سے پنیر نکال کر کھا لیا اور ڈبل روٹی پھینک دی اور پھر دودھ کی بوتل ایک ہی سانس میں پی گیا۔ جرمن جوڑا میرے اس پھر تیلے لٹچ سے بے حد محفوظ ہو رہا تھا۔ رومال سے منہ پونچھنے کے بعد میں نے اپنا سفری تھیلہ کار کی پچھلی نشست پر رکھا اور کار میں بیٹھ گیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ ہسپانیہ میں چھٹیاں گزارنے کے بعد واپس ہنوور جا رہے ہیں جہاں وہ دونوں کسی امریکی ادارے میں ملازم ہیں۔ ہائیڈل برگ پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ دریائے نیکر کے دیدہ زیب پل پر سے گزرتے تو نیچے پانی میں شفق کی سرخی اتری ہوئی تھی۔ دریا کے کنارے بے شمار لوگ چہل قدمی میں مصروف تھے۔ ان میں اکثریت ان طلباء کی تھی جو مقامی یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے۔ پرانے قلعے کے پہلو میں اور دریائے نیکر کے کنارے ہائیڈل برگ کا شہر پھیلا ہوا تھا جس کی مدح میں علامہ اقبال نے نظمیں لکھیں اور جہاں کی ایک گلی حال میں ہی شاعر مشرق کے نام موسوم کی گئی ہے۔ ہائیڈل برگ کے بعد جب مائن ہام آیا تو رات ہو چکی تھی۔ اب بارش بھی شروع ہو گئی۔

تھے۔ دونوں نے اکڑوں کھڑے ہو کر مجھے سیلوٹ کیا اور پھر جرمن میں کچھ کہا۔

”میں جرمن نہیں سمجھتا۔ ڈش ننگ سپرزنے“ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

”سپیک انگلش“ ایک نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”آپ اپنا خیمہ یہاں نصب نہیں کر سکتے۔ ممنوع۔ فار بودن۔“

”لیکن وہ کیوں!“

”وہ اس لیے کہ یہ امریکی فوج کی شوٹنگ گراؤنڈ ہے۔ کل صبح سویرے چاند ماری شروع ہو جائے گی۔ بینگ! بینگ! سمجھ گئے؟“ اور دونوں نے ہنسا شروع کر دیا۔

”بالکل سمجھ گیا۔“ میں نے ہکلاتے ہوئے کہا اور کانپتے ہاتھوں سے خیمہ پلیٹنا شروع کر دیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ فوجی پولیس کے ان جوانوں نے مجھے خطرے سے آگاہ کر دیا تھا ورنہ دوسرے روز منہ اندھیرے میرا چھوٹا سا خیمہ بڑے منہ والے امریکیوں کو کہاں نظر آتا۔ بس سب کچھ بینگ بینگ ہو جاتا۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں مجھے سڑک سے نیچے اترتے اور زمین میں کچھ کھودتے دیکھ کر شک ہو ا تھا خاص طور پر جب کہ میری شکل و شبہت غیر ملکی تھی۔ بہر حال انہوں نے پیش کش کی کہ وہ مجھے کار میں شہر تک لے جائیں گے اور وہاں میرے لیے مناسب رہائش کا بندوبست کر دیں گے۔ ایک فوجی نے میرا سامان اٹھا کر کار کی ڈکی میں رکھ دیا اور ہم شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ رات کے اس پہر شہر بالکل سنانا پڑا تھا سوائے شراب خانوں سے واپس لوٹتے ہوئے ڈھت بوڑھوں کے جو سڑک کے پتھوں بیچ لڑکھڑاتے ہوئے گلا پھاڑ پھاڑ کر گانے گارہے تھے۔ اکا دکا کار یا ٹیکسی کے علاوہ سڑکیں بھی خالی پڑی تھیں۔

”تم کس قسم کے ہوٹل میں ٹھہرنا پسند کرو گے؟“ کار چلانے والے فوجی نے مڑ کر مجھ سے دریافت کیا۔

”جس قسم کے ہوٹل میں کرایہ پانچ مارک سے زیادہ نہ ہو۔“ میں نے جواب دیا۔

انہوں نے متعدد ہوٹلوں کے باہر کاررو کی لیکن اکثر میں یا تو جگہ نہ تھی اور بیشتر میرے کرائے کی حد پھیلاؤ جاتے۔ کافی دیر ادھر ادھر گھومنے کے بعد انہوں نے کار ایک تاریک گلی کے فٹ پاتھ کے کنارے کھڑی کی اور ایک فوجی نیچے اتر کر گلی کے اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ مسکراتا ہوا واپس آیا اور مڑہ سنایا کہ ہوٹل کا انتظام ہو گیا ہے۔ کرایہ صرف تین مارک ”میرے ساتھ چلے

آؤ“ میں نے سامان اٹھایا اور اس کے پیچھے ہولیا۔ گلی کے کونے میں لکڑی کا ایک کھوکھا دکھائی دیا جس کے کواڑوں میں سے روشنی باہر آ رہی تھی۔ اندر ایک کپڑا بوڑھا لائین کی روشنی میں میز پر بھکا ایک رجسٹر پر کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ فوجی نے بوڑھے کو جرمن میں کچھ ہدایات دیں اور پھر مجھ سے ہاتھ ملا کر واپس چلا گیا۔ میں کچھ دیر تو وہاں کھڑا انتظار کرتا رہا کہ کب یہ بوڑھا میری طرف متوجہ ہو اور مجھے بتائے کہ رہائش کا بندوبست کہاں کیا گیا ہے مگر وہ میری موجودگی سے بے خبر رجسٹر پر بھکا لکھتا رہا۔

”ہو، ہوٹل بڑے میاں؟“ میں نے اکتا کر اس کی میز بجائی، لیکن وہ بدستور رجسٹر پر بھکا رہا۔ تھوڑی دیر اور انتظار کرنے کے بعد میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں بے حد تھک چکا تھا۔ اور جلد از جلد کسی آرام دہ بستر پر سو جانا چاہتا تھا۔

”نو ہوٹل۔ آئی گو“ میں نے غصہ میں کہا اور سامان کا تھیلہ اٹھا کر کمرے سے باہر جانے لگا۔

”ہوٹل۔ یاہ یاہ“ بوڑھے نے رجسٹر بند کیا۔ لائین اٹھائی اور کھوکھے کو مقفل کر کے مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ باہر بارش تھم چکی تھی۔ میں تھکے قدموں سے بوڑھے کپڑے کے پیچھے چلنے لگا جو رجسٹر بغل میں دبائے لائین ہلاتا آہستہ آہستہ میرے آگے چلا جا رہا تھا۔ گلی کے آخر میں ایک پرانا خستہ حال مکان آیا۔ بوڑھے نے پاؤں کی ٹھوک سے مکان کا زنگ آلود بیرونی دروازہ کھولا اور ایک ویران باغیچے میں سے چلتا ہوا صدر دروازے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ لائین میزھیوں پر رکھ کر اس نے کوٹ کی جیب سے چابیوں کا ایک بھاری گچھا نکالا اور دروازے کا تالا کھول کر مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ پورا مکان تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اندر پہنچنے پر بوڑھے نے کچھ دیر وہاں کھڑے ہو کر اپنا سانس درست کیا اور پھر بائیں ہاتھ پر نیچے تہ خانے کو جاتی ہوئی میزھیوں پر آہستہ آہستہ اترنے لگا۔ میزھیوں کے خاتمے پر ایک چھوٹی سی تاریک راہداری آئی جہاں کھڑے ہو کر بوڑھے نے لائین زمین پر رکھ کر پھر چابیوں کا گچھا جیب سے نکالا اور تہ خانے کا دروازہ کھول کر میری طرف دیکھتے ہوئے عجیب طریقے سے مسکرایا۔ ”ہوٹل۔ تین مارک“ اور ساتھ ہی لائین زمین سے اٹھا کر دروازے کی طرف اشارہ کر کے مجھے اندر جانے کو کہا۔ میں دروازہ کھول کر اندر جانے لگا تو اس نے ایک دم میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں ٹھٹک کر پیچھے

نکلی تری تلاش میں
رات دس مارک میں پڑی۔

مڑا۔ ”تین مارک“ اس نے بڑے خوفناک لہجے میں کرایہ طلب کیا۔ میں نے سامان کا تھیلا کندھے سے اتار کر زمین پر رکھا اور جیب سے تین مارک نکال کر بوڑھے کے حوالے کر دیئے۔ اس نے تینوں سکے احتیاط سے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیے اور لائین اٹھا کر واپس اوپر چلا گیا۔ میں دروازہ کھول کر اندر گیا۔ ایک بوسیدہ اور تنگ تہ خانے کی چھت سے زیرو طاقت کا ٹھنڈا ہوا بلبل لٹک رہا تھا۔ تہ خانے کے آدھے حصے میں چھت تک کوئلے کا انبار تھا اور بقیہ آدھے حصہ میں پہلو بہ پہلو پانچ چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں جن پر غلیظ قسم کے بوڑھے جرمن سو رہے تھے۔ ان کے درمیان میں ایک چار پائی خالی تھی اور اس پر ایک بچھی ہوئی گندی چادر بچھی تھی۔ یہ میرا تین مارک کا ہوٹل تھا۔

”ہیلو بلیک بوائے“ ساتھ والے بستر پر لیٹے بوڑھے نے اپنی خمار آلود آنکھیں کھول کر مجھے خوش آمدید کہا۔ تہ خانے میں کوئلے کی مہک کے علاوہ ایک ناخوش گوار اور تیز قسم کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا دم گھسنے لگا ہو اور میں تہ خانے سے باہر آ گیا۔

”یار کوئی ہے جو روشنی گل کر دے نشے کا ستیاناس ہو رہا ہے۔“ بوڑھا بڑبڑا رہا تھا۔ میں نے اپنا سامان اٹھایا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا پہلی منزل پر آ گیا جہاں بوڑھا کبڑا ابھی تک برآمدے میں بیٹھا لائین کی روشنی میں رجسٹر پر جھکا لکھنے میں مصروف تھا۔ میں نے جلدی سے صدر دروازہ کھولا اور دیران باغیچے میں سے بھاگتا ہوا بیرونی دروازے تک پہنچ گیا۔ میرے بھاری جوتے کی ایک ہی ٹھوک سے آہنی دروازہ چوہٹ کھل گیا اور میں باہر گلی میں آ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی آسب سے پیچھا چھڑا کر آیا ہوں۔ میں نے وقت دیکھا تو دو بجے تھے۔ گلی کو پار کر کے واپس اسی جگہ پہنچ گیا جہاں بوڑھے کا کھوکھا واقع تھا۔ تھوڑی دیر میں وہاں سے ایک ٹیکسی گزری جسے میں نے اشارہ دے کر روک لیا ”اب بہانوف بیٹے“ میں نے ٹیکسی میں سوار ہو کر ڈرائیور کو سٹیشن پر چلنے کے لیے کہا۔ ٹیکسی سٹارٹ ہوئی تو میں نے مڑ کر پچھلے شیشے میں سے گلی کی طرف دیکھا۔ گلی کے آخر میں لائین کی مدھم روشنی ٹھنڈی تھی۔ شاید وہی کبڑا بوڑھا میری تلاش میں اس آسب زدہ مکان کے باہر آہنی دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ ٹیکسی فریٹکفورت کے سٹیشن کے برآمدے میں کھڑی ہوئی تو کرائے کا میٹر چھ مارک کے ہندسے سے تجاوز کر چکا تھا۔ میں نے کرایہ ادا کیا اور سٹیشن کے اندر ایک بچ پر سامان کا تھیلا سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ مجھے یہ

صبح سویرے میں سٹیشن سے باہر آ گیا اور قیصر سٹریٹ سے ٹرام پکڑ کر دریائے مائن کے کنارے واقع یوتھ ہوٹل کے قریب اتر گیا جس کا شمار دنیا کے بہترین یوتھ ہوٹلوں میں ہوتا ہے۔ میں نے وارڈن کو پچھلی شب کی پینٹا سنائی اور اس نے خاص طور پر ہوٹل کی دوسری منزل پر میرے لیے ایک صاف ستھرا کمرہ مخصوص کر دیا۔ اگرچہ عام حالات میں یوتھ ہوٹلوں کے کمرے دن کے وقت سونے کے لیے استعمال نہیں کیے جاسکتے مگر میری شب خواری کو مد نظر رکھتے ہوئے اس بات کی اجازت دے دی گئی۔ میں نے کمرے میں پہنچ کر شیشے کی بڑی کھڑکی کھول دی۔ دریائے مائن کے نیالے پانی میں سامان بردار کشتیاں اور سیٹر چل رہے تھے۔ دوسرے کنارے پر سیاہ کائی زدہ کلیسا کھڑا تھا جو اس شہر کا علامتی نشان ہے۔ میں اس سے قبل بھی یہاں آ چکا تھا مگر اس شہر نے مجھے کبھی بھی متاثر نہیں کیا۔ جدید عمارتوں کا بارش اور دھند میں لپٹا ہوا ایک غیر موثر ڈھیر۔ جرمنوں سے پوچھو تو وہ اس کی مدح میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ فریٹکفورت جیسی سیبوں کی شراب اور کہیں نہیں بنتی۔ یہاں کے آنتوں میں مصالحوہ دار قیمہ بھرے ”ساج“ کی توپورے جرمنی میں دھوم ہے اور پھر گونسنے کا گھر جو ہر جنگ میں مکمل طور پر تباہ ہو جاتا ہے اور پھر ابتدائی نقشہ نکال کر دوبارہ تعمیر کر لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جرمنوں کی توصیفی لغت کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔

سارا دن سونے کے بعد جب شام کو ہوٹل کے کھانے کے کمرے میں آیا تو وہاں خوب رونق تھی۔ یہاں اپنی مدد آپ کے اصول پر عمل کیا جاتا ہے۔ میں نے بھی دوسروں کی پیروی کرتے ہوئے تام چینی کی ایک ٹرے اٹھائی اور کھانے کے کاؤنٹر کے سامنے قطار میں کھڑا ہو گیا۔ سبز یوں کا گاڑھا سوپ، گائے کا ابلتا ہوا گوشت اور کوٹے ہوئے آلوؤں کا مرکب خرید کر میں کھڑکی کے پاس ایک میز پر بیٹھ گیا اور خاموشی سے بد مزہ اور پھیکا کھانا نگلنے کی کوشش کرنے لگا۔ ساتھ والی کرسیوں پر چند مشرقی چہرے براجمان تھے اور سیاست پر گرم بحث جاری تھی۔

”اپنی سینا کے ٹینک تو انارکلی تک ہو آئے۔ میں آکھیا“ ایک دہلا پتلا ہندوستانی ستمبر سن پینٹھ کی جنگ کے بارے میں مواشتائیاں کر رہا تھا۔

”کھیم کرن کے بارے میں کیا خیال ہے؟ میں نے گوشت کے نرم ٹکڑے میں تیز کاٹنا

گاڑتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

”کیا مطلب.....؟“ اس کا لقمہ گلے میں ہی اٹک گیا۔

”ہمارے گھر میں جو انا رکھنے کے پاس ہے تمام ایش ٹریڈ اس ہندوستانی طیارے کے بلے سے بنی ہیں جسے ہم نے لاہور کے اوپر مار گرایا تھا۔“

”آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہو رہے ہیں مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ پاکستانی ہیں۔“ اس نے پانی کا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

میں نے کھانے کی ٹرے اٹھائی اور دوسری میز پر چلا گیا۔ یہاں پر پاکستانیوں کی محفل جی تھی۔ چند ایک کے سوا باقی سب یورپ میں نوکری کی تلاش میں آئے ہوئے تھے۔ ایک صاحب اپنی آبائی زمین اور مکان بیچ کر یہاں تک پہنچے تھے اور اس دن کے انتظار میں تھے جب بلجیم میں کسی خصوصی کشتی کے انتظام کی اطلاع آئے گی اور وہ وہاں سے ولایت سمگل ہو جائیں گے۔ ”جرمن بڑی ایک لمبر جگہ ہے جی!“ ان کی نظریں ساتھ بیٹھی لڑکیوں پر مرکوز تھیں۔ ایک اور صاحب کینیڈا کا واپسی ٹکٹ خریدنے کے چکر میں تھے۔ ”واپسی ٹکٹ پر فریٹ کوارنٹین، اٹا وہ درج ہوگا“ انہوں نے اپنے منصوبے کے بارے میں راز دارانہ لہجے میں بتایا ”اسی میں دو دن کا قیام لنڈن میں رکھوا لوں گا اور پھر وہاں سے عائب براڈ فورڈ میں اپنی پوری برادری رہتی ہے۔“ کھانا ختم کر کے پوری ٹولی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”باورچی خانے میں برتن دھونے پر ڈیوٹی لگی ہے“ انہوں نے بتایا۔ ”یہاں صرف دو روز قیام کی اجازت ہوتی ہے۔ زیادہ دن ٹھہرنا ہو تو ہوٹل کا کوئی نہ کوئی کام کرنا پڑتا ہے اور ہم تو پچھلے دو ماہ سے یہاں ہیں۔“ شیشے کی بڑی کھڑکی کے باہر صحن میں سوٹ میں ملبوس ایک سکھ جھاڑو دے رہا تھا۔ اس کو ہوٹل میں ٹھہرے کچھ زیادہ عرصہ ہی گزر گیا ہوگا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں نے ٹرے اور برتن واپس کیے اور کافی کی پیالی خرید کر اپنی میز پر آ گیا۔

”میں اپنا خون بیچنا چاہتا ہوں۔“

”خون؟“ میں نے بوکھلا کر پیالی میز پر رکھ دی۔ میرے سامنے کھڑے فاقہ زدہ چہتی کا

لبوتر اچھرہ بالکل زرد تھا۔

”میں آج ہی یہاں آیا ہوں اور مجھے بلڈ بینک کے دفتر کا پتہ معلوم نہیں۔“ اس نے

بے تحاشا بڑھی ہوئی ڈاڑھی کھجلا تے ہوئے کہا۔

سفر کے دوران آپ کو بے شمار ایسی ہستیتوں سے پالا پڑے گا جن کا طریقہ سفر عام روایات سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ کچھ صرف مانگ تا نگ کر جہاں گردی کرتے ہیں اور کئی اپنا خون بیچ کر سفر کا شوق پورا کرتے ہیں۔ یورپ کے سبھی بڑے شہروں میں بلڈ بینک کے ادارے رضا کارانہ طور پر خون دینے والوں کو خاصی معقول رقم ادا کرتے ہیں یعنی خون جگر رائج نہیں جاتا اس کی قیمت پڑتی ہے۔

”بھوک لگی ہے“ اب وہ قمیض کے اندر ہاتھ ڈال کر اپنا پیٹ کھجا رہا تھا۔ میں نے جیب سے دو مارک نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔

”بہت بہت شکریہ“ اس نے جھک کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور جانے لگا۔

”اور ہاں۔ آپ کو خون بیچنا پڑے تو یونان میں سب سے زیادہ قیمت ملتی ہے۔ میں وہیں سے آرہا ہوں۔“ اس نے مڑ کر مجھے یہ نادر مشورہ دیا۔ میری کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ میں نے پیالی اٹھائی اور باورچی خانے کے کاؤنٹر پر کھڑی لڑکی کو واپس کر دی۔ ”تم نے کافی نہیں پی؟“ اس نے پیالی اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

”اس میں خون کی مہک ہے۔“

وہ شاید اس قسم کی بے تکلی باتوں کی عادی ہو چکی تھی اس لیے خاموش رہی۔

”میری قسمت ہی ایسی ہے۔“ میں نے ہوٹل کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے

سوچا۔ ”جہاں جاتا ہوں عجیب و غریب شخصیتوں سے پالا پڑتا ہے۔“

روماں سے اپنا منہ پونچھا اور بڑی سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔

”تمہیں معلوم ہے کہ جرمنی میں سب سے لذیذ ہیمبرگر کہاں بنتے ہیں!“

”ہیمبرگر میں بنتے ہوں گے۔“ میں نے ہنس کر جواب دیا۔

”ناٹ سوائز (Not So Wise) اس نے خوش ہو کر میز پر اپنا کاشا بجایا۔

”اس بارے میں تم ان پڑھ ثابت ہوئے ہو۔ برلن میں میرے بھائی“ اور کرسی کے

ساتھ ٹیک لگا کر بے وقوفوں کی طرح ہنسنے لگا۔ پھر یکدم سنجیدہ ہو کر کہنے لگا۔ ”چلو گے؟ میرے پاس

الفارومیو کار ہے“ میں نے پوچھا۔ ”کہاں؟“ تو کہنے لگا ”برلن اور آج ہی رات“

”ساری۔ میں کل ہیمبرگر جا رہا ہوں“ میں نے میز سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اور

پھر رات کے وقت اتنے لمبے سفر پر نکلنا ہی حماقت ہے خاص طور پر جب مشرقی جرمنی بھی راستے

میں پڑتا ہو اور میرے پاس ویزا بھی نہیں۔“

”ویزے کا انتظام سرحد پر ہو جائے گا۔“ وہ میرے ساتھ ہی ریسٹوران سے باہر

آ گیا۔

”میں برلن اس سے پہلے دیکھ چکا ہوں۔“

”برلن ہر سال زیادہ خوبصورت ہو جاتا ہے۔“

”اور بھئی مجھے ہیمبرگر کھانے کا اتنا بھی شوق نہیں کہ رات کے وقت چار پانچ سو میل

کے سفر پر نکل کھڑا ہوں۔“ میں نے تنگ آ کر کہا۔

”وہ تو صرف مذاق تھا“ اس نے بڑی بے تکلفی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے

ہوئے کہا۔ ”آج شام میں بہر صورت برلن جانا چاہتا ہوں مگر اتنے طویل سفر پر تنہا جانے کے

خیال سے مجھے بے حد وحشت ہو رہی ہے۔ تم ساتھ چلو تو سفر اچھا کٹ جائے گا۔“

چھپلی مرتبہ میں برلن کا مشہور عجائب گھر ڈاہلم نہ دیکھ سکا تھا۔ ڈاہلم میں ریمرانت کی

مشہور تصویر ”سنہری خود پہنے ہوئے شخص“ ٹنگی ہوئی ہے۔ میں نے صرف اس کی فوٹو دیکھی تھی۔

سنہری خود میں سے سچ مچ کی کرنیں پھوٹی نظر آتی تھیں۔ میں نے دریائے مائن کے گندے

کنارے کے ساتھ کائی زدہ کلیسا اور اس سے پرے فریٹکفورٹ کی ہونق عمارتوں پر ایک نظر ڈالی

اور برلن جانے کا فیصلہ کر لیا۔

مانک مگر۔ بطخیں اور برلن

اسی رات ایک اور عجیب شخصیت سے ملاقات ہو گئی جو مہنگی ترین سپورٹس کار الفارومیو کا مالک ہونے کی بنا پر غریب تو ہرگز نہ تھی۔

ہوشل سے نکل کر میں ساری شام شہر کی پرہجوم سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا اور واپسی

پر گونسے کے گھر کے ساتھ واقع ایک ریسٹوران میں کافی پینے چلا گیا۔ میرے سامنے والی میز پر

ایک خوش شکل و خوش پوشاک امریکی نوجوان سیب کی شراب کا مگ ہاتھ میں لیے جرمن ویٹرس کے

ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ ویٹرس کو کسی اور گا ہک نے بلایا تو اس نے مگ منہ سے لگا کر

شراب کا ایک گھونٹ بھرا اور میری طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔

”فراؤ لائن خوبصورت ہے۔“ اس نے آنکھ سے ویٹرس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

کہا۔ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

”ہائے“ وہ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”میرا نام مانک ملر ہے اور میں امریکی ہوں“

میں نے اپنا تعارف کروایا اور پاکستانی ہونے کا بتایا۔

”پاکستان؟“ اس نے انگلی سے گردن کھجائی۔ ”جہاں تک جغرافیہ کا تعلق ہے

میں بالکل اُن پڑھ ہوں۔“

”ان پڑھ ہونے کی خاصیت امریکیوں میں مشترک ہے۔“

”وائز گائی (Wise Guy)“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور قیے اور پیاز کا بنا ہوا

ہیمبرگر کھانے میں مصروف ہو گیا۔ میں بھی اپنی کافی پینے لگا۔ کھانے سے فارغ ہو کر مانک نے

سب سے پہلے ہم یوتھ ہوٹل میں گئے اور وہاں سے میرا سامان لے کر دیر تک بلا مقصد شہر کی سڑکوں پر گھومتے رہے۔ پہلے تو میرا خیال تھا کہ شاید مائک فریٹکفورٹ چھوڑنے سے قبل پورا شہر ایک مرتبہ پھر دیکھنا چاہتا ہے لیکن جب ہم بار بار ایک دوسرے کے چکر کاٹتے رہے تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ ”اب کس کا انتظار ہے؟“

”لڑکیوں کا۔“

”کون سی لڑکیوں کا۔“ میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”ابھی نہیں معلوم۔ جب ملیں گی تو پتہ چلے گا۔“ اور پھر انگوٹھے سے اپنا سینہ ٹھونک کر کہنے لگا ”مائک ملر کو لڑکیوں کے بغیر مانگو لیا ہو جاتا ہے۔“

مائک نے متعدد بار فٹ پاتھ کے کنارے کار روکی اور باہر نکل کر کسی قبوہ خانے میں بیٹھی یا راہ چلتی لڑکیوں کو ایک ہی سوال پوچھتا:

”میرے پاس الفارومیو کا رہے اور میں برلن جا رہا ہوں۔ چلیے گا؟“ ظاہر ہے اس بدتمیزی پر اسے جھڑکیاں ہی پڑتیں مگر وہ اس معاملے میں خاصا ڈھیٹ واقعی ہوا تھا۔ مائک یقیناً تھوڑا بہت خطی تھا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں اسے چھوڑ کر واپس یوتھ ہوٹل چلا جاتا تو وہاں بھی جگہ نہ ملتی۔ اس لیے چپکا بیٹھا رہا اور وہ ہر چوراہے میں کار کھڑی کر کے اپنی گردان دہراتا رہا۔

”میرے پاس الفارومیو کا رہے میں.....“ قیصر سٹریٹ کے پاس جب مائک کار میں بیٹھا فٹ پاتھ پر چلنے والی لڑکیوں پر قسمت آزمائی میں مصروف تھا اور میں منہ لٹکائے اپنی قسمت کو کوس رہا تھا تو شیش کی طرف سے ایک سفید فوس وگین آئی اور ہمارے پہلو میں رک گئی۔ کار میں سوار چار لڑکیاں شکل و صورت سے غیر ملکی دکھائی دیتی تھیں۔

”معاف کیجیے گا کیا آپ ہمیں فریٹکفورٹ کی کیمپنگ کا راستہ بتا سکتے ہیں؟ ڈرائیور کی نشست پر بیٹھی کالے بالوں والی لڑکی نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا ”ہم ابھی ابھی ڈنمارک سے یہاں پہنچی ہیں اور سارے دن کے سفر کے بعد بے حد تھکی ہوئی ہیں۔“ اس سے پہلے کہ میں کچھ جواب دیتا، مائک کار سے نکل کر تیر کی طرح ان کے پاس پہنچ چکا تھا۔ ”آپ ڈنمارک کی رہنے والی ہیں؟“

”نہیں ہم آسٹریلیا میں ہیں اور یورپ کی سیاحت پر آئی ہوئی ہیں“ لڑکی نے جہاں ہی لیتے

ہوئے کہا ”آپ ہمیں کیمپنگ کا پتہ بتا دیجیے مہربانی ہوگی۔“

”کیمپنگ یہاں سے کافی فاصلے پر ہے آپ ہماری کار کے پیچھے پیچھے چلی آئیں ہم دونوں اسی جانب جا رہے تھے۔“

لڑکیاں مائک کی اس شوری سے بے حد متاثر ہوئیں اور اپنی کار ہمارے پیچھے لگا دی۔

مائک قیصر سٹریٹ سے نکل کر کیمپنگ سے بالکل مخالف سمت میں چل دیا۔

”مائک کیمپنگ تو ہوٹل کے ساتھ دریائے مائن کے کنارے پر واقع ہے اور ہم بالکل مخالف سمت میں جا رہے ہیں۔“

”مائک ملر کو لڑکیوں کے بغیر مانگو لیا ہو جاتا ہے“ اس نے میرے سوال کا جواب دینے

بغیر اپنا پرانا مقولہ دہرایا۔

اب ہم شہر سے باہر نکل آئے تھے اور ہماری کار تیزی سے چوڑی شاہراہ پر چلی جا رہی تھی۔ ایک دورا رہے پر تیز پیلے رنگوں میں لکھی گئیں تختیاں نصب تھیں۔ برلن دائیں طرف، ہیبرگ بائیں طرف، مائک برلن جانے والی شاہراہ پر مڑ گیا۔ سفید فوس وگین بدستور ہمارے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ شہر سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر پچھلی کار نے اپنی روشنیاں بے تحاشا جلانی اور بجھانی شروع کر دیں۔ وہ شاید ہمیں رکنے کا اشارہ دے رہی تھی۔ مائک نے کار کی رفتار آہستہ کر دی اور سڑک کے ساتھ پارکنگ کی جگہ پر روک لی۔ فوس وگین بھی ہمارے پاس آرکی اور ڈرائیور اور اس کی ساتھی لڑکی باہر نکل کر مائک پر برس پڑیں۔

”یہ کیا حرکت ہے؟“ ساتھی لڑکی نے غصے سے کہا ”ہم فریٹکفورٹ سے تیس میل باہر آ چکے ہیں اور کیمپنگ کا نام و نشان نظر نہیں آتا۔“

”آپ کی ناراضی بجا ہے محترمہ۔“ مائک نے بڑی سنجیدگی سے جھک کر کہا ”میں خود بھی بے حد حیران ہوں“ اس کا چہرہ افسوس اور پشیمانی کے جذبات سے بھر پور تھا۔ وہ بار بار اپنے سر پر ہلکی سی چپت رسید کرتا اور بڑبڑاتا: ”بچھلی مرتبہ تو یہیں کہیں تھی۔ جانے کہاں چلی گئی۔“

”خواتین“ اس نے چپت مارنے کا سلسلہ منقطع کرتے ہوئے کہا ”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کیمپنگ کی جگہ یہیں کہیں تھی۔ شاید ہم نے پچھلا موڑ غلط کاٹا ہے۔“

خواتین کے چہرے لٹک گئے۔ ”تمام دن سفر کے بعد ہمیں آرام کی سخت ضرورت تھی

اب ہمیں شہر واپس جا کر پھر سے کیمپنگ ڈھونڈنا پڑے گی۔“

وہ اپنی کار میں بیٹھنے کے لیے واپس مڑیں تو مانک بھی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ساتھ چل دیا۔ کار کی پچھلی نشست پر بقیہ دو خواتین اونگھ رہی تھیں۔

”شہر واپس جاتے اور پھر وہاں رات کے اس پہر کیمپنگ تلاش کرتے آپ کو کافی عرصہ لگے گا اور ہو سکتا ہے کیمپنگ میں آپ کو جگہ بھی نہ ملے۔ اس مشکل کا ایک ہی حل ہے ہم دونوں شرفاء برلن جا رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ چلیے۔ کار میں خود چلاؤں گا اور کل شام واپسی پر آپ کو اسی جگہ اتار دوں گا“ مانک نے ایک سانس میں اپنا مدعا بیان کر دیا۔ برلن کے نام پر چاروں خواتین سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں اور سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔

”اوہ تو“ کالے بالوں والی نے تجویز یکسر مسترد کر دی۔

”برلن بے حد خوبصورت شہر ہے۔“ مانک نے لقمہ دیا۔

”ہماری کار کا کیا بنے گا؟ پچھلی نشست پر بیٹھی خاتون نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

”اُسے یہیں پارک کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بالکل محفوظ جگہ ہے۔“ سرگوشیاں جاری رہیں۔

”میں نے کہا نا کار میں خود چلاؤں گا اور آپ سب مزے سے سو جائیے گا صبح سویرے ہم برلن میں ہوں گے۔ شہر کی سیر کے بعد فوراً واپسی۔ اتنی دور سے جرمنی آ کر برلن نہ دیکھنا سراسر زیادتی ہے۔ کار کی نشستیں بے حد آرام دہ ہیں اور رفتار.....“

”آپ دونوں اپنی کار میں تشریف رکھیں“ کالے بالوں والی نے مانک کی بات کاٹتے ہوئے کہا ”ہم آپس میں مشورہ کر لیں۔“

ہم اپنی کار میں آ کر بیٹھے تو مانک نے مسکراتے ہوئے دو انگلیوں سے دائرہ سا بنا کر ہاتھ ہوا میں لہرا دیا جیسے کہہ رہا ہو کہ اب کام بننا ہی چاہتا ہے۔

سرگوشیوں کا فیصلہ ہمارے حق میں ہوا تھا۔

”اگر آپ لوگ وعدہ کریں کہ کل شام تک ہم واپس فریٹکفورت لوٹ آئیں گے

تو.....“

”میڈم“ مانک نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”یہ ایک شریف آدمی کا وعدہ ہے۔“

لڑکیوں نے چند کپڑے اور کچھ سامان آرائش اپنے سامان میں سے نکال کر ایک چھوٹے سوٹ کیس میں رکھ لیا اور اپنی فوکس وگن مقفل کر کے ہمارے ساتھ آ بیٹھیں۔

”مارگریٹ، ایشیلا اور جینیٹ“ کالے بالوں والی نے ساتھی لڑکیوں کا تعارف کروایا، اور میں نونکہ ہوں۔“

”مانک اور مستنصر“ مانک نے کار کی چابی گھماتے ہوئے کہا اور ہم چوڑی آٹوبھان پر نوے میل فی گھنٹہ کی رفتار سے برلن کی طرف روانہ ہو گئے۔

مانک کی الفارومیو واقعی آرام دہ ثابت ہوئی۔ تیز رفتاری کے باوجود انجن کی آواز نہ

ہونے کے برابر تھی۔ تھوڑی دیر میں ڈرائیور کے علاوہ سب لوگ سو چکے تھے۔ رات کے پچھلے پہر

میری آنکھ کھلی تو ہماری کار مشرقی جرمنی کی سرحد پر کھڑی تھی۔ سرحدی محافظ نے ہمارے پاسپورٹ

چیک کیے تو وہ ایک ہی کار میں آسٹریلیا، امریکی اور پاکستانی مسافر دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا۔

”آپ کار یہیں کھڑی کر دیں اور کشم ہاؤس سے مشرقی جرمنی عبور کرنے کے لیے ویزا لگوائیں“

پاسپورٹ بغل میں داب کر وہ کشم کی عمارت کی طرف چلا گیا۔ ہم جمائیاں لیتے ہوئے کار سے

باہر نکلے تو تھکاوٹ کے ساتھ خنکی کا احساس ہوا۔ کشم ہاؤس کے اندر پہنچے تو ویزا افسر میز پر پاؤں

پھیلائے اونگھ رہا تھا اور اس کے سامنے ایک پرانا ہیئر جمل رہا تھا۔ محافظ نے پاسپورٹوں کے بنڈل

سے میز بجائی تو اس نے نہایت پھرتی سے پاؤں کھینچ لیے اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے

پاسپورٹ پر چسپاں تصاویر دیکھ کر ہماری شناخت کی اور پھر چند فارم پُر کروا کر ویزا کی مہر لگا دی۔

اس دوران کمرے کے ایک کونے میں بیٹھی کشم کی وردی میں ملبوس کرخت صورت عورت لڑکیوں کو

بریں طرح گھورتی رہی۔ لڑکیاں اس کی شک بھری نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے دیوار پر ٹنگی لینن

اور البرخت کی تصاویر کو بڑے غور سے دیکھنے لگیں۔ ویزا لگوا کر ہم واپس کار میں آئے تو جینیٹ کا برا

حال تھا ”بڑھیا شکل سے خفیہ پولیس کی کارکن دکھائی دیتی ہے۔ اگر وہ میری طرف ایک قدم بھی

بڑھاتی تو میں یقیناً بے ہوش ہو جاتی۔“

مغربی اور مشرقی جرمنی کے درمیان اس قلعہ نما سرحد کی عمارتیں بے حد ہیبت ناک تھیں۔ ہر سو گز کے فاصلے پر حفاظتی مینار تھے جن پر مشین گنوں سے مسلح محافظ پہرہ دار رہے تھے۔

ان میناروں کے نیچے سڑک پر آہنی پھانک تھے جہاں کاغذات دوبارہ یا سہ بارہ چیک کیے جاتے۔ کئی جگہوں پر سڑک کے کنارے سینٹ اور لوہے کے دبیز ستون اس انداز سے ڈھلوان سطح پر رکھے تھے کہ اگر کوئی کار کسٹم ہاؤس اور آہنی پھانکوں پر رے کے بغیر غیر قانونی طور پر سرحد عبور کرنا چاہے تو ایک مٹن دبانے سے ڈھلوان سطح زیادہ تر چھٹی ہو جائے ستون خود بخود پھسل کر سڑک پر آگریں اور اس طرح فرار کا راستہ مسدود ہو جائے۔

سرحد عبور کرتے ہی نوئلہ نے مانک سے کار روکنے کی درخواست کی۔

”کیوں کیا بات ہے؟“

”یہ نہیں پوچھا کرتے۔“ نوئلہ نے جھینپ کر کہا۔

مانک نے کار روک دی اور چاروں لڑکیاں نیچے اتر کر ساتھ والے کھیت میں غائب ہو گئیں۔

”تم نے ان کی شکلیں دیکھی ہیں؟ ایک بھی کام کی نہیں۔ سب بطنیں ہیں۔“ مانک کے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے۔ اس کا مشاہدہ کسی حد تک درست تھا۔ لڑکیاں شکل و صورت کے لحاظ سے کافی گئی گزری تھیں۔

”کیوں نہ ان کو یہیں چھوڑ جائیں۔“ مانک نے چپک کر کہا۔ ”کل صبح چار بطنیں مشرقی جرمنی کے کھیتوں میں قیں قیں کرتی ہوئی خفیہ پولیس کے ہاتھ لگ جائیں تو؟“ اور اپنے ہاتھ نشست کی پشت پر پھیلا کر زور زور سے ہنسنے لگا۔ مجھے اب یقین ہو چکا تھا کہ یہ شخص خطی ہے۔ میں نے اسے اس حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کی اور بتایا کہ سرحد پر کار کے داخلے کا جواز نامہ ہمیں دیا گیا تھا اس پر چھ مسافروں کے نام درج ہیں۔ برلن میں داخلے سے قبل ایک مرتبہ پھر مشرقی جرمنی کی پولیس اس اجازت نامے کو چیک کرے گی تو ان میں سے چار مسافر غائب ہوں گے اور ظاہر ہے ہم دونوں دھریے جائیں گے۔

”تم ٹھیک کہتے ہو لیکن یہ سڑخوں کی مصیبت نہ ہوتی تو خیال برانہ تھا“ اس کی نظریں کھیت پر لگی ہوئی تھیں اور وہ بدستور قہقہے لگا رہا تھا۔ لڑکیاں ایک ایک کر کے کھیت کے مختلف کونوں میں سے برآمد ہوئیں اور پھر اکٹھی ہو کر واپس کار میں آ بیٹھیں۔ مانک نے بمشکل اپنے بے ہتتم قہقہوں پر قابو پایا اور کار شارت کر دی۔

”بالکل بطنیں“ مانک نے پھر نعرہ لگایا۔

”کیا؟“ اسٹیلٹا نے اوگھتے ہوئے پوچھا۔

”شکار کی بات ہو رہی ہے۔ بطنیں!“

”آسٹریلیا میں بھی ہوتی ہیں۔“

”وہیں کی بات کر رہا ہوں“ اس نے سڑک سے نظر ہٹا کر چاروں کا سر سری جائزہ لیتے ہوئے اکتاہٹ سے کہا۔ ”کیا آپ ایک اونٹ پسند کریں گی؟“ مانک نے جیب سے سگریٹوں کا

ایک پیکٹ نکالا۔

”وہ آسٹریلیا میں نہیں ہوتے۔“ اسٹیلٹا ابھی تک اوگھ رہی تھی۔

”میرا مطلب یہ اونٹ برانڈ کے سگریٹ! کیمل“ اس نے جھلا کر کہا اور خود ہی سگریٹ سلگا کر پینے لگا۔

ہم برلن کے نواح میں پہنچے تو صبح ہو چکی تھی۔ اب رہائش کا مسئلہ درپیش تھا۔

”ہم برلن کے ہلٹن ہوٹل میں ٹھہریں گے“ مانک نے شاہانہ انداز میں ہاتھ لہرا کر فیصلہ دے دیا۔ مجھے استنبول ہلٹن میں کافی کابل یاد تھا اس لیے میں نے معذوری کا اظہار کر دیا۔ خواتین کو بھی اس مہنگی پسند پر اتفاق نہ تھا۔

”آپ لوگ اخراجات کی پرواہ مت کریں۔ ایک آرمودہ فٹے کے استعمال سے تمام مشکلیں آسان ہو جائیں گی“ اس نے بے حد پراعتماد لہجے میں کہا۔

شہر کے وسط میں سے گزر کر جب ہم ہلٹن ہوٹل کی عالی شان عمارت کے قریب پہنچے تو مانک نے کار ہوٹل کے پورچ میں لے جانے کی بجائے باہر سڑک پر کھڑی کر دی اور سب لوگوں کے ضروری استعمال کی چیزیں اپنے دوست کیسوں میں ٹھونس کر ہوٹل کے اندر چلا گیا۔ دس منٹ کے بعد وہ واپس آیا تو اس کی مٹھی میں کمرے کی چابی تھی۔ ”کمرہ نمبر 203“ اس نے چابی انگلی پر گھماتے ہوئے کہا اور پھر بالکل فوجی انداز میں ہمیں ہدایات دینے لگا۔ ”سب سے پہلے تم دونوں صدر دروازے کے راستے کمرے تک پہنچ جاؤ۔“ اس کی مخاطب اسٹیلٹا اور جینیٹ تھیں۔ ”اس کے بعد مستنصر اور نوئلہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ایک نئے نویلے شادی شدہ جوڑے کی مانند ٹھہرتے ہوئے اوپر آ جائیں اور پھر آخر میں مارگیت تم پہلے ہوٹل کے قبوہ خانے میں جا کر ایک پیالی کافی پیو اور بعد

میں چپکے سے اوپر کھسک آؤ۔ اس نقل و حرکت کے دوران چال میں خود اعتمادی اور لفٹ ہوائے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانا بے حد لازمی ہے۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوگا۔“

چنانچہ آدھ گھنٹے کے اندر اندر مارک کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے پوری مخلوق ہٹلن ہوٹل کے سنگل کمرہ نمبر 203 میں منتقل ہو چکی تھی۔ مارک نے کمرے کے باہر ”ڈونٹ ڈسٹرب“ کی سختی لٹکا دی اور دروازہ اندر سے مقفل کر لیا۔ ساتھ ہی ڈیسک کو مطلع کر دیا گیا کہ مسٹر ملر چونکہ امریکہ سے براہ راست ابھی برلن پہنچے ہیں اور سخت تھکے ہوئے ہیں اس لیے آرام کے دوران انہیں کسی صورت بھی محل نہ کیا جائے۔

”بہت خوب“ مارک نے منصوبے کے پہلے مرحلے کی کامیابی پر تسلی سے دونوں ہاتھ ملے اور صوفے پر دراز ہو گیا۔ ”اب اگر ہم پرسکون رہیں تو ہوٹل کی انتظامیہ کو بالکل خبر نہ ہوگی کہ سنگل کمرے میں چھ افراد قیام کر رہے ہیں۔ کرایہ ساٹھ مارک یومیہ ہے جو ہم آپس میں تقسیم کر لیں گے یعنی آپ لوگ صرف دس مارک میں ہٹلن میں قیام کریں گے۔“

غسل خانے کے اولین استعمال کے لیے خواتین نے اپنی برتری جتائی۔ اس کے بعد میں تیار ہو کر کمرے سے باہر آ گیا۔ حسب ہدایت بڑی خود اعتمادی سے لفٹ ہوائے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرایا۔ اسے ایک مارک ٹپ بھی دیا اور لابی سے سگریٹ خرید کر ہوٹل سے باہر آ گیا۔

برلن میرے لیے یورپ کے اکثر شہروں کی طرح نیا نہیں تھا۔ 1957ء میں روس کی سیاحت سے واپسی پر چند روز مشرقی برلن میں قیام رہا۔ میں روزانہ زمین دوز گاڑی پر سوار ہو جاتا جو بغیر کسی روک ٹوک کے سیدھی مغربی برلن میں آنکھنہری۔ ان دنوں شہر کے دونوں حصوں کے درمیان آمد و رفت پر کوئی پابندی نہ تھی اور نہ ہی ابھی دیوار برلن تعمیر ہوئی تھی جس نے اب شہر کو حقیقی معنوں میں دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ امریکی صدر کینیڈی نے اسی دیوار کے سائے میں کھڑے ہو کر ”میں بھی برلن کا شہری ہوں“ کا نعرہ لگایا تھا۔ امریکی اسے جیل کی دیوار سے تشبیہ دیتے ہیں۔ ادھر مشرقی جرمنی والے اسے سراسر حفاظتی دیوار کا نام دیتے ہیں جو ان کے ملک کو امریکی لٹیروں سے بچائے ہوئے ہے۔ ایٹنٹ کے دوسرے عالمی سچائی کے دو مختلف پیمانے بن

جاتے ہیں۔ ان دنوں برلن اپنے چہرے سے جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کے داغ مٹانے میں مصروف تھا۔ 1947ء کی آتش زدگی کے بعد جو صورت شاہ عالم دروازے لاہور کی ابھری تھی وہی حالت برلن کے کوچہ و بازار کی تھی۔ کھنڈرات میں چھوٹے بچے کھیلتے پھرتے یا بوڑھے آوارہ گرد قیمتی اشیاء کی تلاش میں راگھ کریدتے رہتے۔ شہر پر گرائے ہوئے کئی وزنی بم ابھی تک بلے میں دبے ہوئے تھے، جو بسا اوقات پھٹ کر جانی نقصان کا باعث بنتے۔ اتحادیوں کی شب و روز کی بمباری نے جنگ سے پیشتر کے حسین اور خوبصورت برلن کو ”بھوتوں کے شہر“ میں بدل دیا تھا۔ رہی سہی کسر روسیوں نے پوری کر دی۔ مارشل زونوف نے برلن پر حملے کا آغاز بیس ہزار توپوں سے کیا تھا جن کی ایک ہی باڑھ سے پورے گاؤں اور گھنے جنگل ملیا میٹ ہو جاتے۔

کفرشٹن ڈام کے سرے پر قیصر ولیم میموریل چرچ کا جلا ہوا ڈھانچا کھڑا تھا۔ کلیسا کے گھڑیال کی سوئیاں ساڑھے سات کے ہندسوں پر نومبر 1943ء سے ساقط ہیں۔ اس شام برلن پر سینکڑوں دن آگ برسی۔ ایک بم کلیسا کے گھڑیال پر بھی گرا اور وقت کی رفتار تھم گئی۔ شہر کی تعمیر نو شروع ہوئی تو جلے ہوئے ڈھانچے کو بطور یادگار جوں کا توں رہنے دیا گیا۔ حال ہی میں اس ڈھانچے کے ساتھ ایک جدید کلیسا تعمیر کر دیا گیا ہے۔ جس عظمت اور خوبصورت طرز تعمیر کو آگ بھی پوری طرح متاثر نہ کر سکی اسے برلن والوں نے جدت کی دیوانگی میں خود تباہ کر دیا ہے۔ میں سڑک پار کر کے اس قطعہ زمین پر آ گیا جس کے چاروں طرف ٹریفک رواں تھی اور جس پر دونوں کلیسا پہلو بہ پہلو کھڑے ماضی اور حال کی نمائندگی کر رہے تھے۔ جدید عمارت کے اندر جو ماحول تھا اس میں انسان کے قدم موسیقی کی لے پر تھرک تو سکتے ہیں اپنے گناہوں کا اقرار کرنے کے لیے آگے بڑھ کر صلیب کے سامنے جھک نہیں سکتے۔ یہاں عبادت کرنے کے لیے تحیل کی پرواز کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ آرائش بالکل سینما گھروں جیسی، شوخ رنگوں کی دیواریں اور ہال میں آرام دہ اور جدید کرسیوں کی قطاریں۔ سامنے حضرت عیسیٰ کا نیا گورکانی کا مجسمہ چمک رہا تھا۔ میں سستانے کی غرض سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ یکا آرگن کی تیز موسیقی نے پورے ہال کو پلیٹ میں لے لیا۔ دیواروں اور کرسیوں کی پشت پر نصب شدہ لاؤڈ سپیکروں سے مذہبی موسیقی کی بوچھاڑ مجھے بے حد ناگوار گزری اور میں اٹھ کر باہر آ گیا۔ میں نے پرانے کلیسا کے جلے ہوئے کھنڈر پر ایک نظر ڈالی جو اب بھی سینٹ اور شیشے کے اس ڈھیر سے کہیں زیادہ وجیہ اور پر شکوہ تھا۔

میں اب ڈاہلم میوزیم دیکھنا چاہتا تھا چنانچہ بوداپیسٹ سٹریٹ سے زیر زمین گاڑی میں سوار ہو کر ڈاہلم کے نواحی شیشین پر اتر گیا جہاں سے عجائب گھر تک ایک نہایت پر فضا اور خوبصورت سڑک جاتی ہے۔ ڈاہلم میوزیم رقبے میں چھوٹا ہونے کے باوجود ریمبرانت، روبن اور وان ڈانگ جیسے مصوروں کے شاہکاروں کی نسبت دنیا بھر میں مشہور ہے۔ میں کافی دیر ریمبرانت کی تصویر ”سنہری خود پہنے ہوئے شخص“ کے سامنے کھڑا رگوں کے حسین امتزاج سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ خود کے سنہری رنگ سے واقعی روشنی کی کرنیں پھوٹی نظر آ رہی تھیں۔ اس مرتبہ یہ تصویر مجھے برلن کھینچ لائی تھی۔

ڈاہلم میوزیم سے پچھلے پہر واپسی ہوئی۔ دو پہر کے کھانے کے لیے میں کرفرشن ڈام کے ایک ریستوران کے باہر بیٹھ گیا اور ڈرنجیکٹ میں ملبوس ویٹر کو بھمبر گرسٹیک لانے کو کہا جو بقول مانک جرمنی بھر میں لذیذ ترین اسی شہر میں تیار ہوتی تھی۔ سٹیک واقعی بے حد خوش ذائقہ تھی مگر قہقہے کے اس جہازی کو فٹے کے لیے فریٹکفورت سے برلن تک کا طویل سفر کسی صورت بھی جائز نہ تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں میز پر پڑے انگریزی اخبار کو دیکھنے لگا جو وہاں شاید کوئی امریکی چھوڑ گیا تھا۔ پاکستان کے بارے میں کوئی خبر نہ تھی۔ ”کچھ خبر نہ آنا بھی اچھی خبر ہے پیارے“ میں نے لنڈن کے مزدور کا کئی کے فلسفے پر عمل کرتے ہوئے اپنے آپ کو تسلی دی۔ ٹن، ٹن، ٹن سامنے قیصر ولیم کے جدید کلیسا کے گھڑیاں نے دو بجتے کا اعلان کیا۔ مجھے اب شام تک فرصت ہی فرصت تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ ہوٹل واپس جا کر تھوڑی دیر آرام کر لیا جائے مگر مصیبت یہ تھی کہ دن دہاڑے بلا روک ٹوک کمرے تک پہنچ جانا خاصا دشوار کام تھا اور پھر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مانک کہیں سیر کے لیے چلا گیا ہو۔ ”کلیسا اور عجائب گھر دیکھنے کے بعد کہاں جانا چاہئے؟“ میں نے کافی کا آخری گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے سوچا۔ ”چڑیا گھر“ کھٹ سے جواب آیا۔ ”برلن کا چڑیا گھر دنیا بھر میں مشہور ہے۔“

ریلوے شیشین کے عین سامنے چڑیا گھر کا چھانک تھا جہاں سکول کے بچوں کے ایک ہجوم کے ساتھ قطار میں کھڑے ہو کر میں نے ٹکٹ خریدا اور اندر چلا گیا۔

جنگ سے پیشتر اس چڑیا گھر میں چودہ ہزار سے زائد اقسام کے جنگلی جانور تھے جن کی اکثریت برلن کے اکثر شہریوں کی طرح ہوائی حملوں کا شکار ہو گئی۔ اتحادی بمبار طیارے خصوصی

طور پر اس چڑیا گھر کو مشق ستم اس لیے نہیں بناتے تھے کہ انہیں گینڈوں اور مگرچھوں سے سیاسی اختلاف تھا بلکہ اس کی وجہ سینٹ اور لوہے کا وہ جی ٹاور یا حفاظتی مینار تھا جو چڑیا گھر کے پہلو میں واقع تھا۔ یہ عمارت اتنی بڑی تھی کہ ہوائی حملے کے دوران اس کے وسیع تہ خانے میں پندرہ ہزار سے زائد شہری پناہ لے سکتے تھے۔ حفاظتی مینار ایک سو بتیس فٹ بلند تھا اور اس کی دیواریں آٹھ فٹ سے زیادہ موٹی تھیں۔ چھت پر درجنوں جہاز مار توپیں اور مشین گنیں نصب تھیں۔ چھت سے نچلی منزلوں پر جرمین فوج کے دستے متعین تھے۔ جن کے لیے ایک ہسپتال اور گولہ بارود کا وسیع ذخیرہ موجود تھا۔ مینار کے مضبوط ترین کمروں میں برلن کے عجائب گھروں کے گراں بہا نوادرات اور تصاویر آہنی صندوقچوں میں بند پڑے تھے۔ ان میں سونے چاندی اور ہیروں کے بنے ہوئے زیورات و ظروف کا مجموعہ ”پرائم کا سنہری خزانہ“ بھی شامل تھا جو مشہور جرمن ماہر آثار قدیمہ ہنری سلیمان نے قدیم شہر ٹرائے Troy کی کھدائی کے دوران دریافت کیا تھا۔ مینار میں اسلحہ و بارود اور خوراک و پانی کا اتنا ذخیرہ موجود تھا کہ محاصرے کی صورت میں محصورین کم از کم ایک سال تک بیرونی مدد کے بغیر دشمن سے لڑ سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ زمینی فوجوں کے داخلے سے قبل اتحادی پائلٹ جرمنی کے دارالسلطنت کے عین درمیان میں واقع اس خطرناک اور ناقابل شکست دیوے سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے چاہے اس کوشش میں بندروں اور اود بلاؤں کی شامت ہی کیوں نہ آجائے۔ مسلسل بمباری کے باوجود یہ مینار مکمل طور پر تباہ نہ کیا جا سکا اور روسی فوجوں کو یہاں شدید مدافعت کا سامنا کرنا پڑا۔ جی ٹاور برلن کی آخری عمارت تھی جس نے روسیوں کے آگے ہتھیار ڈالے۔

چڑیا گھر کا سب سے خوبصورت حصہ وہ ہال ہے جس میں استوائی جانور رکھے گئے ہیں۔ ہال کے اندر داخل ہوتے ہی سیلاہٹ اور گھٹن کا احساس ہوتا ہے جیسے بارش تھمنے کے بعد جس میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہاں پر جانوروں کو قدرتی ماحول میسر ہے۔ درجہ حرارت اور نمی کو برازیل کے استوائی جنگلات کی سطح پر رکھا گیا ہے۔ کیلے کے درختوں اور گھنی جھاڑیوں میں بیٹھے ہوئے لمبی دم والے رنگ برنگے پرندے ہال میں گھومتے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر بڑے مزے سے سیٹیاں بجاتے ہیں۔ بندروں کی رہائش کا بھی خاطر خواہ انتظام ہے۔ ان کا ہال مکمل طور پر ایئر کنڈیشنڈ ہے۔ باہر کی سردی سے بچاؤ کی خاطر شہر کے پنشن یافتہ بوڑھے اور بوڑھیاں پنجروں

”رات آرام سے کئے گی“ میں نے سوچا۔ ”بشرطیکہ سوتے میں پاؤں پانی کے نل کی

ٹوٹی پر نہ جا پڑے تو!“

میں نے دروازہ بند کر کے روشنی گل کردی اور اپنے خدار بستر پر لیٹ گیا۔ مانک کے بے ہنگم تہقہوں اور ”بطخوں“ کی متواتر قیں قیں کے باوجود میں جلد ہی سو گیا۔

رات کے پچھلے پہر دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔ ”اندر آ جائیں۔“ میں نے اونگھتے ہوئے کہا۔ دستک دوبارہ ہوئی تو مجھے خیال آیا کہ میں کسی کمرے کی بجائے غسل خانے میں سو رہا ہوں اور دروازہ اندر سے بند ہے۔ میں جمائیاں لیتا ہوا اٹھا اور دروازے کی چٹختی کھینچ دی۔ باہر ٹیبل لمپ کی ہلکی روشنی میں نوئلہ کھڑی تھی۔ نائلون کے باریک شب خوابی کے لباس میں وہ بالکل بطخ نہیں لگ رہی تھی۔

”میں اندر آنا چاہتی ہوں“ اس کی آنکھیں نیند سے جو جھل تھیں اور وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”ہاں ہاں۔ بالکل ضرور۔“ میں نے وہیں کھڑے کھڑے جواب دیا۔ میری آنکھوں سے نیند بالکل غائب ہو چکی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھا کر اس طرح انگریزی کی جیسے وہ بھنگڑا ڈالنے کے موڈ میں ہو۔ ہاتھ نیچے کرنے سے اس کا لباس کندھے سے ڈھلک گیا۔ میں نے بڑی مشکل سے تھوک نگلا اور پھر اسے بیوقوفوں کی طرح تکلنے لگا۔

”تم باہر آؤ تو ہی میں اندر جاسکتی ہوں“ یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور بڑے پیار سے مجھے باہر دھکیل کر غسل خانے کی کنڈی چڑھائی۔ اب مجھے احساس ہوا کہ میری خواب گاہ میں بہتوں کی اور بہت سی ”حاجتیں“ پوری ہو سکتی ہیں مگر کم از کم رومان ان میں شامل نہیں۔ تھوڑی دیر بعد غسل خانے میں پانی بہنے کی آواز آئی اور پھر نوئلہ اپنا لباس درست کرتی ہوئی باہر نکل آئی۔ ”مخل ہونے کی معافی چاہتی ہوں“ اس نے نظریں جھکا کر کہا اور واپس جا کر قالین پر اوندھے منہ لیٹ گئی میں اپنی خواب گاہ میں واپس آیا تو لیٹنے کی بجائے سادھوؤں کی طرح آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔ ہر لمحہ یہی دھڑکا لگا رہتا کہ ابھی چار باقی ہیں۔

صبح ہوئی تو میں نے ٹب میں سے اپنا بستر سمیٹا اور پھر اس میں گرم پانی بھر کر غسل کیا۔ تیار ہو کر باہر آیا تو لوگ تو لیے اور دانتوں کے برش ہاتھ میں لیے قطار باندھے کھڑے تھے۔ سب کو

کے سامنے رکھے ہوئے بچوں پر آ کر بیٹھے رہتے ہیں۔ سرخ بندر، کالے بن مانس اور سفید لنگور پنجروں کی سلاخوں سے چٹے بڑی دلچسپی سے ان انسانوں کو تکتے رہتے ہیں جو اپنے خنک کردوں سے فرار ہو کر ان کے گرم اور خوشگوار ہال میں بیٹھے اونگھ رہے ہوتے ہیں۔ ارتقاء کی منزلیں طے کرنے پر بھی نجات حاصل نہیں ہوتی۔

چڑیا گھر سے باہر نکلا تو شام ہو رہی تھی اور شہر کی لاتعداد روشنیاں اور نیون سائن سرسری اندھیرے میں جگمگا رہے تھے۔ میں برائنڈن برگ دروازے سے بائیں ہاتھ پر دیوار برلن کے سائے میں چلتا ہوا واپس ہوٹل پہنچ گیا۔ ڈیسک کلرک سے نظر بچا کر جب میں کمرے میں داخل ہوا تو مانک اور چاروں لڑکیاں قالین پر بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ وہ شاید بطخوں والی بات بھول چکا تھا۔

”سیاحت تو کوئی ہمارے پاکستانی دوست سے سیکھے۔ تمام شب سفر میں گزاری، صبح سات بجے آوارہ گردی پہ نکل گئے اور آدھی رات کو واپس ہوئی۔“ مانک موڈ میں تھا۔ اس کے سامنے جرمن بیئر کے درجنوں خالی ٹین پڑے تھے۔

”ہم لوگ تو صرف دیوار برلن دیکھ کر ہی واپس آ گئے تھے۔“ مارگریٹ نے تاش کے پتے پھینکتے ہوئے جمائی لی ”تم نے آج کیا کیا دیکھا؟“

”ڈاہلم میوزیم، چڑیا گھر.....“

”چڑیا گھر؟“ مانک کی باجھیں کھل گئیں۔ ”وہاں بطخیں بھی تھیں؟“

”پتہ نہیں۔“ میں نے جھینپ کر کہا۔

”کمال ہے یعنی چڑیا گھر بھی گئے اور بطخیں نہیں دیکھیں۔ وہاں نہیں دیکھ سکے تو.....“

اس نے لڑکیوں کی طرف دیکھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا اور پھر بے تحاشا ہنسنے لگا۔

”سونے کا کیا انتظام ہے؟“

”تمہارے حصے میں غسل خانہ آیا ہے۔ بلٹن کا غسل خانہ ہے پیارے۔ ہم لوگ یہیں

قالین پر گزارا کر لیں گے“ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

غسل خانے کا ہاتھ ٹب میرے سونے کے تھیلے اور دو ٹکیوں کی مدد سے اچھا خاصا بستر

بن گیا۔

فراغت ہو چکی تو مائک نے ہر ایک سے دس مارک چندہ وصول کیا اور نیچے بل ادا کرنے چلا گیا۔ اس کے بعد چال میں خود اعتمادی اور لفٹ بوائے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانے کا عمل شروع ہوا اور ہم آدھ گھنٹے میں مائک کی کار میں پہنچ چکے تھے۔ ”پیرگارڈن“ کے پارک میں ناشتے کے بعد واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ جس سڑک پر ہم سفر کر رہے تھے وہ صرف مغربی جرمنی سے برلن کے مغربی حصے تک جانے والی ٹریفک کے لیے مخصوص ہے اور کسی بھی قصبے یا شہر میں سے نہیں گزرتی۔ سڑک کے گرد میلوں تک سروسوں کے کھیت پھیلے ہوئے تھے لیکن ان میں کام کرنے والے کہیں نظر نہ آتے تھے۔ آبادی کی غیر موجودگی میں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم خلا میں سفر کر رہے ہوں۔ چونکہ میں نے ہیمبرگ جانا تھا اس لیے مغربی جرمنی میں داخل ہونے پر مائک نے مجھے اتار دیا۔ وہ حسب وعدہ خواتین کو واپس فریٹکفورت لے جا رہا تھا اور یوں ایک ایسے سفر کا اختتام ہوا جس کی یادوں میں خطی مائک کے بے ہنگم قہقہے، ریمبرانت کی تصویر، ”بطخوں“ کی رفاقت، ہلٹن ہوٹل میں قیام اور چڑیا گھر کے بندر شامل تھے۔

دریائے ایلبا کے کنارے

مغربی جرمنی کی سرحد سے مجھے فوراً ہی ہیمبرگ جانے والی ایک ٹورسٹ بس مل گئی جس نے مجھے شام سے پہلے جرمنی کے سب سے بڑے شہر میں پہنچا دیا۔ بس شیشن کے ساتھ زیر زمین ریلوے شیشن سے گاڑی میں سوار ہو کر میں ”سینٹ پالی“ پر اتر گیا جس کے قریب ہیمبرگ کا یوتھ ہوٹل واقع ہے۔

فریٹکفورت کے ہوٹل کی طرح یہ عمارت بھی جدید اور صاف ستھری ہے۔ وارڈن کا رویہ بھی قدرے نرم اور مشفقانہ ہے۔ فریٹکفورت میں تو سیاح بے جا سختیوں اور اوقات کی پابندی پر وارڈن کو یوتھ ہوٹل وارڈن کی بجائے یوتھ ہٹل وارڈن کے نام سے پکارتے تھے۔ ہوٹل کی رکنیت کا کارڈ دفتر میں جمع کروا کر میں کھانے کے کمرے میں چلا گیا۔ شیشے کی کھڑکیوں سے پرے یورپ کی سب سے بڑی بندرگاہ کی گودیاں اور عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔ تجارتی، فوجی، مسافر بردار جہاز اور چھوٹی بڑی کشتیاں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی ہوئی تھیں۔ بندرگاہ کے ساتھ چوڑے فٹ پاتھ پر گودی میں کھڑے جہازوں کے ملاح بے مقصد گھوم رہے تھے۔ کوئی حسین لڑکی ان کی جانب ایک نظر دیکھتی تو وہ سب اس کے گرد ہو جاتے اور تب تک پیچھا نہ چھوڑتے جب تک اس کا کوئی ساتھی یا رشتہ دار مدد کو نہ پہنچ جاتا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں نے سگریٹ سلگایا تو ویٹس نے بڑی سختی سے منع کر دیا۔ ”فاربودن“۔ میں اٹھ کر باہر آ گیا اور ہوٹل کی میز جیوں پر بیٹھ کر اپنا ادھ جلا سگریٹ دوبارہ سلگالیا۔ میرے علاوہ وہاں اور لڑکے اور لڑکیاں بھی براجمان تھے۔ شام بسر کرنے کے پروگرام طے ہو رہے تھے۔

”فلاں ڈسکوٹھیک کے سازندے سر کے بل کھڑے ہو کر ساز بجاتے ہیں۔“

پنشن یافتہ بوڑھوں کے خیراتی ہوٹل میں چلتے ہیں وہاں خوراک سستی ہے۔“

”آج گھاس“ (یعنی چرس) پینے کو جی چاہتا ہے۔“ میرے ساتھ سیڑھیوں پر گندی

رنگ کا ایک منحنی سا لڑکا بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے کالے چہرے کی پتلون اور جیکٹ پہن رکھی تھی اور سر پر ایک سرخ رنگ کا بوسیدہ ہیٹ اٹکا رکھا تھا۔ ”شاید ہندوستانی ہے۔“ میں نے اندازہ لگایا۔

”مین یوانڈین؟“ اس نے سگریٹ ختم کر کے پاؤں تلے مسلا اور چنگی کی لے پر جھومنا شروع کر دیا۔ اس کا سُر تال کی سُر میں متواتر بل رہا تھا اور اس نے ایک ہاتھ سے اپنے سرخ ہیٹ کو تھام رکھا تھا۔

”پاکستانی۔“ میں نے رو ہانسا ہو کر جواب دیا۔

”کول مین“ اس نے سلسلہ چنگی جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”اور جناب کہاں سے تشریف لائے ہیں!“ آدمی دلچسپ معلوم ہوتا تھا۔

”لائک ٹرینیڈاڈ مین“ اس نے سرخ ہیٹ سر سے اٹھایا اور جھک کر جواب دیا۔ تو وہ جزائر غرب الہند کا باشندہ تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اسے قاضی کہتے ہیں اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مسلمان گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ صدیوں پیشتر اس کے آباؤ اجداد ہندوستان سے ہجرت کر کے ٹرینیڈاڈ کے جزیرے میں آباد ہو گئے تھے۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ان کا تعلق ہندوستان کے کس صوبے سے تھا۔ اب وہ لنڈن میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہا تھا اور گرمیوں کی چھٹیاں یورپ میں بسر کرنے آیا ہوا تھا۔ سفر کے اخراجات پہلو میں پڑی ہوئی گتار بجا کر پورے ہوتے تھے۔ اس کی زبان اور لہجے میں غرب الہند کے جشی موسیقاروں اور امریکی پٹیوں کی بولی کا عنصر نمایاں تھا جس میں کول، گریٹ، گرودی اور لائک جیسے لائینی الفاظ کی بھرمار تھی۔

”وہاٹ گوز مین؟ کیا پروگرام ہے؟“ میں نے بھی چنگی بجانا شروع کر دی اور اپنے آپ کو وجد طاری کر لیا۔

”سینٹ پالی۔ ریپا بہان“ اس نے جھورے تھیلے میں بند اپنی گتار کندھے پر رکھی اور ہم ہوٹل کی سیڑھیاں اتر کر فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ہجوم میں کھو گئے۔

ہماری منزل ریپا بہان تھی۔ ریپا بہان جس کا نام سن کر جرمن بوڑھے آپس بھرتے ہیں، جوان مسکرا دیتے ہیں اور دنیا بھر کے ملاحوں کی رال ٹپکنے لگتی ہے۔ شبینہ کلبوں، ناچ گھروں اور شراب خانوں کا ایک جنگل جس کے تاریک کونوں میں دلہلیں اور پھسلن ہے جہاں جا کر لوگ جیب الٹ دیتے ہیں اور اپنی خوشی سے پھسلتے ہیں۔ ریپا بہان جہاں کسی کو نیند نہیں آتی اور جس کی محفلوں میں رات جگا رہتا ہے۔ یہاں پر کاروں کی آمد و رفت بالکل نہ ہونے کے برابر تھی اور اکثر لوگ فٹ پاتھ چھوڑ کر بڑے ٹھسے سے سڑک کے پیچوں بچ چل رہے تھے یا چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ جرمن بیڑ کے رنگ تھے۔ ہر شبینہ کلب کے دروازے پر اندر ہونے والے رنگین ”تماشوں“ کی تصاویر چسپاں تھیں۔ کئی جگہ ٹکٹ بیچنے والے چیخ چیخ کر گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ ”پانچ مارک میں بیس لڑکیوں کا ناچ، بیڑ کا گلاس مفت۔“ ہندوستانی جوگی اور پچاس جنگلی لڑکیاں۔“ ”مشرقی وسطی کی شرمیلی خواتین“

تصویریں دیکھتے ہوئے میں نے سوچا کہ اس علاقے میں ملبوسات کی دکانوں کے مالک تو بھوکوں مرتے ہوں گے۔ ہم ایک چھوٹی سی گلی میں داخل ہوئے تو مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ وہاں دکانیں رات کو بھی کھلی ہیں اور شوکیس رنگ برنگی روشنیوں سے منور تھے۔ نزدیک جانے پر معلوم ہوا کہ شوکیس کے شیشے ندارد ہیں اور ان میں کپڑوں اور اشیائے صرف کی بجائے عورتیں جچی بیٹھی ہیں۔ غارے اور لپ سنک کی موٹی تہوں میں جھریوں سے بھرپور گناہ آلود چہرے۔ بحریہ کی وردیوں میں ملبوس ملائح ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ رکھے ہر شوکیس میں جھانک کر ”اشیا“ کی کوالٹی کا اندازہ لگا رہے تھے۔ اب مجھ پر ملاحوں کے مشہور گانے ”ہر بندرگاہ میں میری ایک دوست لڑکی ہے“ کا پورا مطلب آشکارا ہوا۔ ظاہر ہے ہر بندرگاہ کے شہر میں اسی قسم کی ”لڑکیاں“ ہوں گی۔ ہم تیزی سے گلی پار کر کے سڑک کے دوسری طرف آنکے۔ یہاں پر نسبتاً شرافت کا دور دورہ تھا یعنی صرف شراب خانے اور سینما تھے۔

”میرا خیال ہے اب واپس ہوٹل چلا جائے“ میں نے اپنے ساتھی سے التجا کی جو گرد و پیش کے ماحول سے بے خبر ناک کی سیدھ میں چلا جا رہا تھا۔

”پلے کول ڈیڈی او“ اس نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے کہا۔ یعنی مجھے صبر کی تلقین کی جا رہی تھی۔ سڑک کے اختتام پر ایک چھوٹا سا باغچہ تھا۔ قاضی نے میری طرف مسکرا

کردیکھا۔ ”دس پلیس سوگنز“ اس نے چنگی بجا کر پسندیدگی کا اظہار کیا۔ گتار کو تھیلے سے باہر نکالا اس کے تار کے اور انگلی پر مضرب چڑھا کر جزائر غرب الہند کی ایک لوک دھن چھیڑ دی۔ قاضی بے حد منجھا ہوا موسیقار ثابت ہوا اور گتار کی سہیلی گت سن کر چند راگیں ہمارے گرد جمع ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں اچھا خاصا مجمع لگ گیا۔ نغمے کا بول ختم ہوتا تو گتار مضرب کی بے رحم بوچھاڑ سے چیخ اٹھتی۔ ہجوم میں اکثریت ملاحوں کی تھی جوشور مچا مچا کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کر رہے تھے۔ چند ”لڑکیاں“ اپنے ساتھیوں کے کندھوں پر سر رکھ گیت سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ نشے میں دھت ایک موٹے جرمن نے ”زیگلڈ“ کا نعرہ لگایا۔ بڑی مشکل سے اپنی جیب تلاش کی اور ایک سکہ نکال کر ہماری طرف پھینک دیا۔

”گریب دی منی مین۔“ قاضی نے اپنا سرخ ہیٹ مجھے تھما دیا اور مجمع میں گھوم جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں ہیٹ آگے کر کے تماشائیوں سے پیسے مانگوں۔

”نو ڈیل کول کیٹ۔ یہ سودا مجھے منظور نہیں۔“ میں نے ہیٹ اس کے سر پر رکھ کر تھپک دیا۔

”کریزی“ ہیٹ اس کے کانوں تک اتر آیا تھا اور وہ بے حد حیران تھا کہ میں اتنی آسانی سے ”کمانی“ ہوئی دولت سمیٹنے میں جھجک کیوں رہا ہوں۔

”بالکل کریزی۔ صریحا پاگل پن۔“ میں نے سر ہلا کر چنگی بجائی اور تماشائیوں کے نرغے سے نکل کر واپس ہوٹل آ گیا۔ ساری رات ایک ہی خواب دیکھتا رہا کہ میں ریپا بہان میں بندروں کی طرح ناچ رہا ہوں اور ہیٹ پھیلا کر لوگوں سے بھیک مانگ رہا ہوں۔ یورپ میں خواب بھی کچھ زیادہ ہی آتے ہیں۔

دوسری صبح ناشے سے فارغ ہو کر ہوٹل سے باہر آیا تو قاضی سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔ ”فغنی مارک۔ مین آئی ایم سوئٹنگ۔“ اس نے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر چند سکے نکالے اور انہیں گنتے میں مصروف ہو گیا۔ وہ جھپیلی شب کی کمانی سے بے حد مطمئن نظر آ رہا تھا۔

کل شام جب ہیمرگ پہنچا تو خیال تھا کہ سیدھا اپنے مصور دوست فاکر کے ہاں چلا جاؤں پھر خیال آیا کہ شاید اس وقت اس کا مکان ڈھونڈنے میں دقت ہو اس لیے ارادہ ملتوی

کر دیا۔ اب اسے ملنے کا پروگرام تھا۔ ہم دونوں کی پہلی ملاقات کئی برس پیشتر پیرس میں ہوئی تھی۔ مصوری سے مجھے شروع سے ہی لگاؤ تھا حالانکہ سکول کے زمانے میں ڈرائنگ کے مضمون میں ہمیشہ فیل ہو جاتا۔ پھر گوگین، دان گوگ اور لائٹرک کے حالات زندگی پڑھے تو شوق جنون کی حد تک پہنچ گیا۔ کالج میں گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو میں لنڈن سے پیرس چلا آیا۔ مصوری شروع کرنے کے لیے مومارت کے علاقے سے بہتر اور کون سی جگہ ہو سکتی تھی۔ پرانی وضع کے مکانات، اونچی نیچی پتھریلی سڑکیں اور درجنوں قہوہ خانے جو دن رات کھلے رہتے ہیں۔ میں نے بھی ایک شکستہ صورت عمارت کے آخری منزل پر ایک روشن کمرہ کرائے پر لے لیا۔ سارا دن کینوس اور رنگوں کا ستیاناس کرتا اور شام کو کسی قہوہ خانے میں بیٹھ کر اصلی اور بڑے مصوروں کی گفتگو سنتا۔ مصوری کے جدید ترین اصول نوٹ کرتا اور دوسرے روز ان پر عمل کرنے کی کوشش کرتا۔ نتائج کبھی بھی خاطر خواہ برآمد نہ ہوتے۔ ایک شام میں معینہ وقت سے کچھ پہلے ہی قہوہ خانے میں چلا گیا۔ ابھی تک دوسرے حضرات وارد نہیں ہوئے تھے۔ قہوہ خانہ تقریباً خالی تھا سوائے ایک گرانڈیل بارلش مصور کے جو کاؤنٹر پر براجمان تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کافی کی پیالی تھی اور دوسرے میں ایک سرخ پنسل جس سے وہ کاؤنٹر کی شفاف سطح پر آدھی تر چھری لکیریں کھینچ رہا تھا۔ قہوہ خانے کے مالک نے اپنے نئے کاؤنٹر کو مشق مصوری بننے دیکھا تو اسے تاؤ آ گیا اور مصور کو ایسا کرنے سے منع کیا۔ تھوڑی سی تنکار ہوئی اور پھر وہ ایک دوسرے کو دھما دھم پینٹنے لگے۔ میں بچاؤ کے لیے بڑھا تو ایک گھونسا مجھے بھی رسید کر دیا گیا۔ اس کے فوراً بعد حالات اعتدال پر آ گئے۔ مالک نے داڑھی والے مصور سے ہاتھ ملایا اور جھاڑن لے کر بڑے سکون سے پیالیاں خشک کرنے لگا۔ مصور نے کاؤنٹر سے کافی کی پیالی اٹھائی اور اٹھ کر میری میز پر آ گیا جہاں میں ابھی تک اپنا جبراً سہلا رہا تھا۔

”خواہ خواہ پرائے پھٹے میں ٹانگ نہیں اڑاتے“ اس نے میز کے نیچے سے کرسی کھینچی اور بیٹھ گیا۔ ”قہوہ خانے کا مالک میرا پرانا دوست ہے قصور میرا تھا جو کاؤنٹر پر رنگ آمیزی شروع کر دی۔ بہر حال اب صلح ہو چکی ہے۔“ اس نے انگوٹھے اور انگلی کی مدد سے اپنی گھنی مونچھیں منہ سے ہٹائیں اور مسکرا دیا۔ ”مکا شاید زور سے لگا ہے؟ آؤ میرے سنو ڈیو میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ میرے پاس فرانسیسی ڈبل روٹی اور پنیر کے ٹکڑے ہیں۔“ اس کی دعوت میں بے پناہ خلوص تھا۔

”ہا ہا، شیل میرے دوست۔“ پیرس میں اسے ہمیشہ میرا نام بھول جاتا تھا چنانچہ سہولت کے لیے مجھے مستنصر سے فرانسیسی شیل میں بدل دیا گیا۔

”تمہارا سامان کہاں ہے؟“ اس نے میرے لٹکتے ہوئے ہاتھ دیکھ کر پوچھا۔

”یوتھ ہوٹل میں۔“

”شام کو لے آئیں گے“ اس نے قوی ہاتھوں سے میرے کندھے تھپکتے ہوئے کہا۔

فالکر کا فلیٹ دو کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک مصوری کا کمرہ یعنی سٹوڈیو اور دوسری خواب گاہ۔ درمیان میں ایک تنگ راہداری تھی۔ فرنیچر اور دوسرا سامان کافی پرانا معلوم ہوتا تھا۔ فلیٹ میں کافی اور تازہ رنگوں کی ملی جلی خوشبو تھی۔

”آج کل میری تصویریں نہیں بک رہیں“ اس نے سٹوڈیو کی بوسیدہ دیواروں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”پتہ نہیں کیا وجہ ہے شاید تم دیکھ کر ہٹا سکو۔“

ایک کونے میں درجنوں گرد آلود تصاویر بے ترتیبی سے بکھری پڑی تھیں۔ فالکر نے ایک تصویر اٹھائی اور اپنے رومال سے جھاڑ پونچھ کر سٹینڈ پر رکھ دی۔ ”کیا خیال ہے؟“

یہ دوسری جنگ عظیم کے دوران تعمیر کردہ لوہے اور سیمنٹ کا ایک ویران مورچہ تھا۔ فالکر نے بتایا کہ جنگ کے آخری ایام میں اتحادی حملہ کے پیش نظر جرمنوں نے پورے ملک میں ایسے دفاعی مورچوں کا جال بچھا دیا تھا۔ جنگ کے خاتمے کے ساتھ ان کی افادیت تو ختم ہو گئی مگر اپنی مضبوط تعمیر کے باعث یہ مورچے ابھی تک صحیح سالم ہیں۔ فالکر کی اس تصویر میں سیاہی اور مایوسی کے پرتوتھے یہاں تک کہ مورچے کے گرد کھیتوں کا رنگ بھی سیاہی مائل تھا۔

”تاثراتی طرز کے شوخ و شنگ رنگ کیا ہوئے؟“ مجھے اس کی پیرس کے زمانے کی تصاویر یاد تھیں۔

”وہ سب فریب نظر تھا۔“ اس نے سٹینڈ پر ایک اور تصویر رکھ دی۔ یہ بھی ایک سیاہی مائل مورچہ تھا۔ ”یہ مضبوط لیکن بے مقصد مورچے میری زندگی کی عکاسی کرتے ہیں ان کی طرح میری افادیت بھی مخصوص حالات کی طالع ہے اور ابھی تک وہ حالات پیدا نہیں ہو سکے آج کل فن کا روبرو حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ مجھے بسکٹوں کے ڈبے اور خواتین کے زیر جامہ ملبوسات کے اشتہاروں کے ڈیزائن بنانے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے جو مجھ سے کبھی نہ ہوگا۔“

اس کا سٹوڈیو اسی گلی میں واقع تھا جہاں میں رہتا تھا۔ کمرے میں بکھری ہوئی تصویروں پر تاثراتی مصوروں رینائر اور سیزان کے شوخ رنگوں کی گہری چھاپ تھی۔

”میں ہیملبرگ کا رہنے والا ہوں۔ پیرس اس خیال سے آیا تھا کہ یہاں کا ماحول مصوری کے فن کو جلا بخشتا ہے“ اس نے گز بھر لمبی ڈبل روٹی کو بیچ میں سے کاٹا اور پینر کے ٹکڑے کے ساتھ ایک حصہ مجھے تمہا دیا۔ ”لیکن جب تک انسان کے اپنے اندر کچھ نہ ہو ماحول خواہ کتنا ہی سازگار کیوں نہ ہو تخلیقی عمل بے جان رہتا ہے۔“

فالکر کی اس منطق نے مجھ پر گہرا اثر کیا اور میں چند روز کے بعد اپنے رنگ۔ برش اور کیوس اونے پونے دامنوں بیچ کر واپس لنڈن چلا گیا۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ مصوری میرے بس کا روگ نہ تھا۔ میرے ذہن کے کیوس پر چاہے کتنے ہی لازوال شاہکار کیوں نہ ابھریں میں انہیں سامنے رکھے ہوئے کیوس پر منتقل کرنے سے قاصر تھا۔ میرے اندر سے اٹھنے والے شعلے کی حدت مجھے تو پھونک سکتی تھی مگر رنگوں میں جذب ہو کر انہیں کندن نہ بنا سکتی تھی۔ ان چند دنوں میں فالکر اور میں مصوری کو بالائے طاق رکھ کر پرانے پیرس کی گلیوں اور بازاروں میں بے مقصد گھومتے رہتے اور ہر شام اسی قبوہ خانے میں آ بیٹھتے جہاں ہمارا ”تعارف“ ہوا تھا۔ میری واپسی کے تھوڑے عرصے بعد فالکر بھی ہیملبرگ لوٹ گیا۔

میری ڈائری پر فالکر کا پتہ فلیٹ نمبر B.y 20 درج تھا لیکن بیس نمبر میں فالکر کی بجائے ایک پنشن یافتہ بوڑھا رہتا تھا۔ کافی تلاش کے بعد اسی فلیٹ کے پچھواڑے میں ایک بوسیدہ مکان ملا جس کے دروازے پر فالکر کے نام کی تختی آویزاں تھی۔ اب معلوم ہوا کہ نمبر کے ساتھ B.y بیک یارڈ (Back yard) کے معنوں میں استعمال ہوا تھا۔ میں نے لیٹر بکس پر لگا ہوا گھنٹی کا بٹن دبایا لیکن اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ گھنٹی شاید کام نہیں کر رہی تھی۔ دروازے سے پیچھے ہٹ کر میں نے پوری قوت سے فالکر کا نام پکارا۔ فوراً ہی ٹین کی چھت میں سے ایک روشن دان کھلا اور بیچ میں سے فالکر کا گنجاسر برآمد ہوا۔ داڑھی غائب تھی مگر مونچھیں جوں کی توں تھیں۔ مجھے دیکھ کر اس کا منہ حیرت سے کھل گیا اور وہ روشن دان بند کر کے اسی وقت نیچے آ گیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔

”فالکر تمہارے خون میں صرف مصوری کے سرخ جوڑے ہی گردش کر رہے ہیں۔ اس میں کاروبار کے سفید جڑے سرے سے موجود ہی نہیں۔“ میں نے اس کی بے بسی سے متاثر ہو کر کہا۔

”اگر کبھی میرے جسم میں ایسے جڑے پیدا ہوئے تو اس روز میرا خون جم جائے گا، ٹھنڈا ہو جائے گا“ اس کے لہجے میں غصہ تھا۔

”گرم کافی کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس کمرے میں بے حد سردی ہے۔“ میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

”سوری“ اس نے دونوں ہاتھ ہوا میں اٹھادیئے۔ ”میں اچھا میزبان ثابت نہیں ہوا۔ آج ہیٹر بھی کام نہیں کر رہا۔ میں ابھی کافی بنا کر لاتا ہوں۔“ اس نے باقی تصاویر اٹھا کر واپس کونے میں رکھ دیں اور باورچی خانے میں چلا گیا۔ میں کرسی سے اٹھ کر الماری میں رکھی ہوئی مصوری کی تصویردار کتابیں دیکھنے لگا۔ یکدم کمرے کا دروازہ چوہٹ کھل گیا اور ایک سیاہ بالوں والی نرم و نازک لڑکی تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ اس نے جلدی سے پاؤں کی ایک زوردار ٹھوک سے دروازہ اس طرح بند کیا جیسے کوئی خطرناک شخص اس کا تعاقب کر رہا ہو۔ ”اف باہر تو خوب سردی ہے۔“ اس نے ٹھٹھرتے ہوئے بے دھیانی میں کہا۔ اس کی نظریں فالکر کی کرسی پر تھیں اور پھر اسے وہاں نہ پا کر فوراً کتابوں کی الماری تک آ گئیں جہاں میں منہ کھولے اس خوبصورت بلا کو دیکھ رہا تھا۔

”اوہ“ وہ مجھے دیکھ کر ٹھٹھک گئی، وہ منی سکریٹ میں بالکل چینی گڑیا لگ رہی تھی۔

”کیرن“ باورچی خانے سے فالکر کی آواز آئی۔ ”یہ مشیل ہے میرا پاکستانی دوست۔“ اس نے آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور مسکرا دی۔ اس کا ہاتھ ٹھنڈا خن تھا اور مسکرانے سے اس کی چپٹی ناک اور پھیل گئی تھی۔

”یہ میری بیوی ہے۔“ فالکر نے باورچی خانے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں کافی کی پیالیاں تھیں۔ ”ہسپتال میں نرس ہے۔ تصویریں نہ لیں تو اس کی تنخواہ کام آتی ہے۔“

”اوہ فالکر“ کیرن نے پیار سے احتجاج کیا اور لوہے کے ہیٹر کے پاس جا کر اپنے ہاتھ

جالی پر رکھ دیئے۔ اسے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ آج ہیٹر کام نہیں کر رہا۔

”ٹھیک ہی تو کہتا ہوں“ فالکر نے مجھے کافی کی پیالی پکڑاتے ہوئے کہا۔ ”ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے نہایت ہی موزوں ہیں۔ بھلا ہوا سچینی ملاح کا جو چوبیس سال قبل ہیبرگ کی ایک حسینہ پر اس بری طرح فدا ہوا کہ پورے چوبیس گھنٹے اس کے پاس رہا اور پھر غائب ہو گیا۔“

”فالکر“ کیرن ایک زخم خوردہ ملی کی طرح غرائی۔ ”تمہیں شرم آنی چاہئے۔“

میرے ذہن سے ایک بوجھ اتر گیا۔ جب سے کیرن اس کمرے میں داخل ہوئی تھی میں اس کی غیر یورپی شکل و شباہت کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ کالے بال، قدرے چپٹی ناک اور سیاہ نیم وا آنکھیں۔ تو یہ سب کچھ چینی خون کی آمیزش کا کرشمہ تھا۔

”شرم کی کون سی بات ہے؟“ فالکر نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اس میں تمہارا قصور نہیں۔ اگر قصور وار ہے تو تمہاری ماں جو تمہیں پیدائش کے فوراً بعد یتیم خانے میں داخل کر دیا یا پھر وہ چینی ملاح جو تم دونوں کے وجود سے بے خبر شاید اس وقت ہانگ کانگ کی کسی سوزی وانگ کے ساتھ گھوم رہا ہوگا۔“

کیرن ٹھنڈے ہیٹر سے ہٹ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔ اب فالکر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”اے اپنے ماں باپ سے شکوہ نہیں ہونا چاہئے۔ میرے والدین تو شادی شدہ تھے مگر اس سے مجھے کیا فائدہ ہوا۔ میرا باپ فوج میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ جنگ میں مارا گیا تو میری ماں نے ایک قصائی سے شادی کر لی۔ وہ قصاب کا بچہ مجھے پینٹا بھی اور پھر روزانہ تین سؤروں کی بوٹیاں بھی کھاتا۔ آخر میں گھر سے بھاگ نکلا۔ مدتوں در بدر کی ٹھوکریں کھانے اور اتنی محنت کرنے کے باوجود میں اب صرف ایک غیر معروف مصور ہوں۔ ہیبرگ میں رواج ہے کہ ہر ماہ کی آخری تاریخ کو لوگ اپنا پرانا اور ناکارہ سامان گھروں کے سامنے ڈھیر کر دیتے ہیں تاکہ بلدیہ کا ٹرک اس کوڑے کرکٹ کو اٹھالے جائے۔ میں ٹرک آنے سے پیشتر ہی وہاں پہنچ جاتا ہوں ان ڈھیروں میں سے کام کی چیزیں اٹھالیتا ہوں۔ یہ جالی دار لوہے کا ہیٹر جو آج کام نہیں کر رہا۔ ریڈیو جو اکثر کام نہیں کرتا۔ کپڑے دھونے کی مشین جسے چلانے کے لیے ہم لکڑی کا ڈنڈا استعمال کرتے ہیں کیونکہ اس میں بجلی کی رو آ جاتی ہے اور پھر یہ بلوریں فانوس سبھی مال غنیمت

ہے۔“ اس نے کافی کا پہلا گھونٹ بھرا اور برسا منہ بنالیا۔ ”ٹھنڈی ہو گئی ہے۔“ اور ہاں تم کیرن کو ساتھ لے کر یوتھ ہوٹل سے اپنا سامان لے آؤ۔“ اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا ”مجھے ایک ضروری ڈرائنگ مکمل کرنا ہے۔“

”مجھے ہوٹل میں ہی رہنے دو۔“ میں نے فالکر کی معاشی مجبوریوں کے پیش نظر درخواست کی۔ ”تمہارے پاس اتنی جگہ بھی نہیں اور پھر.....“

”پھر کیا؟“ اس نے مصنوعی غصے سے میری کمر پر ایک دھپ رسید کی۔ ”کیا تمہیں اس سٹوڈیو میں رنگوں کی بو پسند نہیں؟“ تمہارے پاس ہی ٹھہرو گے۔“

میں نے ہاتھ اٹھا کر کندھے کیڑے اور مسکرا دیا۔ ”جیسے تمہاری مرضی۔“

میں اور کیرن جب سامان لینے کے لیے یوتھ ہوٹل پہنچے تو معلوم ہوا کہ مکینوں کو پانچ بجے سے پہلے اپنے کمروں میں جانے کی اجازت نہیں۔ ابھی صرف چار بجے تھے اس لیے ہم وقت گزارنے کی خاطر میز میزوں سے نیچے اتر کر بندرگاہ کے ساتھ والی سڑک پر آ گئے جہاں خوب چہل پہل تھی۔ بوڑھے بچوں پر بیٹھے اوگٹھ رہے تھے بچے آکس کریم کی دکانوں کا محاصرہ کیے ہوئے تھے اور باقی لوگ یا تو صرف چوڑے فٹ پاتھ پر چہل قدمی کر رہے تھے اور یا پھر گودی میں کھڑے جہازوں کے ملاحوں سے مصروف گفتگو تھے۔ مشروبات کے شال پر چند ملاح کھڑے تھے۔ ہم پاس سے گزرے تو سب گردنوں کو بل دے کر کیرن کی طرف نیدوں کی طرح تنکے لگے۔ ایک نے انگلیاں منہ میں گھسیڈ کر زور سے سیٹی بجائی۔

”مجھے ان لچے ملاحوں سے سخت نفرت ہے۔“ کیرن نے بیگ سے دھوپ کا چشمہ نکال کر پہن لیا۔ ”مجھے معلوم ہے میرا باپ بھی ان جیسا ہی ہو گا لیکن پھر بھی میرا جی چاہتا ہے کہ.....“ اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ پانچ بجے ہوٹل کھلا تو ہم سامان لے کر واپس سٹوڈیو آ گئے۔ فالکر ابھی تک ڈرائنگ بنانے میں مگن تھا۔

”تم تھکے ہوئے دکھائی دیتے ہو“ اس نے پنسل سے خطوط گہرے کرتے ہوئے کہا، ”غسل کر لو۔ طبیعت سنبھل جائے گی۔ غسل خانہ راہداری کے سرے پر ہے۔“

میں تو لیا لے کر غسل خانے میں پہنچا تو وہاں دروازے کی بجائے ایک قد آدم عریاں تصویر کا کیئوس لگا ہوا تھا۔ ٹائلٹ سیٹ کے عین اوپر ایک بوڑھے فوجی افسر کی رنگین تصویر آویزاں

تھی۔ فوجی کا ایک ہاتھ مضبوطی سے تلوار کے دسے کو تھامے ہوئے تھا اور دوسرا سینے پر رکھا تھا جہاں درجنوں فوجی نشان اور تمغے سجے ہوئے تھے۔

”فالکر یہ تصاویر کس کی ہیں؟“ میں نے کپڑے اتارتے ہوئے غسل خانے میں سے

آواز لگائی۔

”دروازے پر کیرن کی تصویر کا کیئوس لگا ہے۔ اس طرح غسل کے دوران اسے آئینے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔“ سٹوڈیو میں سے جواب آیا۔ میرے ہاتھ جہاں تھے وہیں رک گئے۔ ”اور ٹائلٹ سیٹ کے اوپر اپنے والد صاحب ہیں۔ بوڑھے کو لٹکانے کے لیے یہی جگہ مناسب ہے۔“

میں نے جلدی سے کپڑے دوبارہ پہننا شروع کر دیئے اور نہانے کا ارادہ ملتوی کر کے صرف منہ ہاتھ دھو کر رہی باہر آ گیا۔

”رات کے کھانے پر ڈاکٹر شمت اور ان کی اہلیہ آ رہے ہیں۔ میرے گئے پنے مداحوں میں سے ہیں“ فالکر نے مجھے بتایا۔ میں نے دیکھا کہ رنگ کے ڈبوں والی میز کو صاف کر کے اس پر بستر کی چادر بچھا دی گئی تھی۔ میز پر صرف تھوڑا سا پیئر اور چند ڈبل روٹیاں سجی تھیں۔

”ہو سکتا ہے فالکر کی کوئی تصویر خرید لیں۔“ کیرن نے پرامید ہو کر کہا اور الماری سے دو ادھ جلی موم بتیاں نکال لائی۔ اس نے موم بتیاں روشن کر کے میز کے وسط میں رکھ دیں۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر شمت اور ان کی اہلیہ بھی آ گئے۔ ڈاکٹر کے ہاتھ میں دو بھاری لفافے تھے۔ ”فالکر، میں تمہارے لیے تلے ہوئے مرغ اور وائن لایا ہوں۔ شاہکار تخلیق کرنے کے لیے بھرا ہوا پیٹ نہایت ضروری ہے اور وہ صرف ڈبل روٹی اور پیئر سے نہیں بھرتا۔“

ڈاکٹر شمت کو اپنے پسندیدہ مصور کے مالی حالات کا بخوبی علم تھا۔ وہ جب بھی اسے ملنے آتا تو خوراک کے لفافے ساتھ ضرور لاتا۔ کیرن نے جھٹ سے لفافے کھول کر مرغ اور بوتلیں میز پر رکھ دیں اور الماری سے دو اور موم بتیاں نکال کر میز پر سجا دیں۔

اس شب ہم دیر تک کھانے کی میز پر بیٹھے مختلف مصوروں کے بارے میں تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ ڈاکٹر شمت کو مشرقی مصوری سے بے شمار اختلافات تھے۔

”آخر آپ لوگ تصویر کشی کے وقت ماڈل کیوں نہیں استعمال کرتے؟ ماڈل کے بغیر

تصویر میں زندگی کی لہر نہیں دوڑتی۔ ظاہر ہے بند کمرے میں بیٹھ کر اگر خوبصورت وادیوں، جھیلوں اور حسین عورتوں کی تصویریں بنائی جائیں تو ان میں قدرتی رنگ ناپید ہوگا۔“

میں نے اسے بتایا کہ ہمیشہ سے مغرب میں ظاہر اور مشرق میں باطن کی تقلید ہوتی رہی ہے۔ یہی صورت مصوری میں بھی ابھری ہے۔ ایک خوبصورت عورت کو ماڈل بنا کر تصویر کشی کرنا امتحان میں بیٹھے ہوئے اس طالب علم کی طرح ہے جو پرچہ حل کرتے وقت کتابوں کی مدد لیتا ہے۔ ادھر مشرقی مصوران بیساکھیوں پر انحصار نہیں کرتا بلکہ اپنے اندر ڈوب کر ایک ایسی من مہنہ صورت تخلیق کرتا ہے جس کی خوبصورتی کے پیمانے اس کے اپنے باطنی جذبات کا مظہر ہوتے ہیں۔ چشم آہو، صراحی دار گردن وغیرہ انہی باطنی جذبات کی عکاسی ہیں۔“

کھانے کے اختتام پر ڈاکٹر شمت کی فرمائش پر فالکر نے اپنی تازہ ترین تصاویر دکھائیں جن میں سے دو کو شرف قبولیت حاصل ہوا اور ڈاکٹر نے مناسب قیمت دے کر انہیں خرید لیا۔ کیرن اور فالکر کے چہرے تصویروں کی فروخت پر خوشی سے دک رہے تھے۔ ڈاکٹر شمت اور اس کی اہلیہ کے رخصت ہوتے ہی فالکر نے آسمان سر پر اٹھالیا۔

”میرا خیال ہے اسی خوشی میں کل دریائے ایلبا (Elbe) کے کنارے پلنگ منائی جائے۔“ کیرن نے چاروں موم بتیاں گل کر کے واپس الماری میں رکھتے ہوئے کہا۔

”ڈارلنگ“ فالکر دونوں ہاتھ پھیلا کر کیرن کی طرف بڑھا۔ ”بڑا ہی اچھا خیال ہے بلکہ اسی خوشی میں.....“

”فالکر کے بچے اگر تم نے میری طرف ایک قدم بھی بڑھایا تو.....“ کیرن ہاتھ میں پکڑے ہوئے کھانے کے کانٹے کو ماہر شیرزنوں کی طرح فالکر کے سینے پر رکھ کر ہنس دی۔

”آہم“ میں نے کھانس کر انہیں اپنی موجودگی کی اطلاع دی اور اپنا تھیلہ اٹھا کر سونے کے کمرے میں آ گیا۔

دوسری صبح غسل خانے میں فالکر کے والد صاحب سے شرف ملاقات حاصل کرنے کے بعد جب میں سٹوڈیو میں داخل ہوا تو وہاں ادھم مچا ہوا تھا۔ کیرن نے پچھلی شب اپنے تمام مصور دوستوں کو آج کی پلنگ پر مدعو کر لیا تھا چنانچہ اکثر حضرات اپنے بال بچوں سمیت صبح ہی وارد ہو گئے تھے۔ فالکر نے سب سے میرا تعارف کروایا۔ ایک سنہری بالوں والی ننھی مٹی گڑیا فوراً میری

دوست بن گئی اور میرے پہلو میں آ بیٹھی۔

”انکل آپ کا رنگ بالکل سوس چاکلیٹ کا سا ہے۔“

”اور تمہارے بال پاکستانی گندم کی سنہری بالیوں جیسے ہیں۔“ میں نے اس کی مٹی سی

پونی ٹیل کھینچتے ہوئے کہا۔

سب لوگ پلنگ پر لے جانے کے لیے اپنے ساتھ خوراک کی ٹوکریاں لائے تھے۔ کارل نے جو سب سے کم عمر تھا اعلان کیا کہ وہ بیئر کا ایک پورا کریٹ لایا ہے۔ اس پر زبردست نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے۔ میں نے کیرن سے درخواست کی کہ میرے لیے اورنج جوس کی ایک دو بوتلیں رکھ لی جائیں۔ ”نڈ ہی جنونی“ اس نے اپنی چوٹی ناک سکیڑتے ہوئے کہا۔ ”میں نے بچوں کے لیے ٹوکری میں اورنج جوس بھی رکھا ہوا ہے تم ان سے حصہ بانٹ لینا۔“

فالکر کے فلیٹ سے یہ ہجوم مصوراں باہر نکلا اور پھر زمین دوز گاڑی میں بیٹھ کر شہر سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر ایک چھوٹے سے قصبے میں اتر گیا جو زمین دوز ریلوے کا آخری اسٹیشن بھی تھا۔ قصبے کی بڑی سڑک کے سرے سے بائیں ہاتھ ایک کچی پگڈنڈی نیچے کھیتوں میں اتر گئی تھی۔ اسی پگڈنڈی کے آخر میں دریائے ایلبا تھا۔ فالکر، کارلن اور گونسز پلنگ کا سامان اٹھائے سب سے آگے آگے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی فالکر پگڈنڈی کے ساتھ کھیتوں میں پڑے ہوئے کسی کوڑے کرکٹ کے انبار کو الٹ پلٹ کر اس میں سے ”نادر اشیاء“ تلاش کرنے لگتا۔ تھوڑی دیر میں اس نے سائیکل کا ایک ہینڈل، ٹوٹی ہوئی ایک ٹوکری، تام چینی کا ایک برتن اور جانے کیا کیا الا بلا اکٹھا کر لیا۔

”ان نادرا اشیاء سے ایک شاہکار جدید مجسمہ تیار ہوگا۔ عنوان ہوگا ”دریائے ایلبا کے کنارے پلنگ۔“ اس نے مجھے نہایت سنجیدگی سے بتایا۔

فالکر کے پیچھے پیچھے کارل خوش و خرم سر پر اپنا بیئر کا کریٹ اٹھائے بلند آواز سے جرمن لوک گیت الاپتا جا رہا تھا۔ جب بھی فالکر کھیتوں میں اپنے شاہکار مجسمے کا مواد ڈھونڈنے اترتا تو کارل بھی جھٹ سے مخالف سمت کے کھیت میں اتر جاتا۔ جلدی سے کریٹ میں سے بیئر کا ایک ٹین نکالتا اور غٹ غٹ پی کر پہلے سے زیادہ خوش و خرم جھومتا ہوا پگڈنڈی پر واپس آ جاتا اور اپنے گانے میں مگن ہو جاتا۔ ان حضرات سے چند گز ادھر شوخ رنگوں کی تنگ پتلونوں میں ملیوں خواتین

چکی ہے۔ واٹر پروف بادبانوں کے بغیر کشتی چلانا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ اس لیے فیصلہ ہوا کہ سب سے پہلے بادبانوں پر موم چڑھا لی جائے۔ اس مقصد کے لیے موم کو آہنی تسلوں میں ابالا جاتا ہے اور پھر بادبان اس اہلتی ہوئی موم میں بھگو کر سکھا لیے جاتے ہیں۔ دو پہیوں والی ایک گاڑی پر بادبان اور دوسری پر ”کشتیوں کی کلب“ سے حاصل کردہ آہنی تسلے رکھے گئے اور ہم ان کو دھکیلے ہوئے سرکنڈوں کے ایک گھنے جھنڈ کو پار کر کے دریا کے کنارے پر لے آئے۔ اس جگہ دریائے ایلبا کا پاٹ بہت وسیع تھا اور دوسرا کنارہ ایک دھندلی لکیر کی صورت میں دکھائی دے رہا تھا۔ پتھروں کے حفاظتی بند اور دریا کے پانی کے درمیان خشک ریت کا ایک وسیع میدان تھا۔ پلنگ کے لیے ایک موزوں جگہ تلاش کر کے قافلہ رک گیا۔ فالگر نے سرکنڈوں میں سے لکڑیاں چن کر الاؤ روشن کیا اور موم کو تسلوں میں ڈال کر گرم کرنے کے لیے رکھ دیا گیا۔

سنہری بالوں والی گڑیا نے میری انگلی پکڑ لی ”انکل آئیے ریت میں کھیلے ہیں۔“

گڑیا کے ہاتھ میں ایک بڑا گیند تھا۔

”میں بھی کھیلوں گی۔“ کیرن نے گڑیا سے گیند لے کر ہوا میں اچھال دیا۔ تھوڑی دیر میں دوسرے بچے بھی کھیل میں شریک ہو گئے۔ ہمارے سامنے ایلبا سے ایک چھوٹی ندی جدا ہو کر سرکنڈوں کی جانب مڑ گئی تھی۔ ندی کے دوسرے کنارے پر گھنی جھاڑیاں تھیں جن کے ساتھ چند لوگ پانی میں نہا رہے تھے۔ کچھ ریت پر اوندھے لیٹے دھوپ سینک رہے تھے۔

”ندی کے دوسرے کنارے پر لیٹے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہے ہو؟“ کیرن نے

مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”جانتے ہوں انہوں نے نہانے کے لیے کیا پہن رکھا ہے؟“

میں نے آنکھیں میچ کر جاننے کی کوشش کی۔ ”بہت دور ہیں۔ صاف دکھائی نہیں

دیتا۔“

”وہ سب پیدائشی لباس میں ہیں۔“

”یعنی وہ بالکل.....“ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔

”بالکل“ کیرن نے گیند گڑیا کی طرف اچھال دیا اور پھر اس کے پیچھے بھاگ گئی۔

سورج کی پرستش یورپ کا غیر سرکاری مذہب ہے۔ ان کے نزدیک ہر درد کا درماں

”دھوپ سینکنا“ ہے۔ ڈاکٹر حضرات بھی اطالیہ اور ہسپانیہ کی سنہری دھوپ کو اکسیر اعظم کا درجہ دیتے

اور بچے تھے جو بار بار کھیتوں میں اتر جاتے اور رنگ برنگے پھول توڑ لاتے۔ سب سے پیچھے میں چل رہا تھا میں نے ایک موڑ پر پیچھے مڑ کر دیکھا، ہم آبادی سے بہت دور نکل آئے تھے۔ موسم صبح سے ہی خوشگوار تھا۔ تاحد نظر پھولی ہوئی سرسوں کے ہنسی کھیت دھوپ میں چمک رہے تھے۔ کھیتوں میں کہیں کہیں گل لالہ کے سرخ دھبے دکھائی دے رہے تھے۔ ان سے پرے ہرے بھرے پستہ قد درخت قطار اندر قطار کھڑے تھے۔ اس خوبصورت میدان میں صرف تیز رنگ ہی نمایاں تھے۔ گل لالہ کا آتشیں سرخ، نیلگوں آسمان، تیز ہنسی اور گہرا سبز، دھوپ کی شدت نے رنگوں کی تیزی میں خیرہ کن چمک پیدا کر دی تھی۔ میرے سامنے قدرت کی نیلگیوں کا ایک وسیع کیونس پھیلا ہوا تھا۔ ہوا میں ایک چلبلائی ہوئی مہک اور محوور کن تازگی تھی۔ میرے ذہن میں ولندیزی مصور فان گوگ کے شوخ رنگ، موپاساں کی قدرتی منظر نگاری اور جوش کی نظم ”زندگی“ کے الفاظ تیرنے لگے۔ اس لمحے زندگی کتنے خوبصورت رنگوں سے مزین تھی۔ دھانی، چمپئی، آسمانی، سنہری، ارغوانی۔

”شیل۔“ کیرن کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ مجھ سے کافی فاصلے پر ایک ٹیلے پر کھڑی ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے آوازیں دے رہی تھی۔ باقی تمام لوگ نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا اس کے پاس پہنچا۔

”دریائے ایلبا۔“ کیرن نے ہاتھ سے ہوا میں نیم دائرہ بناتے ہوئے سامنے اشارہ کیا۔

کچھ فاصلے پر جہاں پگھلنے والی ختم ہوتی تھی وہاں دریائے ایلبا کا پرسکون پانی میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ دریا کی گزرگاہ کے ایک پہلو میں سینکڑوں بادبانی کشتیاں سطح آب پر ساکن کھڑی تھیں۔ کشتیوں کے لمبے مستول ابھی تک خالی تھے۔ ان پر بادبان لپیٹے ہوئے تھے۔ پانی کے درمیان میں لکڑی کے تختوں کا ایک مضبوط رستہ تھا جس کے گرد مختلف قد و قامت کی کشتیاں رسوں سے بندھی ہوئی تھیں جیسے ہمارے دیہات میں بیلوں کو کھڑی کے دونوں طرف باندھ دیا جاتا ہے۔ چند کشتیوں کے مالک بانس کے مستولوں پر چڑھ کر بادبان کھول رہے تھے۔ بادبانوں میں ہوا بھرتی تو کشتی ایک اصل مرغ کی مانند سینہ پھلا کر سینہ آب پر رواں ہو جاتی۔ گوئز نے بھی اپنی کشتی یہیں باندھ رکھی تھی اور اس کا ارادہ آج ہمیں سیر کرانے کا تھا، لیکن جب فالگر نے مستول پر چڑھ کر بادبان کھولے تو معلوم کہ ان پر موم کی ہلکی تہ جو کپڑے کو پانی سے محفوظ رکھتی ہے بالکل اتر

ہیں۔ جو لوگ سفر کی توفیق نہیں رکھتے وہ بجلی کے بڑے اور تیز رفتروں کے سامنے لیٹ کر اور ریکارڈ پلیئر پر ہسپانوی دھنیں، بجا کر ہی اپنا شوق پورا کر لیتے ہیں۔ بعض منچلے تو اپنے جنوں میں اس حد تک آگے نکل گئے ہیں کہ انہیں دھوپ سینکنے کے دوران ڈھائی گرہ کا جامہ غسل زیب تن کرنا بھی ناگوار گزرتا ہے۔ چنانچہ اس نیک مقصد کے لیے متعدد انجمنیں قائم ہیں۔ ”عشاق آفتاب کلب“ ”قدرتی روپ کے متوالوں کی کلب“ اور ”پرستش قدرت کلب“ وغیرہ۔ اسی قسم کی ایک کلب چند برس پیشتر جنوبی فرانس کے ساحلی جزیرے ”آئل ڈی لیوان“ میں بھی قائم تھی۔ میں ان دنوں اپنے دو انگریز دوستوں کے ہمراہ مانی کارلو میں چھٹیاں گزار رہا تھا۔ انہیں انسانوں کا یہ قدرتی رنگ دیکھنے کا بے حد اشتیاق تھا۔ وہ زبردستی مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ ”لیوان“ کے لیے نیس شہر سے باقاعدہ سیٹر چلتے تھے۔ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد جب ”لیوان“ کی بھوری اور خشک زمین نیلے سمندر میں سے ابھری تو اکثر مسافروں نے کپڑے اتار کر جامہ غسل زیب تن کر لیے۔ میں میں ایک نیلی نیکر اور پیلے رنگ کی سپورٹس شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ گھاٹ پر اترتے ہی کلب کے ایک کارندے سے پالا پڑ گیا۔ ”مہربانی کر کے اپنے تمام کپڑے اتار دیجئے۔“

”میں تو صرف دیکھنے آیا ہوں۔“ میں نے گھبرا کر اپنی نیکر کو دونوں ہاتھوں سے اس طرح تھام لیا جیسے مجھے خدشہ ہو کہ کہیں وہ حضرت زبردستی پر نہ اتر آئیں۔

”پھر مجبوری ہے۔ کپڑے پہن کر جزیرے میں داخل ہونا ممنوع ہے۔“

ادھر میرے انگریز دوستوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ حکم کی تعمیل کی اور کلاںچیں بھرتے ہوئے جزیرے میں غائب ہو گئے۔ اس دوران میں گھاٹ پر بیٹھا ان کا انتظار کرتا رہا اور شام کو بے نیل و مرام واپس نیس پہنچ گیا۔

”ٹن۔ ٹن۔ ٹن.....“ فالکر ایک لکڑی سے آہنی تسلے کو زور زور سے بجا رہا تھا۔ ”خواتین و حضرات کھانا تیار ہے۔“ پتھروں پر الاؤ روشن تھا۔ ہر ایک کو ایک ڈبل روٹی، کچے گوشت کا ٹکڑا اور حسب پسند بیریا اور نج جوس کی بوتل تھما دی گئی۔ میں نے اپنے حصے کا گوشت ایک سلاخ پر ٹانکا اور آگ میں جھونک دیا۔ چربی پکھل کر لکڑیوں پر گر گئی تو الاؤ اور تیز ہو جاتا۔ کھانے کے بعد سب نے مل کر بادبانوں کو ابلتی ہوئی موم میں اچھی طرح بھگایا اور پھر ریت پر سوکھنے کے لیے پھیلا دیا۔ دریائے ایلبا سے آتی ہوئی خشک ہوا اور جھنے ہوئے گوشت

کی آمیزش نے مجھ پر غنودگی طاری کر دی۔ میں حفاظتی بند کے آگے آگے ہوئے گھنے سرکنڈوں کے اندر چلا گیا اور کچھ دور چلنے کے بعد ایک چھوٹے سے کنج میں سستانے کے لیے لیٹ گیا۔ سرکنڈوں میں سے گزرتی ہوئی خشک ہوا کی دل آویز سرسراہٹ اور نیم تاریک ماحول اوگھنے کے لیے نہایت موزوں تھا۔ جانے میں وہاں کتنی دیر تک وقت اور مقام کی حدوں سے بے خبر بیٹھا رہتا اگر فالکر میری تلاش میں ادھر نہ آ نکلتا۔

”ہم سب تمہیں پچھلے ایک گھنٹے سے تلاش کر رہے ہیں۔ آخر ان سرکنڈوں میں چھپ کر لیٹے رہنے میں کیا تمک ہے؟“ اس نے مجھے نہایت غصے سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

”تم جانو ہم مشرق کے باسی کھانے کے بعد قیلولہ ضرور کرتے ہیں۔“ میں نے جھینپ کر کہا۔

”اب تم مغرب میں ہو۔“ اس نے ہنس کر کہا اور ہاتھوں سے سرکنڈے ہٹاتا ہوا واپس چلا گیا۔ میں جب واپس کنارے پر آیا تو ایلبا پر ڈھلتے سورج نے ایک سرخ چادر پھیلا رکھی تھی۔ بادبانی کشتیاں دور سے پانی کی سطح پر بالکل ساکن لگ رہی تھیں۔ اب واپسی کی تیاری تھی۔ گوئٹز اور کلن ریت پر پھیلائے ہوئے بادبانوں کو سمیٹ کر دوپہیوں والی گاڑی میں رکھ رہے تھے۔

”مجھے افسوس ہے کہ آج بادبان اچھی طرح سوکھ نہیں پائے“ گوئٹز نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”اس لیے ایلبا میں ششی رانی کسی اور دن پر اٹھائے رکھتے ہیں۔“

”آؤ ان خالی بوتلوں اور ڈبوں کو دریا میں پھینکیں۔“ فالکر نے دریا کی سطح پر نظر جما کر کہا، ”دیکھیں کون دور پھینکتا ہے۔“

میں نے اورنج جوس کی ایک بوتل اٹھائی اور بازو گھما کر پورے زور سے دریا کی پرسکون اور ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں سے روشن سطح پر لڑھکا دی۔ بوتل ایک چھناکے کے ساتھ پانی سے ٹکرائی اور پھر اسی لمحے شراب سے ڈوب گئی۔

دریائے ایلبا کے کنارے ایک خوبصورت پکنک اور ایک چمکتے ہوئے دن کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

عبور کر کے ڈنمارک میں کروڑا کے مقام پر کھڑا تھا۔ سڑک پر کاروں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اکثر لوگ صبح سویرے یا شام کے وقت سرحد عبور کرتے ہیں اور اب دوپہر ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جرمنی کی سرحد کی طرف سے ایک سرخ رنگ کی سپورٹس کار فرمائے بھرتی ہوئی نکلی، میں نے ایک دم ہاتھ آگے کر دیا تو کار رک گئی۔ درمیانی عمر کی ایک خوش شکل سرخ بالوں والی عورت ڈرائیور کی نشست پر بیٹھی تھی۔

”کہاں جاؤ گے؟“ اس نے آنکھوں سے کالا چشمہ اتار کر میرا جائزہ لیا۔

”اوڈنزے (Odense) میں نے نیچے جھک کر جواب دیا۔

”بیٹھ جاؤ“ اس نے سٹیئرنگ سے ہاتھ اٹھا کر دروازہ کھول دیا۔

کار میں چونکہ صرف دو نشستیں تھیں اس لیے میں نے سامان کا تھیلہ اپنی گود میں ہی رکھ لیا۔ عورت نے خود ہی دروازہ بند کیا۔ چشمہ آنکھوں پر جمایا اور ایک سیلیٹر پر پاؤں رکھ دیا۔ کار ایک زوردار جھٹکے سے حرکت میں آئی اور میں سامان سمیت باہر گرتے گرتے بچا۔

”ایزی بوائے“ (Easy Boy) سرخ بالوں والی نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ایک تو کار بغیر چھت کے تھی اور دوسرے رفتار نہایت تیز تھی نتیجہ یہ نکلا کہ میں ہوا سے بچاؤ کی خاطر اپنے سامان کے پیچھے سر چھپائے دبکار ہا اور ارد گرد کے خوبصورت مناظر دیکھنے سے محروم رہا۔

”انگریزی جانتے ہو؟“ سرخ بال مجھ سے مخاطب تھے۔

”ہاں جانتا ہوں!“ میں نے آنکھوں سے بہتا ہوا پانی رومال سے پونچھا۔

”تو پھر بولتے کیوں نہیں؟ میں نے تمہیں لفٹ اس لیے تو نہیں دی تھی کہ تم اپنے سامان میں سر دیئے خاموش بیٹھے رہو۔“

گویا لفٹ کی قیمت چرب زبانی طے پائی تھی۔

”مختصر مدہ اگر آپ یہ کار قدرے آہستگی سے چلائیں تو کچھ عرض کروں۔“ میں نے

غصے سے جواب دیا۔

”سوری“ اس نے مہری بات کا بالکل برانہ مانا اور رفتار کم کر دی۔

میں نے سامان کے پیچھے سے اپنا سر اٹھایا۔ ایک ہاتھ سے بکھرے ہوئے بالوں کو درست کیا۔ پہلے فر فر اپنا تعارف کروایا اور پھر مختصر مدہ کا حدود اربعہ دریافت کیا۔

پریوں کا شہر - اوڈنزے

”یہ ڈنمارک کے پہلے نانبائی کی دکان ہے۔“ جرمنی کی سرحد عبور کر کے ڈنمارک میں داخل ہوتے ہی آپ کی نظر اس اشتہار پر پڑتی ہے۔ میں ڈبل روٹی خریدنے کے لیے دکان کے اندر گیا تو نانبائی نے ڈنمارک کی روایتی مہمان نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قیمت لینے سے انکار کر دیا۔

”تم پہلے پاکستانی ہو جو ڈنمارک کے پہلے نانبائی کی دکان میں آئے ہو“ اس نے ڈبل روٹی لفافے میں بند کر کے مجھے تھادی ”اور آخری نانبائی بھی۔“

”وہ کیسے؟“ میں نے ڈبل روٹی سامان کے تھیلے میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

”باہر جا کر اشتہار کی پشت پر لکھی ہوئی عبارت پڑھ لو“ اس نے ہنس کر کہا۔ میں نے باہر آ کر اشتہار کی دوسری طرف دیکھا تو وہاں لکھا تھا ”یہ ڈنمارک کے آخری نانبائی کی دکان ہے۔“

یہ ایک خوبصورت اختراع تھی۔ ظاہر ہے جرمنی کی سرحد عبور کر کے ڈنمارک آنے والوں کے لیے وہ پہلا نانبائی تھا اور ڈنمارک سے جرمنی جانے والوں کے لیے آخری۔ میں نے سڑک پار کی اور تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک موزوں جگہ پر اپنا سامان رکھ کر لفٹ کا انتظار شروع کر دیا۔ آج صبح جب میں بیمبرگ سے روانہ ہوا تو ایلبا کے کنارے منائی ہوئی حسین پلنک کی سیلی اور خوشگوار مہک ابھی تک میرے ساتھ تھی۔ کل کی طرح آج بھی موسم بے حد خوبصورت تھا۔ متعدد لفٹوں کے ذریعے کیل سے ہوتا ہوا فلمینز برگ پہنچا جو جرمنی کا سرحدی شہر ہے اور اب میں سرحد

”میں امریکی ہوں۔“ محترمہ گویا ہوئیں ”خاندانی کلیسا میں محفوظ شجرہ نصب کے مطابق میرے آباؤ اجداد ڈنمارک سے ہجرت کر کے امریکہ کی ریاست ٹیکساس میں جا بسے تھے۔ میں یورپ میں تفریح کی غرض سے آئی تھی۔ سوچا لگے ہاتھوں آبائی وطن کی زیارت ہی کر لی جائے۔“

”آپ اپنے بال بچے امریکہ میں چھوڑ آئی ہیں کیا؟“ میں نے ذرا سوشل ہونے کی کوشش کی۔

”کون سے بال بچے؟“ وہ تیوڑھی چڑھا کر بولی ”میں غیر شادی شدہ ہوں“ اور ساتھ ہی کاری رفتار پھر تیز کر دی۔

”اچھا ہی ہوا جو میرے آباؤ اجداد اس ڈاک کے ٹکٹ جتنے ملک سے ہجرت کر گئے۔“ اس نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد ناک چڑھا کر کہا ”ہر طرف یا تو صرف زراعتی فارم نظر آتے ہیں یا گاٹیں، سور اور بطخیں۔“

”لنڈن اور نیویارک کی گھریلو عورتیں تو ڈنمارک کے گائے کے گوشت اور مکھن کی بے حد دلدادہ ہوتی ہیں۔“

”میں گھریلو عورت نہیں ہوں، ایک انشورنس کمپنی کی منیجر ہوں۔“ پھر غلطی ہو گئی تھی۔

کولڈنگ کے شہر سے دائیں ہاتھ مڑ کر ہم نے ایک لمبا پل عبور کیا جو ڈنمارک کے حصے جٹ لینڈ کو نیون کے جزیرے سے ملاتا ہے۔ نیون اور دوسرے جزیرے زی لینڈ کے درمیان چونکہ سمندری فاصلہ زیادہ ہے اس لیے وہاں دوسری طرف جانے کے لیے سیٹر استعمال ہوتے ہیں۔ ملک کا صدر مقام کپن ہیگن زی لینڈ کے جزیرے پر واقع ہے۔ ڈنمارک کی سطح تقریباً ہموار ہے۔ بلند ترین پہاڑی کی اونچائی پانچ سو فٹ سے بھی کم ہے۔ اہل ڈنمارک کی روایتی خوشدلی نے اس منی پہاڑ کو ”لیپس“ کا بلند و بالا نام دے ڈالا ہے۔ یہ ملک اتنا چھوٹا ہے کہ کسی بھی مقام سے سمندر تک کا فاصلہ تیس پینتیس میل سے زیادہ نہیں ہے ڈیڑھ کی اشیاء کے علاوہ یہاں کی کشید کردہ بیڑ بھی دنیا بھر میں مشہور ہے، جو بقول فاکر فرانیسی شپین سے بھی زیادہ حظ دیتی ہے۔ اپنے ننھے منے وجود کے باوجود اس ملک نے کئی قابل قدر ہستیوں کو جنم دیا۔ ان میں فلاسفر کرک گارڈ،

داستان گوائنڈرسن، سائنس دان بوہر فلم ڈائریکٹر اور موسیقار کارل نیلسن سرفہرست ہیں۔

اب ہم اوڈنزے کے قریب پہنچ رہے تھے۔

”آ خر تم اوڈنزے کیوں جا رہے ہو؟“ سرخ بال میری ساری خطائیں بھول چکے تھے۔

”اوڈنزے؟“ میری آنکھوں کے سامنے دودھیا پھلجھڑیاں چھوٹیں اور پرپیاں ناچنے

لگیں۔ ”وہاں ہائز کرچن اینڈرسن رہتا تھا۔“

”ہا، ہا“ سرخ بالوں نے ایک بھر پور قہقہہ لگایا ”بگ بوائے کو ابھی تک پریوں کے قصے

پسند ہیں۔“ اس کی ہنسی کسی طرح رکنے میں ہی نہ آ رہی تھی۔ ”یہ سب تو بچپن کی چیزیں ہیں۔“

”آپ کی طرح میرے بچپن کو گزرے زیادہ عرصہ نہیں ہوا“ میں نے جل کر کہا۔ زیادہ

سے زیادہ مجھے کار سے اتار دے گی ناں۔ میں نے سوچا سرخ بالوں والی ڈائن کہیں کی۔

اس نے ہنسنا بند کر دیا اور یکدم سنجیدہ ہو گئی ”ہاں شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔“

اوڈنزے پہنچنے پر اس نے کار شہر کے پرانے ٹاؤن ہال کے سامنے کھڑی کر دی۔ میں

کار سے نیچے اترا۔ لفٹ کے لیے شکر یہ ادا کرنے کے بعد اپنا سفری تھیلہ اٹھانے لگا تو سرخ بالوں

نے اسے میرے ہاتھ سے لے لیا ”اسے کار میں ہی رہنے دو۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں“

وہ کار سے باہر نکلی اور دروازہ مقفل کر دیا۔ ”میں بھی پریوں کی کہانیوں کے اس شہر میں گھوم کر آج

اور بچپن کے درمیان گزرے ہوئے فاصلوں کا تعین کرنا چاہتی ہوں۔“

”اوڈنزے۔“ اوڈن کا مسکن“ اوڈن جو عیسائیت کی آمد سے قبل ان خطوں میں دیوتا

مانا جاتا تھا۔ تنگ پتھر ملی گلیاں، پرانی وضع کے چوبی مکانات، ہم اینڈرسن کے گھر کی جانب جا

رہے تھے۔

وہ اپنے پھٹے ہوئے لباس اور سر کے بالوں میں رنگ برنگے پھول اور جانوروں کے

سفید پر سجا کر انہی گلیوں میں گھومتا رہتا۔ قصبے کے بچوں کا ایک جم غفیر غل چاتا، اچھلتا کودتا اس

کے پیچھے لگ جاتا۔ وہ ان معصوم چہروں کو قصبے سے باہر ایک ندی کے کنارے لے جاتا جہاں ایک

اونچے پتھر پر بیٹھ کر وہ انہیں جل پریوں، شہزادیوں اور بلبلوں کی کہانیاں سناتا۔ ہر کہانی کے خاتمے پر

بچے تالیاں پیٹ پیٹ کر اس سے ایک اور نئی کہانی کی فرمائش کرتے اور وہ اسی وقت اپنے ذہن

پر زور دے کر ایک اور خوبصورت کہانی تخلیق کر لیتا۔ اینڈرسن یونہی اس پتھر پر بیٹھا بچوں کو کہانیاں سناتا رہتا یہاں تک کہ شام ہو جاتی۔ وہ ان کے معصوم چہروں کو خوشی اور پسندیدگی کے جذبات سے دھکتے دیکھتا تو اس کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ”بے شک میں ایک عظیم ادیب ہوں“ وہ تالیوں کے شور میں اعلان کرتا ”لیکن تعریف تو صرف اس خدا کے لیے ہے جس نے مجھے عظیم بنایا۔“

اس کی بے پناہ مقبولیت صرف اوڈنزے کے بچوں تک محدود تھی۔ قصبے کے بڑے بوڑھے اسے دیکھ کر منہ پھیر لیتے۔ ”ایک ایسا شخص ادیب کیسے ہو سکتا ہے جس کا باپ موچی اور ماں گھریلو خادمہ تھی اور جس نے ایک خیراتی ادارے میں تعلیم حاصل کی ہو۔“ اینڈرسن جہاں بھی جاتا اس پر لجن طعن کی بھرمار ہوتی۔ وہ سوچتا شاید یہ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ جید نقاد اور امیر لوگ ہی ایک عظیم ادیب کی پہچان کر سکتے ہیں۔ اوڈنزے کے معصوم بچوں کی تالیاں اور تعریف بھلا کیا معنی رکھتی ہے۔ اس کا دل بچھ گیا اور اس نے اپنے گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ قصبے کے بچے اپنی پسندیدہ کہانیاں سننے کے لیے ترس گئے، وہ سب بے حد اس تھے۔ وہ اکثر اس کے گھر کے سامنے کھڑے ہو کر بلند آواز میں اس کی کہانیوں کے نام دہراتے۔ ”ہمیں ننھی جل پری چاہئے، ہمیں بد صورت بٹھے کی کہانی سناؤ“ اور پھر شور مچاتے تاکہ وہ باہر نکل کر انہیں ندی کے کنارے لے چلے، لیکن وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں بیٹھا کڑھتا رہتا۔

اسی دوران اسے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی۔ لڑکی کو جب اینڈرسن کے جذبات کا علم ہوا تو اس نے اسے ایک خط لکھا ”میرے دل میں تمہارے لیے عزت کے جذبات تو ہیں لیکن میں تم جیسے بد صورت آدمی سے کبھی محبت نہیں کر سکتی۔“ اینڈرسن کو پہلی بار اپنی لمبی ناک، دھنسی ہوئی آنکھوں اور چہرے کی ابھری ہوئی بدنما ہڈیوں کا احساس ہوا۔ اس آخری صدمے نے اسے نڈھال کر دیا اور اس نے ملک سے باہر جانے کی ٹھان لی۔ یورپ کے اکثر ملکوں میں اس کی کہانیاں شائع ہو چکی تھیں اور وہاں اس کا خاصا شہرہ تھا۔ وہ پرشیا گیا تو وہاں کے بادشاہ نے اس کے اعزاز میں ایک پر تکلف ضیافت کا اہتمام کیا۔ ہالینڈ، انگلینڈ اور اطالیہ میں اس کا فقید المثال استقبال ہوا اور پیشاوردہلی انعامات سے نوازا گیا۔ اوڈنزے کے عوام اور اخبارات نے پھر بھی اپنے عظیم سپوت کی ادبی صلاحیتوں کا اقرار نہ کیا۔ وہ یورپ سے واپس آیا تو اسے پھر طعن و تشنیع کا

سامنا کرنا پڑا۔ ”یہ ہے وہ بن مانس جو صرف باہر کے ملکوں میں مشہور ہے۔“ وہ جہاں سے گزرتا لوگ ٹھٹھا کرتے۔

جہاں تک اس بن مانس کا تعلق ہے اس نے ”بد شکل بٹھے“، ”بلبل“، ”فر کا درخت“ جیسی کہانیاں اور ننھی جل پری ایسے کردار تخلیق کیے۔ اس نے اپنی بد صورتی اور لوگوں کی نفرت کو معصوم اور خوبصورت کہانیوں کا روپ دے دیا۔ جب وہ مرا تو اس کی محبوبہ کا وہ خط جس میں اس نے 45 سال قبل اس کی محبت کو ٹھکرا دیا تھا اس کے سینے کے گرد ایک مٹھی پوٹی میں بندھا ہوا ملا۔ آج اس کی کہانیاں تقریباً دنیا کی ہر زبان میں ترجمہ کی جا چکی ہیں۔ اینڈرسن کی عظمت کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ دنیا کے ہر خطے میں رہنے والے بچے چاہے لاہور میں ہوں یا پکننگ میں، ٹمکنو کے رہنے والے ہوں یا نیویارک کے ہوں ہر شب اپنے سرہانے تلے ”اینڈرسن کی پریوں کی کہانیاں“ رکھ کر سوتے ہیں اور پھر حسین ننھی منی جل پریاں ان کے خوابوں میں ناچتی ہیں۔ یورپ میں انجیل کے بعد یہی کہانیوں کی کتاب سب سے زیادہ شائع ہوئی ہے۔ یہ کہتا ہے جا نہ ہوگا کہ اینڈرسن آج اپنے ملک ڈنمارک سے بھی زیادہ معروف ہے جس کے ایک چھوٹے سے قصبے کی تنگ گلیوں میں وہ بالوں اور لباس میں پھول سجائے گھوما کرتا تھا۔

اینڈرسن کے گھر کو اب ایک عجائب گھر کی شکل دے دی گئی ہے۔ یہاں سوکھے ہوئے پھولوں کا ایک گلدستہ رکھا ہے جو کسی بچے نے اسے تحفے کے طور پر دیا تھا۔ کانچ کی گولیاں، وہ مٹھل کی پوٹی جس میں اس کی محبوبہ کا خط محفوظ تھا۔ ذاتی استعمال کی لاتعداد اشیاء اور پھر اس کا بستر جس کی جانب اشارہ کر کے گائیڈ آپ کو بتاتا ہے۔ ”ڈینی کے جس نے اینڈرسن کی حیات پر مبنی ہالی وڈ کی فلم میں اینڈرسن کا کردار ادا کیا تھا اس بستر پر سویا تھا“ یعنی بوائے ڈینی کے کی تھی جو یہاں سویا اینڈرسن کی نہیں جو اس کا مالک تھا۔ گائیڈ کے اس فقرے پر مجھے احساس ہوا کہ شاید اوڈنزے کے عوام کو اب بھی اینڈرسن کی عظمت کا یقین نہیں آیا۔ ”جس کا باپ ایک موچی تھا اور ماں گھریلو ملازمہ.....“

اینڈرسن کے گھر کے پہلو میں پرانی وضع کا ایک ریستوران ہے جو اس کی مشہور کہانی ”بد شکل بٹھے“ سے موسوم ہے۔ ریستوران کی تمام آرائش اور فرنیچر اینڈرسن کے دور کا ہے۔ دیواروں پر اس کی مختلف کہانیوں کے کرداروں کی قد آدم تصاویر اور اس کی کتابوں کے اولین

نئے آویزاں ہیں۔

ہم شہر کے اس خوبصورت پارک میں گئے جہاں سرسبز درختوں کے جھنڈ کے پاس ایک خاموش ندی کے کنارے اینڈرسن نے ”بد شکل بطخ“ کی لازوال کہانی تخلیق کی۔ وقت کے تیز دھارے اس پرسکون ندی اور گرد کے جنگل کی خوبصورتی کو متاثر نہیں کر سکے۔ شام کے جھپٹے میں سینکڑوں سفید بطخیں پانی میں تیر رہی تھیں۔ ہم پارک سے نکل کر واپس ٹاؤن ہال کے چوک میں آئے تو نو بج چکے تھے۔ شمالی خطوں کی مخصوص نیم تاریک شب میں اوڈنزے کے کوچہ و بازار سنسان پڑے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس مکمل سکوت میں ابھی دھیرے سے پروں کی ہلکی سرسراہٹ ہوگی، لاکھوں گلرنگ انار چھوٹیں گے اور پریوں کا ایک جگمگھٹا آسمان سے اتر کر قصبے کی گلیوں میں ناچنے لگے گا اور پھر وہ سب مل کر اپنے خالق اینڈرسن کے پرانے مکان کو اپنے روپیلی پروں کے جال سے ڈھک دیں گی جس سے پھوٹی ہوئی کرنیں اس وسیع دنیا میں پھیل کر نیند میں مدہوش ننھے منے معصوم بچوں کے سینوں میں سما جائیں گی اور وہ سوتے میں مسکرا دیں گے۔

کوپن ہیگن کی دیوالی

سرخ بالوں والی کار میں خاموش بیٹھی ٹاؤن ہال کی پرانی عمارت کو تنگ رہی تھی۔
 ”میں آج پھر بچپن کی سرحدوں کو چھو آئی ہوں“ اس نے قدیم عمارت پر سے نظریں
 ہٹائے بغیر ادا سا ہو کر کہا ”تم ٹھیک کہتے تھے مجھے ان سرحدوں پر دستک دینے کے لیے بہت فاصلہ
 طے کرنا پڑا ہے۔“

میں نے اپنا سفری تھیلا اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ”اوڈنزے تو تم نے دیکھ ہی لیا
 ہے میرے ساتھ کوپن ہیگن تک کیوں نہیں چلتے؟“

تجویز معقول تھی پھر جانے کون کل تک یہ فسوں رہے نہ رہے اور دن کی روشنی میں
 اوڈنزے ایک سیدھا سادا اور معمولی سا قصبہ نکل آئے۔ کوپن ہیگن تک کا سفر رات کی تاریکی میں
 طے ہوا۔ نیون جزیرے کے خاتمے پر ہم کار سمیت سٹیئر میں سوار ہو گئے اور ایک گھنٹے کی مسافت
 کے بعد دوسری طرف ڈی لینڈ میں پہنچ گئے۔ کوپن ہیگن پہنچے تو رات کا پچھلا پہر تھا لیکن ابھی تک
 گلیوں اور بازاروں میں گہما گہمی تھی۔

”کہاں اترو گے؟“

”کہیں بھی اتار دیجئے۔“

”اس وقت کہاں مارے مارے پھر دو گے۔ ہوٹل برشل میں میرا کمرہ بک ہے تم بھی
 وہیں سو رہنا۔“ میں فیصلہ نہ کر سکا کہ یہ دعوت کس جذبے کے تحت دی گئی ہے۔
 ”کچھ نہ کچھ بندوبست تو ہو ہی جائے گا۔“ میں نے تھیلا اٹھا کر کاندھے پر ڈال لیا۔

”بہر حال دعوت کا شکریہ۔“

”تمہیں دراصل پریوں کی کہانیوں سے کچھ زیادہ ہی دلچسپی ہے“ سرخ بالوں نے مایوس ہو کر کہا اور کارشہر کے بڑے چوراہے کی جانب موڑ دی۔

سینڈے نیویا کی فضائی کمپنی ”ایس اے ایس“ کے دفاتر کے ساتھ چوڑے فٹ پاتھ پر چلتا ہوا میں شہر کے مرکز میں آ گیا۔ ”راڈس“ یعنی ٹاؤن ہال کی تانبے کی چھت کے نیچے پتھریلی سیڑھیوں پر لاتعداد سیاح اور ہنسی سورہے تھے۔ سورج طلوع ہونے میں چونکہ صرف دو تین گھنٹے باقی تھے اس لیے میں نے بھی صبح تک وہیں بیٹھ کر رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک کونے میں جہاں نسبتاً صاف ستھرے ہنسی محو خواب تھے میں نے سونے کا تھیلہ بچھایا اور باقی سامان سر تلے رکھ کر سو گیا۔ اگرچہ میرے سر ہانے تلے ”اینڈرسن کی کہانیوں کی کتاب“ نہیں تھی مگر پھر بھی اس شب میرے خوابوں میں پریاں ناچیں اور کبھی کبھی سرخ بالوں والی ڈانسیں بھی، میری آنکھ کھلی تو کوپن ہیگن کا مشفق سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ تیز ہوا کا ایک جھونکا آیا اور ٹاؤن ہال کے فوارے کی بھرپور پھوار میرے چہرے اور تھیلے کو بھگو گئی۔ میں نے سر اٹھا کر گرد و پیش کا جائزہ لیا تو سوائے میرے گزشتہ شب کے تمام کمپن اپنا بوریا بستر سمیٹ کر جا چکے تھے۔ سکول کے بچوں کا ایک گروہ میرے گرد کھڑا مجھے بے حد دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کمال عجلت سے اپنا ”بستر“ لپیٹا اور سامان اٹھا کر سڑک کے پار سنٹرل سٹیشن میں واقع ٹورسٹ آفس میں آ گیا جہاں رہائش کے بارے میں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ شہر میں تو تمام ہوٹل بھرے پڑے ہیں البتہ کوپن ہیگن سے دس میل باہر تاسٹرپ کے قصبے میں رہائش کا انتظام ہو سکتا ہے اور وہاں پہنچنے کے لیے مضافاتی ریلوے میں سوار ہونا پڑتا ہے۔ سٹیشن پر ٹکٹوں کی کھڑکی اور ٹکٹ چیکر کی غیر موجودگی سے میں نے یہ تاثر لیا کہ ٹکٹوں کی ترسیل گاڑی میں ہی ہوتی ہوگی۔ گاڑی جب شہر سے نکل کر مضافات میں آ گئی تو میں نے سامنے بیٹھی ایک ادھیڑ عمر عورت سے ٹکٹ کے حصول کے بارے میں استفسار کیا۔ اس نے منہ میں ایک دبیز قسم کا لمبا گاراڑس رکھا تھا۔ ”سٹیشن کے باہر لگی ہوئی مشینوں سے ملتے ہیں۔“ اس نے ایک لمبا کش کھینچ کر خوشدلی سے کہا۔

”میں اس بارے میں لاعلم تھا اب کیا کیا جائے؟“ میں نے پوچھا
”فکر نہ کرو“ اس نے میری گھبراہٹ بھانپ لی ”یہاں ٹکٹ چیکر نہیں ہوتے۔ اگر حکومت چیکر ملازم رکھے تو ان کی تنخواہ اس رقم سے جو بغیر ٹکٹ سفر کرنے والوں سے وصول ہو سکتی ہے تجاوز کر جاتی ہے۔ یہاں کے لوگوں کا ضمیر ہی چیکر کا کام دیتا ہے بہر حال واپسی پر دو ٹکٹ خرید کر تلافی کر دیتا۔“

تاسٹرپ کے سٹیشن پر اتر کر میں نے پلیٹ فارم کا جائزہ لیا۔ واقعی چیکر اور گارڈ نڈارد تھے۔ ٹورسٹ آفس کے دیئے ہوئے پتے پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ جگہ ہوٹل سے زیادہ اصطلح کہلانے کی مستحق تھی۔ قصبے سے باہر یہ ہوٹل ایک ڈنیش کسان کی ملکیت تھا جو اسے سارا سال سبزیوں کے گودام کے طور پر استعمال کرتا اور گرمیوں میں سیاحوں کی آمد پر کمرے جھاڑ پونچھ کر کرائے پر چڑھا دیتا۔ میرے کمرے سے ابھی تک سڑے ہوئے شلجموں کی بو آ رہی تھی۔ بہر حال کرایہ میری جیب کے عین مطابق تھا۔

”حواج ضرور یہ کے لیے آپ کو باہر جانا پڑے گا۔“ کسان کی بیوی نے بستر پر اچلی چادریں بچھاتے ہوئے کہا۔

”باہر؟“ میں نے بوکھلا کر کہا۔ جب بھی مجھے اپنے آبائی گاؤں جانے کا اتفاق ہوتا تھا ”باہر بیٹھنے“ کا مسئلہ میرے لیے سوہان روح بن جاتا۔ بہت خوب یعنی ڈنمارک کا تاسٹرپ پاکستان کے جو کالیاں سے کچھ اس قدر مختلف بھی نہ تھا ”آپ کا مطلب ہے کھیتوں میں؟“

کسان کی بیوی نے چادر کی شکنیں درست کرتے ہوئے ایک دم مڑ کر مجھے اس طرح دیکھا جیسے میرا دماغ چل گیا ہو اور پھر بے تحاشا ہنسنا شروع کر دیا۔ ”کھیتوں میں؟“ اس نے انگلی سے میری طرف اشارہ کر کے اسے اپنے منہ میں داب لیا اور اپنے بچوں کو آوازیں دینے لگی جیسے اندر تماشا ہو رہا ہو۔ بچوں کو صورت حال کا علم ہوا تو وہ بھی بے تحاشہ دانت نکالنے لگے۔ ”نہیں نہیں“ اس نے بمشکل انگلی منہ سے نکالی اور فارم کے سرے کی طرف اشارہ کیا ”باہر سے مطلب ہے اس کمرے سے باہر بھوسے والے گودام کے پاس جہاں غسل خانہ ہے“

اس خوش و خرم خاندان کے کمرے سے باہر قدم رکھتے ہی میں نے کپڑے بدلے اور واپس تاسٹرپ کے سٹیشن پر آ گیا جس کے باہر ٹکٹ مشین میں ایک کروڑ کا سکہ ڈالتے ہی ایک

نکلت برآمد ہو گیا۔ میں چلنے لگا تو سگار والی بڑھیا کی بات یاد آگئی ”واپسی پر دو ٹکٹ خرید لینا“ میں نے دوسرا سکہ نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر کچھ سوچ کر آگے بڑھ گیا۔ میرے ضمیر کا چیکر آج بھی چھٹی پر تھا۔

”سینڈے نیو“ یعنی ڈنمارک، سوڈن اور ناروے کے باشندوں کے لیے کوپن ہیگن اسی حیثیت کا حامل ہے جو پیرس کی باقی یورپ کی نظروں میں ہے۔ جہاں پیرس ایک حسین شہزادی کی طرح مغرور اور اپنے حسن پر نازاں ہے وہاں کوپن ہیگن اس نوجوان دیہاتی دوشیزہ کی مانند ہے جو کسی طرح بھی شہزادی سے کم حسین نہیں مگر اس میں تکبر نام کو نہیں۔ یہاں کسی سے راستہ پوچھ بیٹھے تو خود چھوڑنے چلے جائیں گے بلکہ کھانے پر بلا لیں گے، ادھر یہی بات کیجیے تو کھانے کو آئیں گے۔ 1167ء میں بشپ اسبالون نے جس کا مجسمہ ٹاؤن ہال کے سامنے ایستادہ ہے اس شہر کا سنگ بنیاد رکھا اور یہاں ایک قلعہ تعمیر کیا۔ یہ چھوٹی سی بندرگاہ جلد ہی ایک وسیع تجارتی مرکز کی صورت اختیار کر گئی اور اسی مناسبت سے ”کوپن ہیون“ یعنی تاجروں کی بندرگاہ کہلائی۔ سنٹرل سٹیشن کے ساتھ ہی کوپن ہیگن کا صدیوں پرانا تفریحی پارک ”توالی“ ہے جو اپنے بیس ایکڑ سے زائد رقبے میں ہر عمر کے لوگوں کی دلچسپی کا سامان سمیٹے ہوئے ہے۔ توالی ماہ مئی سے ستمبر تک کئی ریستورانوں، موسیقی کے ہالوں، تھیٹروں اور عوامی دلچسپی کے دوسرے لوازمات کی وجہ سے ایک صدا بہار میلے کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ رنگین پھولوں کے تختے، ننھی منی جھیلیں، اچلتے ہوئے فوارے اور لاتعداد رنگ برنگی روشنیاں روزانہ ہزاروں شہریوں کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔

توالی کے صدر دروازے پر ڈنمارک کا پرچم لہرا رہا تھا جس کے نیچے مختلف کھڑکیوں کے سامنے نکلت خریدنے والوں کا جھوم تھا۔ آج ڈنمارک میں ”بے سہارا لوگوں کی امداد“ کا دن تھا اور بیشمار اپانچ اور معذور لوگ توالی کا نظارہ کرنے آئے تھے۔ ان میں سے بیشتر پہیوں والی گاڑی میں بیٹھے تھے اور باقی نوجوانوں کے سہارے اندر جا رہے تھے۔ پچھلے پہر پارک میں زیادہ رش نہ تھا لیکن شام ہوتے ہی کھوے سے کھوا چھلنے لگا۔ برقی قہقروں کے روشن ہونے سے توالی نے ایک نیا روپ دھار لیا۔ یورپ کے دوسرے تفریحی پارکوں کی طرح یہاں روشنیاں تیز اور آنکھوں کو چندھیا دینے والی نہیں تھیں بلکہ ہلکی گہری روشنیاں اندھیرے میں گھل مل کر بہت بھلی لگ رہی

تھیں۔ توالی کو دیوالی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ایک جگہ ”خوشیوں کے باورچی خانے“ میں لوگ چینی کے برتنوں کو پتھریلی دیوار پر مار کر چکنا چور کر رہے تھے۔ ان میں زیادہ تر عورتیں تھیں جو اپنی دہائی خواہشات کا اظہار چند کروڑ خرچ کر کر رہی تھیں۔ ایک صاحب جسم ٹول کروڑن بتا رہے تھے۔ غلط ہونے پر آپ انعام کے حقدار ٹھہرتے، یہاں بھی عورتوں کا غلبہ تھا جو وزن سے زیادہ طریقہ دریافت میں زیادہ دلچسپی لے رہی تھیں۔ رقص گاہوں میں جوانوں کے جم غفیر تھے اور جھیل کنارے شراب خانوں میں بوڑھوں کے ٹھٹھ، چہرہ بگاڑنے والے آئینے، بجلی کی چھوٹی کاریں، بھوتوں کی ریل گاڑی، غرض کہ تفریح کا ہر نسخہ دستیاب تھا۔ شام کے کھانے کے لیے میں جھیل کنارے کھڑی ہوئی ایک کشتی میں چلا گیا جو توالی کا مشہور ریستوران ہے۔ میں نے ویٹر سے مینو کا رڈڈلے کو کہا تو وہ تقریباً چار فٹ لمبا ایک کاغذ اٹھا لیا۔ ”ڈنمارک کے مشہور زمانہ ”سمر براد“ سینڈوچ ہماری خصوصیت ہیں“ میں نے مینو میں درج سینکڑوں اقسام کے سینڈوچوں کے ناموں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور اس فرمان شاہی کو ایک طرف رکھتے ہوئے ویٹر سے کہا ”مینو کا ارزاں ترین اور حجم میں سب سے بڑا سینڈوچ لے آؤ۔“

سرکہ میں بھگوئی ہوئی ہیزنگ اور سالن مچھلی کا سینڈوچ منہ میں ڈالتے ہی مصری کی طرح گھل گیا۔ کافی کے بعد بل آیا تو جی چاہا کہ اگر کبھی اللہ میاں نے چھپر بھاڑ کر دیا تو اس ریستوران میں گراں ترین سینڈوچ بھی کھا کر دیکھیں گے کہ ارزاں ترین کا یہ حال ہے، میں نے چپکے سے بیس کروڑ کا نوٹ طشتری میں ڈال دیا۔

”آپ برانہ مانیں تو میں آپ کی میز پر بیٹھ جاؤں؟“ بھورے بالوں والا ایک ڈینش نوجوان مجھ سے مخاطب تھا۔ ”باقی ریستوران بالکل پُر ہے۔“

”تشریف رکھئے۔“ میں نے گھٹنوں پر بچھا ہوا نیپکن اٹھا کر تہ کیا اور پلیٹ میں رکھ دیا

”میں بھی اٹھنے والا ہوں صرف بل کی بقیہ رقم کا انتظار ہے۔“

”بہت بہت شکریہ“ وہ نہایت ممنون نظر آ رہا تھا ”آپ شاید ایشیائی ہیں۔“

”پاکستانی“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

”بہت خوب“ اس نے اٹھ کر گرجوٹی سے ہاتھ ملایا۔ ”آپ میرے پہلے پاکستانی

ہیں۔“ اس نے ایسے کہا جیسے میں کسی نایاب نسل کا پرندہ ہوں جو پہلی مرتبہ قابو میں آیا ہے۔ ویٹر واپس آیا تو طشتری میں بل کی بقیہ رقم کچھ چھوٹے سکوں کی صورت میں بکھری پڑی تھی۔ سکوں کو سمیٹنے کے جھنجھٹ میں پڑنے کی بجائے میں نے کمال فراخ دلی سے انہیں ویٹر کو بخش دیا۔ میز سے اٹھنے لگا تو وہ ڈینش نوجوان بھی ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”پلیز آپ میرے ساتھ کچھ پیجیے۔ ایک عرصہ سے مجھے آپ کے ملک اور مذہب کے بارے میں جاننے کا اشتیاق تھا۔“ میں اس کی یہ دعوت ٹھکرا نہ سکا اور پھر بیٹھ گیا۔ ایک سیاح کے لیے صرف یہی کافی نہیں کہ وہ غیر ممالک کے تہذیب و تمدن کو ہی پرکھے بلکہ اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے ملک اور ثقافت کو بھی وہاں متعارف کروائے چونکہ باہر کے ملکوں میں ہمارے سفارتی نمائندوں کو اہم دعوتوں اور تقریروں میں شرکت سے ہی فرصت نہیں ملتی اس لیے وہاں پاکستان کے بارے میں تفصیلی معلومات کا فقدان ہے۔ جرمنی میں امریکی فوج کا ایک کپتان ملا جو پاکستان کو افغانستان کا ایک حصہ سمجھتا تھا۔ ہسپانیہ میں تو پاکستان کا نام لہجے تو وہ اسے کوئی مشرقی کھانا یا پرندہ ہی سمجھیں گے۔ یورپ کے ایک صدر مقام میں جب میں نے سفارت خانے کے ایک رکن سے پاکستان کے بارے میں طبع شدہ مواد لوگوں میں تقسیم کرنے کی خاطر طلب کیا تو اس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے میں گھاس کھا گیا ہوں۔ وطن سے نکلے ایک ماہ ہونے کو تھا میں نے تازہ اخبار دیکھنے کی خواہش کی تو معلوم ہوا کہ ”ریڈنگ روم“ میں ڈیڑھ ماہ قبل کے نسخے موجود ہیں۔ ایک کلرک نے بتایا کہ پاکستان سے آیا ہوا اخبار پہلے سفیر صاحب ملاحظہ کرتے ہیں، پھر فرسٹ سیکرٹری صاحب کے فلیٹ میں جاتا ہے پھر سیکنڈ سیکرٹری صاحب اپنی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ عملے کے تمام ارکان جب فارغ ہو چکے ہیں تو عام پبلک کے لیے ریڈنگ روم میں نمائش کر دی جاتی ہے۔ پاکستان کی سیاحت پر جانے والے مقامی باشندوں کو وہاں کی غلاظت اور گرمی کی شدت سے پہلے آگاہ کر دیا جاتا ہے تاکہ (Image) خراب نہ ہو۔ سفارتی قواعد کے مطابق شاید میں نے اس جرم کا ارتکاب ہر ملک میں کیا ہے۔ جرمن ٹرک ڈرائیور ہو یا روسی مزدور میں نے انہیں اپنے ملک کے ہر پہلو کے بارے میں روشناس کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہر حال بات ہو رہی تھی اس ڈینش نوجوان کی جسے میرے ملک کے بارے میں جاننے کا بے حد اشتیاق تھا۔ ہم خاصی دیر تک توالی کے کشتی نما ریستوران میں بیٹھے پاکستان اور اسلام کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ اس نے بتایا کہ کوپن ہیگن میں بھی ایک مسجد

ہے جس کے ڈینش امام نے حال میں ہی قرآن پاک کا ترجمہ ملکی زبان میں کیا ہے۔ ”میرا نام موگنز پیٹرن ہے اور میں کوپن ہیگن کے نواحی شہر راس کلمے میں پیدا ہوں۔“ اس نے اپنے بارے میں مجھے بتایا ”میری پرورش سخت قسم کے مذہبی ماحول میں ہوئی۔ والدین عیسائیت کے ایک کٹھنفرقے کے پیروکار تھے اور اپنے فرقے سے باہر کے لوگوں کو قابل گردن زدنی قرار دیتے تھے۔ راس کلمے ایک خوبصورت شہر ہے۔ جمیل کنارے پرانے کلیسا میں ڈنمارک کے تمام بادشاہوں کے تابوت محفوظ ہیں۔ حال ہی میں ایک نیا عجائب گھر تعمیر کیا گیا ہے جس میں وائکنگ (Viking) دور کا ایک سمندری جہاز رکھا جائے گا، مجھے اس ماحول میں بے حد گھٹن محسوس ہوئی۔ میرے والدین کے عقیدے کے مطابق رحمت اور عافیت کے پاک فرشتے ان کے فرقے کے کلیسا کے گرد ہی منڈلاتے ہیں اور خدا کی نظریں ہر اتوار اس کلیسا میں عبادت کرنے والوں پر ہی گڑی ہوتی ہیں۔ مجھے ان کے اس عقیدے سے سخت نفرت تھی چنانچہ میں نے دوسرے مذاہب کا مطالعہ شروع کر دیا اور بالآخر بدھ مت اختیار کر لیا۔ کوپن ہیگن کے پرانے حصے میں میرا فلیٹ ہے جہاں میں بدھ کی مقدس مورتی کے سامنے روزانہ سجدہ ریز ہوتا ہوں۔“

اسلام کے بارے میں موگنز کی معلومات بے حد ناقص تھیں اس نے مجھے بتایا کہ پچھلے سال کچھ مبلغ ادھر آئے تھے مگر ڈینش زبان سے ناواقفیت کی بنا پر وہ لوگوں کو متاثر نہ کر سکے۔ میں نے وعدہ کیا کہ وطن جاتے ہی اسے اسلام کے بارے میں کتابیں بھیجوں گا۔

ٹاؤن ہال کے گھر ٹیال نے گیارہ بجائے تو ہمیں احساس ہوا کہ توالی بند ہونے کو ہے۔ ”م خرت کی فکر تو ہو چکی“ موگنز نے میز سے اٹھتے ہوئے کہا ”آئیے اب کوپن ہیگن کی شبینہ زندگی کا بھی نظارہ ہو جائے۔“

توالی سے باہر نکلتے ہوئے میری نظر جمیل کے پار مشرقی طرز کی ایک گنبد نما عمارت پر پڑی ”یہ مسجد ہے کیا؟“ میں نے موگنز سے پوچھا۔

”نہیں شراب خانہ ہے۔“

”آپ نے اسلام کا یہی تصور دیا ہے لوگوں کو؟“

”مقصود کسی کے مذہبی جذبات مجروح کرنا نہیں۔ یہ صرف کاروبار میں جدت پسندی کا ثبوت ہے۔“ اس نے معذرت بھرے لہجے میں کہا۔

تو اسی سے نکل کر ہم ٹاؤن ہال کے پہلو میں جاتی ہوئی سڑک ”سٹریٹ“ پر ہو لیے جو شہر میں خرید و فروخت کا سب سے بڑا مرکز ہے اور وینس کی مرسیر یا سٹریٹ کی طرح صرف پیدل چلنے والوں کے لیے مخصوص ہے۔ آدھی رات ہونے کے باوجود یہاں خوب رونق تھی اور لوگ بھیڑوں کی طرح بے مقصد گھوم رہے تھے۔

سینما، شبینہ کلب اور قہوہ خانے ابھی تک کھلے تھے۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے میری نظریں ایک سینما کے باہر آدیزاں چند رنگین تصاویر پر پڑیں اور اسی لمحے شرم سے جھک گئیں۔ ”موگزن“ میں نے حیا سوز تصویروں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا ”کیا یہ بھی جدت پسندی ہے؟“

”بالکل“ اس نے کھیانے ہو کر کہا۔ ”یہ سلسلہ چھ ماہ قبل شروع ہوا تھا جب ہماری حکومت نے اس قسم کی نیلی فلموں (Blue Films) پر عائد شدہ پابندیوں کو یکسر ختم کر دیا تھا۔ اب ڈنمارک دنیا کا واحد ملک ہے جہاں ایسی فلمیں بنانے اور ان کی نمائش کرنے کی کھلی اجازت ہے۔“

”مجھے یہ تو معلوم ہے کہ یورپ میں اور خاص طور پر سیکنڈے نیویا میں جسم سے متعلق اخلاقی اقدار کی چنداں پروا نہیں کی جاتی۔“ میں نے سینما کی کھڑکی کے سامنے ٹکٹ خریدنے والے تماشاخیوں کی لمبی قطار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”لیکن ان فلموں کی نمائش سے جنسی بے راہروی کو اور زیادہ فروغ حاصل نہیں ہوتا؟“

”تمہارا یہ تجزیہ بالکل غلط ہے۔ پابندی ہٹنے کے بعد اہل ڈنمارک نے جی بھر کے ایسی فلمیں دیکھیں۔ چونکہ ان فلموں کی کہانیوں میں قدرتی یکسانیت ہوتی ہے اس لیے آہستہ آہستہ مقامی لوگوں کا تجسس ختم ہو گیا اور ان کی جگہ غیر ملکیوں نے لے لی۔ تم دیکھو گے کہ تماشاخیوں کی اکثریت سویڈش، جرمن، انگریز اور امریکیوں پر مشتمل ہے۔ اب یہ فلمیں ملک کے لیے ایک نہایت ہی منافع بخش کاروبار کی حیثیت حاصل کر چکی ہیں۔ ان فلموں کے علاوہ جنسی اختلاط کے بارے میں ریکارڈ کتابیں رسائل اور دوسرے لوازمات بھی تیار کیے جاتے ہیں جن کی برآمد سے ہم کثیر زر مبادلہ کماتے ہیں اور اس تجارت میں ہماری اجارہ داری ہے۔ اگلے ماہ سے یہاں دنیا کا پہلا جنسی میلہ بھی شروع ہو رہا ہے۔“

”یورپی تجارت کی یہ منطق میری سمجھ سے بالاتر ہے“ میں نے سر جھٹک کر کہا ”لیکن اگر نوخیز لڑکے اور لڑکیاں ایسی فلمیں دیکھ کر ”سبق“ حاصل کر لیں اور اس سبق کو عملی زندگی میں دہرائنا چاہیں تو؟“

”تو کیا؟“ موگزن نے میرا کندھا تھپکتے ہوئے جواب دیا۔ ”یہ سیکنڈے نیویا ہے میرے پاکستانی دوست، یہاں کی نئی نسل کو کسی سبق کی ضرورت نہیں..... بقول کے یہاں ”معصومیت“ بچہ گاڑی سے باہر قدم رکھتے ہی ختم ہو جاتی ہے۔“

سینماؤں کے ساتھ متعدد چھوٹے چھوٹے بک شال ایستادہ تھے جہاں بے شمار سیاح وہاں بکنے والی خاص الخاص کتب اور رنگین رسالوں کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ ایک شال پر ایک پستہ قد جاپانی نہایت عجلت سے ایک تصویر دار رسالے کے اوراق پلٹ رہا تھا۔ کسی صفحے پر حسب ذوق تصویر برآمد ہوتی تو وہ اپنی چٹنی ناک سے عینک اتار کر اس کے شیشے صاف کرنے لگتا۔ اس دوران اس کی مہین آکھیں تصویر پر ہی مرکوز رہتیں۔ عینک دوبارہ پہن کر وہ چند لمحوں کے لیے تصویر کی باریکیوں پر غور کرتا ایک ٹھنڈی آہ بھرتا اور پھر ورق گردانی میں مصروف ہو جاتا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمایاں تھے اور چہرہ لال بھھوکا ہو رہا تھا۔ کاؤنٹر پر پڑے رسالوں کا ڈھیر اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ وہ کافی دیر سے ان رنگینیوں میں کھویا ہوا تھا۔

”فلپین فوٹو لیس؟“ اس نے سر کھجا کر کاؤنٹر کی بوڑھی مالک سے پوچھا۔ بڑی اماں کے جھریوں سے بھرپور چہرے پر کاروباری مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے کاؤنٹر کے نیچے رکھے ہوئے رسالوں کا ایک پلندہ جاپانی محقق کے آگے ڈھیر کر دیا۔ ان رسائل میں افریقہ اور یورپی تہذیبوں کا ”امتزاج“ تھا۔ جاپانی نے دو چار صفحے الٹنے کے بعد انہیں تسلی بخش قرار دیا اور جب سے نوٹوں کا پلندہ نکال کر بوڑھی کے حوالے کر دیا۔

”فلپین فوٹو دلی گڈ“ اس نے مرکز ہمیں مژدہ سنایا جہاں ہم اس انتظار میں تھے کہ ہماری باری آئے اور ہم شال سے سگرٹ خرید سکیں۔ سگرٹ خریدنے کے بعد ہم ”سٹریٹ“ سڑک کے خاتمے پر بائیں ہاتھ مڑ کر شہر کے قدیم اور دیدہ زیب حصے میں داخل ہو گئے جس کے وسط میں ”نیویون“ یعنی نئی بندرگاہ کا علاقہ ہے۔ کوپن ہیگن کے نیویون کو وہی ”شہرت“ حاصل ہے جو لنڈن کے سوہو، پیرس کے پگال اور ہیمبرگ کے ریپا بہان کے نام سے وابستہ

ہے۔ اس علاقے کے بچوں میں ایک نہر بہتی ہے جس کے دونوں طرف ڈھلوان چھتوں کے دیدہ زیب مکانات ہیں۔ خانہ خرابی کے تمام لوازمات انہی مکانات میں ہیں۔ نہر کے آہنی پلوں کے تلے سارا وقت کشتیوں اور موٹر بوٹوں کی آمد و رفت جاری رہتی ہے۔ پہلی نظر میں اس علاقے پر رات کی رنگینیوں کی آماجگاہ کی بجائے کسی رومانی فلم کے سیٹ کا گمان ہوتا ہے۔ موگنز کا اصرار تھا کہ میں یہ علاقہ ضرور دیکھوں کیونکہ یہاں کا ”شریفانہ اور دوستانہ ماحول“ ڈینش تہذیب کا ایک لازمی حصہ ہے۔

”اگر شب کی سیاہی میں ڈنمارک کے شاہی خاندان کے افراد چوری چھپے یہاں آکر رنگ رلیاں مناسکتے ہیں تو عوام الناس کو بھی یہ حق حاصل ہے۔“ موگنز کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک شیطانی چمک تھی۔ وہ مختلف شبینہ کلبوں اور شراب خانوں میں جھانکتا اور پھر آگے بڑھ جاتا۔ وہ اپنے بدھ مت اور بدھ کے مجسمے کو مکمل طور پر فراموش کر چکا تھا۔ ”کیپ ہارن چلتے ہیں وہاں بیئر کے علاوہ موسیقی بھی اعلیٰ درجے کی ہوتی ہے۔“ اس نے بالآخر فیصلہ ناسا دیا۔

کیپ ہارن نامی شبینہ کلب کا ہال کچھ آٹھ بج رہا ہوا تھا۔ سٹیج پر ایک سیاہ فام طائفہ جاز کی ایک مدھم دھن بجا رہا تھا اور چند جوڑے رقص کر رہے تھے بلکہ ایک دوسرے سے لپٹ کر اونگھ رہے تھے۔

”آپ رقص کرنے والے جوڑوں میں سے گزر کر ہال کے دوسرے کونے میں چلے جائیے وہاں ایک میز خالی ہے۔“ ویٹر نے ہمیں مشورہ دیا۔ ہم دونوں چہروں پر فرمائشی مسکراہٹ سجائے جوڑوں سے معذرت کرتے جسموں کے اس انبار میں سے گزرنے کی کوشش کرنے لگے۔ ”اوئے۔“ میں نے درد کی شدت سے مغلوب ہو کر پنجابی میں نعرہ لگا دیا۔ کسی نے میری کمر کے عین نیچے بڑے زور سے چٹکی بھری تھی۔ میں نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا۔ درجنوں جوڑے اپنی دھن میں مگن بڑے سکون سے ناچ رہے تھے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ یہ کارستانی کن صاحب کی ہے۔

”کیا ہوا؟“ موگنز نے مڑ کر کہا۔

”کچھ نہیں، موسیقی سن کر میں بھی وجد میں آ گیا تھا۔“

میز پر بیٹھے ہی موگنز نے بیئر کا آرڈر دے دیا۔ ”ایک اندازے کے مطابق ڈنمارک

کے باشندے ہر سال اتنی بیئر پی جاتے ہیں کہ اگر اسے انڈیل دیا جائے تو پورا ملک ڈوب جائے۔“ اس نے بیئر کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

”یعنی ڈوب مرنے کا مقام پیدا ہو جائے“ میں نے ہنس کر کہا۔ اس نے میری بات ان سنی کرتے ہوئے ڈینش بیئر کی خوبیوں پر بیان جاری رکھا۔ ”ہم دنیا کی بہترین بیئر کشید کرتے ہیں۔ ہر شام ہزاروں سنجیدہ مزاج خوش لباس سویڈش باشندے مالمو اور کوپن ہیگن کا درمیانی سمندر پار اس شہر میں وارد ہوتے ہیں اور اسی رات جھومتے ہوئے اپنے کوٹ کندھوں پر ڈالے ٹائیاں ڈھیلی کیے نشے میں دھت واپس سویڈن چلے جاتے ہیں۔ یہ سب ڈینش بیئر کے شیدائی ہوتے ہیں۔“

ایک ایک موسیقی بجانے والے حبشی نے کاٹا بدلا۔ سیکسافون بجانے والے نے سر نیوڑھا اور ایک بھر پور سانس لے کر اپنے پیچھے دوں کی ہوا تانبے کے اس ہاکی نما ساز میں بھر دی۔ بگل نواز نے سینہ پھلایا اور سر پیچھے ڈال کر بگل بجانے لگا۔ ڈھول نواز بھلا پیچھے کیوں رہتا۔ اس نے آؤ دیکھانہ تاؤ۔ چھڑیاں ہوا میں گھمائیں اور سانس رن رکھے مختلف ڈھولوں پر بے تحاشہ پل پڑا۔ سازوں کی اس چنگھاڑ میں بیس واکمن کی دم دم بالکل دب کر رہ گئی۔ تیز موسیقی کی بوچھاڑ نے اونگھتے ہوئے جوڑوں میں ایک برقی لہر دوڑا دی۔ وہ ایک دوسرے کی بانہوں کے چنگل سے علیحدہ ہوئے اور والہانہ طور پر رقص کرنے لگے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ رقاصوں کے پاؤں کی دھمک اور موسیقی کی شدت سے ہال کا فرش بیٹھ جائے گا اور چھت بھک سے اڑ جائے گی۔ موگنز جواب تک بیئر کے درجنوں مگ چڑھا چکا تھا سر ہلاتا اور چنگیاں بجاتا اٹھا اور ساتھ والی میز پر بیٹھی ہوئی ایک فضول سی لڑکی کو لے کر اس چیختے چلاتے چھلانگیں مارتے ہجوم میں شامل ہو گیا۔

”سکول“ (Skol) بار کے کاؤنٹر پر بیٹھی ایک لڑکی نے اپنا جام اٹھایا اور میری طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

”بائی می اے ڈرنک ہنی (Buy me a drink Honey) وہ گلاس لے کر میرے

ساتھ آ بیٹھی۔

”ساری رائگ نمبر“ (Sorry Wrong Number) میں نے آکٹاہٹ سے منہ

پھیر لیا۔ اس کی چال ڈھال سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ایک چیخل لڑکی ہے۔

”ڈانس و دی؟ (Dance with Me)۔“ اس نے لپ سنک سے لہڑے ہونٹوں کی کمان سی بنا کر پوچھا۔

”میں رقص بھی نہیں کرتا۔“

”ہندوستانی فقیر۔“ اس نے جھنجھلا کر کہا اور گلاس اٹھا کر واپس کاؤنٹر پر جا بیٹھی اور کسی آسامی کا انتظار کرنے لگی۔ ادھر ناچنے والے جوڑوں کے جذبہ وجدان میں ابھی تک کوئی کمی واقع نہ ہوئی تھی اور دھمال پوری شدت سے جاری تھی۔ نشے میں ایک دھت ملاح نے اپنی ٹوپی اتار پھینکی اور سٹیج پر چڑھ کر طائفے کے سامنے کھڑے ہو کر اٹے سیدھے کرتب دکھانے شروع کر دیئے۔ لوگوں نے خوب تالیاں بجائیں۔ ایک سویڈش نے جس پر ڈینش بیئر کا اثر بہت گہرا ہو چکا تھا نعرہ بلند کیا ”میرے آباؤ اجداد وائلنگ (Viking) سمندری لیرے تھے۔ ہاؤ ہو!“ اور ساتھ ہی اپنی میز الٹ کر خالی بوتلیں ہوا میں اچھالنا شروع کر دیں۔ کوئی بھی متوجہ نہ ہوا۔ رقص اسی طرح جاری رہا۔ خاصی دیر کے بعد جب یہ طوفان بدتمیزی ختم ہوا تو تمام شرکاء پسینے سے شرابور تھے اور تالیاں پیٹ پیٹ کر موسیقی بجانے والوں کو داد دے رہے تھے۔ موگنز واپس آیا تو وہ اکیلا تھا۔

”تمہاری ساتھی لڑکی کہاں ہے؟“

”وہ کمبخت رقص کے دوران کہیں غائب ہو گئی چنانچہ میں اکیلا ہی ناچتا رہا۔“ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

”میرا خیال ہے اب واپس چلا جائے۔ دونے چکے تھے۔“ میرے کانوں کے پردے ابھی تک لرز رہے تھے۔

”جیسے تمہاری مرضی۔“ اس نے خوشدلی سے کہا۔

طائفے نے اب پھر ایک مدھم اور پرامن دھن چھیڑ دی۔، نڈھال جوڑے اپنے تھکے ہوئے قدم گھسیٹتے بانہوں میں بانہیں ڈالے پہلے کی طرح اونگھنے لگے۔ کلب سے باہر جانے کے لیے ہمیں ایک مرتبہ پھر ناچنے والے جوڑوں میں سے گزر کر جانا تھا۔ اس دفعہ موگنز میرے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ ایک دم مجھے اپنے جسم پر انگلیوں کا لمس محسوس ہوا۔ پہلے تجربے کی بنا پر میں اب

پوری طرح چوکس تھا اور اس سے قبل کہ چٹکی بھرنے کی نوبت آتی میرا ہاتھ مضبوطی سے ”مجرم“ کی کلائی پکڑ چکا تھا۔ میں پیچھے مڑا تو سامنے گداز جسم کی ایک سنہری بالوں والی لڑکی بڑی ڈھٹائی سے مسکرا رہی تھی۔ اس نے اپنی کلائی چھڑانے کی چنداں کوشش نہ کی۔ اس کے ہم رقص لمبے ترنگے ملاح نے قہر آلود نظروں سے میری طرف دیکھا اور دھاڑا ”تمہیں میری دوست لڑکی کا ہاتھ پکڑنے کی کیسے جرأت ہوئی؟“

”موگنز“ میں نے ملاح کی بولندہ انداز کرتے ہوئے اپنے ڈنش ساتھی سے کہا، ”ان محترمہ نے ہی اندر آتے وقت مجھے کاٹا تھا اور اب پھر اسی کوشش میں تھیں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیوں؟“

”میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کیوں؟“ اس سے قبل کہ موگنز کچھ کہتا وہ وحشی ملاح مجھے ایک زوردار گھونسا رسید کر چکا تھا اور میں لکڑی کے فرش پر پھسلتا ساتھ رکھی ہوئی میز کے پایوں میں جا اٹکا اس اثنا میں موگنز اس ملاح سے گتھم گتھا ہو چکا تھا۔ میں نے سر جھٹک کر ککے کے اثرات زائل کرنے کی کوشش کی اور گردن جھکا کر ملاح کے پیٹ میں ایک زوردار ٹکراؤ رسید کی وہ موگنز کے مکوں سے پہلے ہی نڈھال ہو چکا تھا۔ میری ”بوکر“ سائل ٹکرنے رہی سہی کسر پوری کر دی اور وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ حاضرین مجلس اس دوران چپکے سے تماشہ دیکھتے رہے۔ میں اپنا جبر ا سہلاتا ہوا باہر نکلنے لگا تو میرا ”مجرم“ دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ ”کیا آپ اب بتانا پسند کریں گی کہ آپ نے مجھے کیوں کاٹا تھا؟“ میں نے غصے سے پوچھا۔

”بس تم اچھے جو لگے تھے“ اس نے آنکھیں میچ کر کہا اور مسکرا دی۔

باہر نہر کے کنارے!

پل بھر کے لیے موسیقی اور آوازوں کا شور سنائی دیتا دروازہ بند ہونے پر پھر خاموشی طاری ہو جاتی۔

”آج تم نے کوپن ہیگن کے صرف تاریک پہلو ہی دیکھے ہیں۔ جانے تم نے ہمارے بارے میں کیا نظریہ قائم کیا ہے!“ موگنز پر بیئر کے اثرات زائل ہو رہے تھے۔

”کسی کو مورد الزام تو وہ ٹھہرائے جو اپنے آپ کو منصف کی کرسی کا اہل سمجھتا ہو۔ میں

سیاح ہوں مجھ پر صرف دوستی اور شفقت کے جراثیم اثر انداز ہوتے ہیں اور مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ڈنمارک میں ان جراثیموں کی بھرمار ہے۔“ میں نے موگنر کی رفاقت کا شکر یہ ادا کیا اور جانے کی اجازت چاہی۔

”تاسترپ جانے والی آخری گاڑی جا چکی ہوگی۔ تم آج شب میرے فلیٹ میں ہی ٹھہر جاؤ صبح چلے جانا۔“

”میرے ٹیشن پہنچنے تک تاسترپ جانے والی پہلی گاڑی بھی تیار ہوگی اور پھر شاید تمہارا بدھ کا مجسمہ ایک مسلمان کی رفاقت پسند نہ کرے۔“

وہ ہاتھ ملا کر تھوڑی دور گیا ہوگا کہ میں نے آواز دے کر کہا۔

”موگنر اس وحشی ملاح کے ہاتھوں پٹائی سے بچانے کا بھی شکر یہ۔“

”سکول“ اس نے ہاتھ اٹھا کر ڈینش میں کہا اور نہر کا آہنی پل پار کر کے ایک گلی میں مڑ گیا۔

سڑک کی کھڑوالے شراب خانے سے دو سوئڈش شرابی جھومتے ہوئے نکلے اور سیدھے نہر میں کود گئے۔ میں نے کنارے پر لگے ہوئے جنگلے کو تھام کر نیچے جھانکا تو وہ مزے سے ڈبکیاں لگا رہے تھے۔ ”شراب کے اثرات زائل کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔“ ان میں سے ایک نے مجھ سے مخاطب ہو کر نعرہ لگایا اور ناک کو انگلیوں کے درمیان بھینچ کر ڈبکی لگادی۔

میں صبح چار بجے چلنے والی پہلی گاڑی پر سوار ہو کر واپس تاسترپ پہنچا تو ہوٹل کا مالک کسان اپنے فارم کی گائیوں کا دودھ دوہنے کے بعد واپس آ رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں دودھ سے بھرے تسلے تھے۔

”صبح بخیر جناب“ اس نے تسلیز میں پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”میرے تجربے کے مطابق کوپن ہیگن میں رات چمکے کے بعد ڈینش دودھ کا ایک گالکسیر کا کام دیتا ہے۔۔۔۔۔ اور گاڑھے سفید دودھ سے بھرا ہوگا مجھے تمہارے۔“

جھیل، چاندنی اور بارہ سنگھا

”ننھی جل پری“ ساحل کے ساتھ پانی میں ابھری ہوئی ایک چٹان پر اداس بیٹھی اپنے شہزادے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کی بے جان آنکھیں بندرگاہ سے پرے کھلے سمندر پر لگی تھیں۔ ”ننھی جل پری“ اینڈرسن کی کہانی کا ایک کردار ہے جسے اہل کوپن ہیگن نے کانسی میں ڈھال کر ایک ساحلی چٹان پر ایستادہ کر دیا۔ زندہ دلان شہر اس خوبصورت مجسمے پر طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ کبھی اس کا چہرہ غازے سے پوت دیا اور کبھی عریاں جسم کو زیر جامہ ملبوسات سے ڈھک دیا۔ تلاش محبوب میں ناکامی ہو، جل پری کا بوسہ لیجئے، محبوب قدموں میں ہوگا۔ ایک صاحب تو بیچاری جل پری کا سر کاٹ کر فوچکر ہو گئے۔ چنانچہ ابتدائی سانچہ جو ایسی ہی ناگہانی ضرورتوں کی خاطر محفوظ کر لیا گیا تھا، نکالا گیا اور نیا سر ڈھال کر دوبارہ جڑ دیا گیا۔ میں آج کوپن ہیگن چھوڑ کر سوئڈن جا رہا تھا۔ سینئر بندرگاہ سے نکلا تو بائیں طرف چٹان پر اداس بیٹھی جل پری کا مجسمہ نظروں کے سامنے آ گیا۔ ڈیڑھ گھنٹے میں ہم بحیرہ بالٹک عبور کر کے مالمو پہنچ چکے تھے جو سوئڈن کے چند بڑے شہروں میں سے ہے۔ میری منزل سوئڈن کا صدر مقام شکا ہو تھی۔ مالمو کے مرکزی چوک سے ٹرام میں سوار ہو کر میں ابھی شکا ہو جانے والی شاہراہ پر اترا ہی تھا کہ ایک سوئڈش ساختہ ”والوڈ“ کار نے مجھے لفٹ دے دی۔ کار میں لمبے بالوں والے تین بیبی سوار تھے۔ کار چلی تو میرے برابر بیٹھا ہوا بیبی پینک سے بیدار ہوا۔ اور سر اٹھا کر پوچھنے لگا ”اینڈرسن؟“

”پاکستانی“ میں نے جل کر جواب دیا۔

اس نے پاؤں میں رکھی ہوئی چمڑے کی تھیلی میں سے سرخ ہندیوں ایسا ایک لبا پائپ نکالا اور بھورے رنگ کی ایک ڈلی سلگا کر کش لگانے لگا۔ ”نروان“ اس نے ایک طویل کش لیا اور پائپ اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھا دیا۔ جب وہ دونوں بھی نروان حاصل کر چکے تو مجھے دعوت دی گئی ”ڈریگ؟“ ڈریگ پتوں کی زبان میں چرس کے لمبے کش کو کہتے ہیں۔ پنجابی میں یہی مفہوم ”یار سوٹالا“ سے ادا ہوتا ہے۔ میں نے ایک نظر ان نروان رسیدہ پتوں پر ڈالی اور کار سے اترنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ تینوں کسی اور جہان میں تھے اور بہر صورت میں ابھی اسی دنیا میں رہنا چاہتا تھا۔ ”ڈریگ تو نہیں“ میں نے ہنس کر کہا ”البتہ ڈراپ کر دیجئے تو بہتر رہے گا۔“

ڈرائیور نے تعرض کئے بغیر کار روک دی ”امن“ اس نے ہاتھ اٹھا کر جھومتے ہوئے کہا۔

وہیں سڑک پر کھڑے ہونے کی بجائے میں نے چلنا شروع کر دیا اور پچھلے پھر لپڈ کے قدیم قصبے میں پہنچ گیا جو شاہک ہوم یوٹے برگ اور اسپالا کے ساتھ سویڈن کے چار بڑے تعلیمی مراکز میں شمار ہوتا ہے۔ قصبے کو پار کر کے شاہک ہوم کی شاہراہ میں شامل ہونے والی ذیلی سڑک کے کنارے آ کھڑا ہوا۔ شام ہو گئی مگر مجھے لفٹ نہ مل سکی۔ میں سوچنے لگا کہ یہیں کہیں خیمہ نصب کر کے شب بسر کروں اور دوسری صبح پھر قسمت آزمائی کروں، میں اسی سوچ میں مگن تھا کہ قصبے کی جانب سے ایک وین مڑی اور میرے پاس آ کر رک گئی۔ ڈرائیور کی نشست پر ایک بوڑھا کسان براجمان تھا۔ ”میں لاگن تک جا رہا ہوں چلو گے؟“

میں نے جلدی سے سامان چھپی نشست پر پھینکا اور بوڑھے کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اب رات ہو چکی تھی اور وین کی روشنیوں میں دور تک خالی سڑک نظر آرہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف گھٹنا اور سیاہ جنگل بجد مہیب لگ رہا تھا۔ کوئی موڑ آتا تو وین کی روشنیاں سڑک سے جدا ہو کر تاریک جنگل کے بلند درختوں کو منور کر دیتیں۔

”یہاں سے لاگن کا قصبہ تین میل کے فاصلے پر ہے۔“ بوڑھے نے وین روکتے ہوئے کہا ”میرا فارم یہاں سے دائیں ہاتھ چند کوس پر ہے۔ میں جلدی میں ہوں ورنہ تمہیں قصبے تک ضرور چھوڑ آتا۔“

میں سامان اٹھا کر نیچے اتر گیا۔ اس نے وین دائیں طرف کچے راستے پر موڑ دی اور

جنگل میں گم ہو گیا۔ اب سڑک مکمل طور پر سنان اور تاریک تھی۔ دونوں کناروں پر جنگل کے دیو قامت درخت سڑک پر جھکے ہوئے اس سناٹے کو اور بھی وحشت ناک بنا رہے تھے۔ اس اندھیری سڑک پر اپنا سامان اٹھا کر قصبے تک پیدل جانے کی مجھ میں ہمت نہ تھی، چنانچہ میں سڑک کے ساتھ جنگل میں آ کر گیا تاکہ کسی مناسب جگہ پر خیمہ نصب کر کے رات گزاری جا سکے۔ درختوں کے تلے گھاس پھوس اور جھاڑیوں کی بہتات تھی اور مجھے چلنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ یہاں تاریکی کا مکمل راج تھا، کچھ دور چلنے کے بعد تاریکی قدرے کم ہونے لگی۔ جنگل ختم ہوا چاہتا تھا۔ میں نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ گھنے درختوں کے خاتمے پر ایک ریتلا میدان آیا جس کے پرے نیم تاریکی میں ایک بہت بڑی اور پرسکون جھیل تھی۔ میں نرم اور بھر پوری ریت پر چلتا ہوا جھیل کے کنارے تک آ گیا اور ایک ہموار جگہ تلاش کر کے اپنا خیمہ نصب کر دیا۔ میں جب بھی ہالنگ کے ذریعے سفر کرتا ہوں تو اپنے تھیلے میں خوراک ضرور رکھتا ہوں۔ جانے کہاں رات ہو جائے۔ اس شب ”ڈنز“ کے لیے انتظامات نہایت وافر تھے۔ قیمے کا ٹین ڈبل روٹی، انڈے اور کافی، گیس کا سفری چولہا دیاسلائی دکھاتے ہی روشن ہو گیا۔ فرانگ پین گرم ہو گیا تو میں نے قیمے کے ساتھ دو انڈے بھی تل لیے۔ کافی بنانے کے لیے پانی درکار تھا سو میں نے کیتلی وہیں بیٹھے جھیل کے شفاف پانی میں ڈبو کر البال بھری اور چولے پر رکھ دی۔ جھیل کا پانی صاف اور خشک تھا۔

”ڈنز سے قبل جھیل میں غسل کر لیا جائے تو بہتر ہوگا۔“ میں نے سوچا اور کپڑے اتارنے شروع کر دیئے۔ ادھر ادھر نگاہ کی۔ ظاہر ہے رات کے وقت اس جنگل میں دور دور تک کوئی تنفس موجود نہ تھا۔ یعنی جامہ غسل زیب تن کرنے کا تردد غیر ضروری تھا۔ مجھے ماسکوں میں ہوٹل زولو توئی کوئیس کا اجتماعی حمام یاد آ گیا جہاں میں صبح غسل کرنے کی نیت سے داخل ہوا اور شرمندہ ہو کر الٹے پاؤں باہر آ گیا۔ ”کامریڈ آپ غسل نہیں کریں گے کیا؟“ باہر بیٹھے ہوٹل کے ملازم نے مجھ سے پوچھا ”اس حمام میں تو سبھی ننگے ہیں۔“ میں نے غصے سے جواب دیا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے کہ غسل کے لیے ڈنز سوٹ زیب تن کرنا چاہئے؟“ ملازم نے ایک فلک شکاف قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ”روس میں ایسا ہی ہوتا ہے۔“ چونکہ روس میں قیام کے دوران غسل کیے بغیر گزارا ممکن نہیں تھا اس لیے میں نے کمر کے گرد تولیہ باندھ لیا اور حمام میں نہانے لگا۔ میری اس حرکت پر روسی نہایت محظوظ ہوئے اور تمام عرصہ مجھے یوں گھورتے رہے جیسے میں وہاں ننگا آ گیا ہوں۔

بہر حال یہاں دور دور تک کوئی روسی تو کیا کسی سویڈش کا بھی گزرنہ تھا۔ میں نے جھیل میں چھلانگ لگادی۔ رات کی خاموشی میں میرا جسم جھیل کی پرسکون سطح پر ٹکرایا اور اس تصادم نے ویرانے کے اس مکمل نکلت کو لمحہ بھر کے لیے کرچی کرچی کر دیا۔ ریشم کی طرح ملائم اور ٹھنکے شیشوں کی مانند شفاف پانی نے مجھے اپنی نرم آغوش میں لے لیا۔ میں جھیل سے باہر نکلا تو اپنے تئیں پہلے سے تازہ اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا، خیے کے باہر ریت پر بیٹھ کر کھانا کھایا اور پھر گرم کافی کی چسکیاں لینے لگا۔ تھوڑی دیر میں چاند نکل آیا اور پوری جھیل چاندنی میں نہا گئی۔ میرے نم آلود جسم پر چاند کی ٹھنڈی لو نے مجھے خوش قسمتی اور آزادی کے ایک ان جانے احساس سے روشناس کیا۔ ہر طرف ایک سحر انگیز سکون تھا۔ میں نے جھلمل جھلمل کرتی جھیل کی طرف دیکھا اور جانے کیوں کو پن ہیگن کی ساحلی چٹان پر بیٹھی نعشی جل پری کے لیے اداس ہو گیا۔

میں نے کافی کا آخری گھونٹ بھرا اور خیے کے اندر جا کر لیٹ گیا۔ چمکتی ہوئی جھیل یہاں سے بھی دکھائی دے رہی تھی۔ چاند کی کنسناتی کرنوں کی وجہ سے خیے کے اندر بھی ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ مجھ پر غنودگی طاری ہو گئی اور میں جلد ہی سو گیا۔ رات کے پچھلے پہر مجھے خیے سے باہر کسی جاندار شے کی موجودگی کا احساس ہوا، جیسے کوئی زور زور سے سانس لے رہا ہو۔ میں نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ میرے خیے کے عین اوپر کسی عجیب الخفقت دیو قامت جانور کا سایہ حرکت کر رہا تھا۔ شدید خطرے کے احساس نے مجھے پوری طرح چوکس کر دیا۔ ”ہاتھی؟“ میں نے قد آور سائے کو جانچتے ہوئے اندازہ لگایا، لیکن اسی لمحے اپنی حماقت کا احساس ہو گیا، سویڈن میں بھلا ہاتھی کہاں پائے جاتے ہیں۔ سائے نے ایک مرتبہ پھر حرکت کی۔ اب وہ اپنی تھوٹھی خیے کے نچلے حصے کے ساتھ رگڑ رہا تھا۔ میں خوف سے بری طرح کا پنے لگا ”اللہ میاں اب کے بچالیں جیو پھر کون بد بخت سیاحت کا نام لے۔“ میں نے لرزتے ہوئے آبیہ الکرسی کا در و در شروع کر دیا۔ پچھلی رات کی خوش قسمتی اور آزادی کا احساس کا فور ہو چکا تھا۔ خاصی دیر تک یہ حالت برقرار رہی مگر وہ کم بخت سایہ وہاں سے ہٹنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ میں نے سوچا اگر میں یہیں خیے میں پڑا رہا تو یہ ”شے“ بڑی آسانی سے خیہ مجھ پر گرا کر میرا قلع قمع کر دے گی۔ اس سے بہتر ہے کہ یکدم باہر نکل کر بگٹٹ دوڑ لگادی جائے۔ مجھے اس وقت اپنے پاس کسی مہلک ہتھیار کی غیر موجودگی کا شدت سے احساس ہوا۔ اب میرے پاس اس نوعیت کا ہتھیار صرف آلو چھیلنے والے چاقو کی صورت میں

ہی موجود تھا۔ چنانچہ میں نے چاقو کا دستہ سختی سے مٹھی میں بھینچ لیا اور اس کا کند پھل تانے چھلانگ لگا کر باہر آ گیا۔ ریت پر پاؤں پڑتے ہی میں نے ایک قلائع بھری اور سمت کا تعین کیے بغیر اندھا دھند بھاگنا شروع کر دیا۔ ریتلا میدان طے کرنے کے بعد جب میں جنگل میں داخل ہونے لگا تو لمحہ بھر کے لیے رکا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ میرے خیے کے پاس ایک عظیم قامت بارہ سنگھا تھوٹھی اٹھائے میری طرف بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے تیز اور آپس میں گتھے ہوئے سینک چاندنی میں چمک رہے تھے۔ وہ کچھ دیر تو وہیں کھڑا ٹٹکی باندھے مجھے دیکھتا رہا اور ایک مرتبہ پھر خیے کو اپنی لمبی تھوٹھی سے ٹٹول کر بڑی شان بے نیازی سے جنگل کی جانب چل دیا۔ جنگل کے کنارے پہنچ کر اس نے مڑ کر خیے کی جانب دیکھا اور پھر درختوں میں غائب ہو گیا۔ میں کچھ دیر وہاں کھڑا رہا کہ مبادا وہ صاحب اپنے ساتھیوں کو بلانے گئے ہوں کہ جسے سرپٹ دوڑنا پاکستانی دیکھنے کا اشتیاق ہو دیکھ لے، لیکن شاید ہمارے کسی سفارتی نمائندے کا اس علاقے سے گزر ہو گیا تھا اس لیے بارہ سنگھے بھی پاکستان کے وجود سے لاعلم تھے۔ میں بڑی احتیاط سے چلتا ہوا واپس خیے تک آیا۔ میری نظریں جنگل کے اسی حصے پر لگی تھی جہاں بارہ سنگھا غائب ہوا۔ میں نے جلدی سے اپنا خیہ سینٹا اور سامان کندھے پر رکھ کر ریتلے میدان کو عبور کر کے جنگل میں داخل ہو گیا۔ خود رو تیل بوٹوں اور جھاڑیوں کو پھلانگتا میں سڑک پر واپس پہنچ گیا۔ میں بری طرح ہانپ رہا تھا۔ سانس درست کیے بغیر میں نے لاگن کے قصبے کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ لاگن میں داخل ہوا تو صبح صادق کی روشنی ہر سو پھیل رہی تھی، حالانکہ ابھی صرف تین بجے تھے۔ قصبے کے آغاز میں ”پولیس لاگن“ کا بورڈ آویزاں تھا۔ میں پولیس سٹیشن کے اندر چلا گیا۔ یورپ میں کلیسا اور پولیس سٹیشن دو ایسے مقام ہیں جہاں شب ب سری کے لیے ہمیشہ جگہ مل جاتی ہے، بشرطیکہ کوئی کوٹھڑی خالی ہو، یعنی پولیس سٹیشن کی۔ سٹیشن کے اندر رات کی ڈیوٹی پر متعین پولیس افسر اپنے جدید دفتر میں بیٹھا فائلیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے اپنی دکھ بھری کہانی سنائی اور بقیہ شب گزارنے کے لیے کسی کوٹھڑی میں سونے کی اجازت چاہی ”فی الحال تو کوئی جگہ نہیں۔“ اس نے فائل بند کی اور اٹھ کھڑا ہوا ”ہاں البتہ ابھی ابھی میں نے ایک بوڑھے شرابی کو ایک کوٹھڑی میں بند کیا ہے۔ وہاں دو بستر موجود ہیں۔“

”میں کسی بارہ سنگھے کی بجائے کسی شرابی کی رفاقت زیادہ پسند کروں گا۔“ میں نے

خوشدلی سے کہا۔

”آپ نے جو کچھ دیکھا وہ ایک بڑی نیل گائے تھی جو صرف خطرے کی صورت میں انسان پر حملہ آور ہوتی ہے۔ رات کے پچھلے پہر جنگل کے اکثر جانور جھیل کے کنارے پانی پینے آ جاتے ہیں۔“ اس نے جیب سے کتھیاں نکال کر کوٹھڑی کا دروازہ کھول دیا۔ بوڑھا شرابی بستر پر سونے کی بجائے فرش پر چرت لیٹا خراٹے لے رہا تھا۔ میں کپڑے بدل کر لیٹنے لگا تو شرابی کی آنکھ کھل گئی۔ میری طرف دیکھا اور آنکھ میچ کر مسکرا دیا ”تم کس جرم میں پکڑے گئے ہو؟“ میں نے بتایا کہ میں ایک پاکستانی سیاح ہوں اور صرف شب بسری کے لیے آیا ہوں۔ اس کے پلے کچھ نہ پڑا اور وہ منہ کھول کر بڑے بے ہنگم طریقے سے بلند آواز میں گانے لگا۔

”یہ سویڈش لوک گیت ہے۔“ اس نے اپنا سانس درست کرتے ہوئے کہا ”تم بھی اپنے ملک کا کوئی گیت سناؤ ناں!“ میں اس کی فرمائش نظر انداز کر کے بستر پر لیٹ گیا اور اپنے اوپر کمر باندھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

”نہیں سناؤ گے تو سونے نہیں دوں گا۔“ بوڑھا شرابی میرے سر پر کھڑا تھا ”سناؤ۔“ اس نے اس طرح گرج کر کہا جیسے پرانے زمانے کے بادشاہ درباری رقاصہ کو حکم دیا کرتے تھے کہ ”ناچو“ میں خاموش رہا اس نے میرے کمر کا کونہ پکڑا اور اسے کھینچ کر فرش پر پھینک دیا۔ وہ اپنی فرمائش پوری کروانے پر تلا ہوا تھا۔

”کیا مصیبت ہے۔“ میں تنگ آ کر چیخا ”تم سے تو وہ جنگلی نیل گائے ہی بہتر تھی۔ کم از کم اس نے گیت سنانے کی فرمائش تو نہیں کی تھی۔“

شور سن کر پولیس افسر اندر آ گیا۔

”بوڑھا ابھی نشے میں ہے۔“ اس کے لہجے میں تاسف تھا ”میری ڈیوٹی ختم ہونے کو ہے آپ میرے ساتھ گھر چلیں اور وہاں آرام کریں۔“ میں نے تکلف برتنا چاہا تو وہ مصر ہو گیا۔ ”ایک ہی رات میں دو ناخوشگوار تجربے یقیناً آپ کو سویڈن کی سیاحت کے بارے میں بد دل کر دیں گے۔ آپ ضرور میرے ساتھ چلیں۔“

پولیس افسر کارل گسٹاف ریمبرگ کا گھر قصبے سے پرے جنگل کے شروع میں تھا۔ اس کی بیوی انگریڈ اگرچہ انگریزی سے نا بلدی تھی لیکن اس کا بار بار ”تاک سے میکے“ یعنی بہت بہت شکریہ کہنا

اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ وہ میری آمد پر بیحد خوش ہے۔ ان کے بچے سکول جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ بڑی لڑکی نے بڑے فخر سے مجھے اپنا نکلن کا الیم دکھایا جس میں پاکستان کے دو ٹکٹ چسپاں تھے۔ کچی مچھلی اور کافی کے ناشتے کے بعد میرا بستر بچوں کے کمرے میں لگا دیا گیا اور میں لیٹتے ہی گہری نیند سو گیا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو میں بیدار ہو گیا۔

”ہیلو“ یہ کارل کی آواز تھی۔ ”تمہاری نیند میں خلل ہونے کی معافی چاہتا ہوں۔“ اس نے دروازے میں سے جھانکتے ہوئے کہا۔ ”میرے چند دوست تم سے ملنے کے خواہشمند ہیں۔ انہیں اس سے پہلے کسی پاکستانی سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا اور ویسے بھی شام کے سات بج رہے ہیں۔“

میں کپڑے تبدیل کر کے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

”اولے بھی پولیس افسر ہے۔ ستروم برگ ٹاؤن ہال میں خزانچی ہے اور یہ ہے روز برگ جس کا گھر ساتھ والے جنگل کے وسط میں ہے جہاں یہ لکڑیاں کاٹنے کا کام کرتا ہے۔“ کارل نے دوستوں کا تعارف کروایا اور بھی بہت سے لوگ تھے۔۔۔ مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے سویڈش بیر پیش کی گئی۔ خواتین کو پاکستان کے شادی بیاہ کے رسم و رواج پر دہ مذہبی رسوم اور ثقافتی تقاریب کے بارے میں جاننے کا بھید اشتیاق تھا۔ میں نے جب انہیں بتایا کہ منگنی ہو چکنے کے باوجود مجھے اپنی ہونے والی بیوی کو دیکھنے یا اس سے بات کرنے تک کی اجازت نہیں تو محفل میں سنسنی پھیل گئی ”اوہ نو“ اور ”یہ کیسے ہو سکتا ہے“ کے نعرے بلند ہوئے۔ ”تو پھر تمہارے ہاں شادیاں کامیاب کیسے ہوتی ہیں۔“ انگریڈ نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا ”جب کہ تم اپنی بیوی کو پہلی مرتبہ شادی کے بعد دیکھتے ہو اور اس سے قبل میل ملاپ کے ذریعے تمہیں ایک دوسرے کو پرکھنے کا موقع بھی نہیں دیا جاتا۔“

”دیکھئے ہمارے ہاں شادی کے وقت لڑکا اور لڑکی اکثر ”نا تجربہ کار“ ہوتے ہیں۔ میں نے باقاعدہ لیکچر بازی شروع کر دی۔ ”یورپ کی طرح لڑکا اپنی بیوی کا موازنہ اپنی گزشتہ محبوباؤں سے نہیں کر سکتا کہ ہائے این کے ہونٹ کتنے خوبصورت تھے۔ ماگریٹ کی ہنسی پھولوں کی لڑی تھی۔ ماریا کی آنکھیں نیلی جھیلیں تھیں وغیرہ وغیرہ چنانچہ پاکستانی لڑکے کے نام جو بھی ”لاٹری“ نکل

آئے وہ فوراً اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ ادھر لڑکی کے لیے خاوند اس کا پہلا محبوب ہوتا ہے اور اسے اس میں کوئی بھی خامی نظر نہیں آتی کیونکہ وہ اس سے بہتر لڑکوں کی خوبیوں سے ناواقف ہوتی ہے۔ یہ کچھ اسی طرح ہے جیسے یورپ میں جوانی کی حدود میں داخل ہوتے ہی جولا کا یا لڑکی نظر آئے اس سے والہانہ عشق ہو جاتا ہے اس عشق کو آپ لوگ صرف (Teenage Crush) کا نام دیتے ہیں۔“

”یہ تو تم درست کہتے ہو۔“ کارل کی بیوی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ شاید اسے اپنا پہلا عشق یاد آ گیا تھا۔ ”لیکن پہلی محبت کے احساسات ہمیشہ عارضی ہوتے ہیں۔“

”وہ اس لیے کہ دوسری محبت گلی کی کنڈر پر کھڑی آوازیں دے رہی ہوتی ہے اور ہمارے ہاں اس کا موقع ہی نہیں آنے دیا جاتا۔“

”سکول“ کارل کی بیوی نے ہنستے ہوئے جام اٹھا کر کہا۔

”سکول“ میں نے پانی کا گلاس اٹھا کر لفظ دہرایا ”میں نے یہ لفظ ڈنمارک میں بھی سنا تھا“ آخر اس کا مطلب کیا ہے؟“

”ڈاننگ لیٹروں کے زمانے میں رواج تھا کہ مہمان اور میزبان ایک ہی پیالے میں سے شراب پیتے تھے۔ اس پیالے کو ”سکول“ کہا جاتا تھا۔ کارل نے جواب تک خاموشی سے ہماری گفتگو سن رہا تھا آگے بڑھ کر جواب دیا۔ ”اب ”سکول“ جام صحت تجویز کرنے یا نیک خواہشات کے اظہار کا طریقہ ہے۔“ ایک محفل میں ”سکول“ کے لفظ کا استعمال جتنا زیادہ ہو، وہ اتنی ہی کامیاب گئی جاتی ہے۔“

”تو پھر سکول“ میں نے کارل کی بیوی کی طرف دیکھا اور گلاس اٹھایا۔

”اوہوں“ کارل نے منہ بنا لیا ”میزبان کی بیوی کو ”سکول“ کہنا آداب محفل کے خلاف ہے۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے گلاس نیچے رکھ دیا۔

”فرض کرو ایک محفل میں بارہ افراد مدعو ہیں اور اگر ہر ایک فرد دس مرتبہ میزبان کی

بیوی کو ”سکول“ کہے تو اسے ایک سو بیس مرتبہ شراب پینی پڑے گی۔ نتیجہ ظاہر ہے“ اس نے بناوٹی طور پر لڑکھڑا کر اس کا مظاہرہ کیا۔

”کارل“ اس کی بیوی نے پیار سے کہا ”گیارہ بج رہے ہیں اور تمہاری رات کی ڈیوٹی شروع ہونے کو ہے۔“

کارل نے مہمانوں سے بھرپور معذرت کی اور وردی پہن کر پولیس سٹیشن چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب مہمان رخصت ہونے لگے تو روزنبرگ نے مجھے دوسری صبح اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ ”میں جیپ لے کر آ جاؤں گا اور ناشتے کے بعد تمہیں جنگل کی سیر کراؤں گا۔“

بھورے رنگ کی لکڑی کا بنا ہوا گھر گھنے جنگل کے عین وسط میں واقع تھا... روزنبرگ کی بیوی ایپرن باندھے پھانک پر ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ ”خوش آمدید“ اس نے ایپرن سے ہاتھ صاف کر کے میری طرف بڑھا دیا۔ گھر کا اندرونی حصہ نہایت صاف ستھرا اور آرام دہ تھا۔ کپڑے دھونے کی مشین، ٹیلی ویژن، فریج جدید آسائش کا ہر سامان موجود تھا۔

”جنگل میں اکیلے رہنے سے آپ گھبرا نہیں جاتیں؟“ میں نے روزنبرگ کی بیوی سے دریافت کیا۔

”مجھے تو گھر کے کام کاج سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ بچے صبح سویرے اپنی موٹر سائیکلوں پر سوار ہو کر لاگن کے سکول میں پڑھنے چلے جاتے ہیں۔ گھر کی صفائی اور کھانا پکانے سے فارغ ہوتی ہوں تو میرا خاوند کام سے واپس آ جاتا ہے۔ دوپہر کو کار لے کر جنگل میں رہنے والے کسی اور لکڑہارے کی بیوی سے ملنے چلی جاتی ہوں۔ اور شام کو گھر کے تمام افراد ٹیلی ویژن کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔“ ناشتے کی میز پر کھی ڈبل روٹی میں سے ہمارے ہاں کی تنور کی گرم روٹی کی سوندھی مہک اٹھ رہی تھی۔ ”میں نے خود اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے۔“ روزنبرگ کی بیوی نے ڈبل روٹی کاٹ کر مکھن کی ایک دبیز تہہ چڑھا کر مجھے پیش کی۔ ”دودھ اور مکھن ہماری اپنی گائیوں کا ہے اور شہد ہمارے باغ میں لگے چھتوں سے حاصل کیا گیا ہے۔“

”سردیوں میں شدید برف باری کے دوران آپ کے لیے باہر کی دنیا سے رابطہ قائم رکھنا خاص دشوار ثابت ہوتا ہوگا۔“ میں نے گرم کافی کا ایک گھونٹ بھر کر پوچھا

”ویسے تو برف باری کے دوران قصبے کو جانے والے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں مگر میونسپل کمیٹی کا ایک بلڈوزر روزانہ صبح چھ بجے آ کر ہمارے گھر کے گرد تمام سڑکوں پر سے برف

بنا کر جاتا ہے۔“

”بلڈوزرز روزانہ صرف آپ کی خاطر بھیجا جاتا ہے۔“ میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔
”ہاں کیوں نہیں؟ یہ کمیٹی والوں کا فرض ہے۔ کیا میں میونسپل ٹیکس ادا نہیں کرتا؟“
ناشتے سے فارغ ہو کر ہم جنگل کی سیر کو نکل کھڑے ہوئے۔

سوئیڈن کو بجاطور پر جنگلوں اور جھیلوں کا ملک کہا جاتا ہے۔ ملک کے کل رقبے کا پچپن فیصد حصہ جنگلوں اور تیرہ فیصد دریاؤں اور جھیلوں پر مشتمل ہے۔ صرف نو فیصد رقبہ زیر کاشت ہے۔ چونکہ دریاؤں کا رخ قدرتی طور پر شمال مغرب سے جنوب مشرق کی سمت ہے اس لیے جب درختوں کو کاٹ کر شہتیروں کی صورت میں دریا برد کیا جاتا ہے تو یہ لکڑی بہتی ہوئی بحیرہ بالٹک کے ساحل پر پہنچ جاتی ہے۔ جہاں اسی صنعت سے وابستہ فیکٹریاں قائم ہیں۔ ان تمام معلومات کا مہم روزنبرگ تھا جو جیپ چلانے کے ساتھ ساتھ گائڈ کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا۔
”کیا آبی وسائل سے لکڑی بھیجے کا طریقہ کار قدرے مہنگا نہیں؟“ میں نے دریافت کیا۔

”بالکل نہیں۔ ایک اندازے کے مطابق لکڑی کا ایک شہتیر آبی وسائل سے کسی بندرگاہ پر پہنچانا وہاں پوسٹ کارڈ لکھنے سے بھی ارزاں پڑتا ہے بلکہ ہم میں سے کئی لکڑہارے بالٹک کی بندرگاہوں پر کام کرنے والے دوستوں کے لیے تحفے یا رسائل کسی شہتیر کے ساتھ باندھ دیتے ہیں جو ان تک بحفاظت پہنچ جاتے ہیں۔“

جنگل کے ایک حصے میں مشینی آروں کی مدد سے کٹائی ہو رہی تھی۔ صنوبر، شمشاد اور برج کے ہزاروں قد آور درخت ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ ”صنوبر اور شمشاد جس کا درخت نوے سال سے پہلے پختہ نہیں ہوتا“ کاغذ کی تیاری کے لیے نہایت موزوں ہیں۔ ”روزنبرگ کہہ رہا تھا۔“ دنیا کی کل پیداوار کا دس فیصد کاغذ سوئیڈن میں بنایا جاتا ہے۔ لکڑی کی صنعت میں دیاسلانیائیں فرنیچر اور ہارڈ بورڈ بھی شامل ہیں بلکہ ہم تو بردے سے شراب بھی تیار کرتے ہیں۔“

جنگل سے واپسی پر ایک کھلے میدان کے قریب روزنبرگ نے جیپ روک لی۔ ہم سے چند گز کے فاصلے پر کھلی فضا میں تین نیل گائیں بڑے سکون سے چر رہی تھیں۔ ”وہ رہے تمہارے خونخوار بارہ سنگھے۔“ اس نے مسکرا کر گائیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”اگر تم چند روز رک جاؤ تو پھر ان

کا شکار کھیلا جاسکتا ہے۔ ابھی پابندی ہے۔ ویسے بھی میں اس علاقے کا فاریسٹ رینجر ہوں۔ اس لیے ظاہر ہے مجھ پر پابندی کا اطلاق قدرے شدت سے ہوتا ہے۔
”دو پہر کو ہم واپس لاگن پہنچ گئے۔ کارل اور روزنبرگ کا اصرار تھا کہ میں چند روز اور ٹھہر جاؤں مگر میں نے تدل سے ان کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا اور جانے کی اجازت چاہی۔ کارل کی بیوی نے جلدی سے چند سینڈویچ بنا کر میرے تھیلے میں رکھ دیئے اور وہ دونوں مجھے شاک ہوم جانے والے شاہراہ پر چھوڑ آئے۔“

سنہرے بالوں والا ہنس مکھ سویڈش لڑکا شیل کمیشن ایجنٹ تھا اور وہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں لیپ لینڈ کے شہر کیرونا جا رہا تھا۔ اس نے مجھے شام کے وقت لاگن سے لفٹ دی جہاں میں ایک بار پھر لفٹ حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا اور واپس کارل کے ہاں جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ غروب آفتاب سے قبل ہم نے ایک ایسی جھیل کے کنارے سفر کیا جو رقبے میں اتنی وسیع تھی کہ سمندر کا گمان ہوتا تھا۔ اس کے بعد میلوں تک پھیلے ہوئے لہلہاتے کھیت اور کسانوں کے خوبصورت گھر آئے۔ ورنامو پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ نصف شب نے ہمیں لہن شوپنگ اور یان شوپنگ کے جڑواں شہروں میں پایا جہاں دیاسلانیائیں بنانے والے کارخانے رات کی شفٹ پر چل رہے تھے۔

”تم میرے ساتھ لیپ لینڈ تک کیوں نہیں چلتے۔ کیرونا کے نواح میں رہنے والے تمام اسکیمو میرے دوست ہیں۔ میں خاندانی منصوبہ بندی کی ادویات فروخت کرتا ہوں۔“ سفر کے دوران شیل اور میں قدرے بے تکلف ہو گئے تھے اور اسے شمالی سوئیڈن تک کے طویل سفر کے لیے رفاقت کی تلاش تھی۔

”آرکٹک سرکل کے پاس اسکیمو لینڈ دیکھنے کا مجھے اشتیاق تو ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ میں نے کوپن ہیگن سے روانہ ہوتے وقت ایک نہایت عزیز پاکستانی دوست ریاض کو اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔ وہ میرا انتظار کر رہا ہوگا“ میں نے معذوری کا اظہار کیا۔ ”اور ہاں ان اسکیمو حضرات کو خاندانی منصوبہ بندی کا شوق کیسے چرایا؟“

”اسکیمو کا سب سے قیمتی سرمایہ ریٹائرڈ کارپورٹ ہوتا ہے۔ کثرت اولاد سے ان ریورٹوں

کی تعداد میں کمی کا خدشہ ہوتا ہے اور ایک معزز اسکیمو کے لیے چھوٹے ریوڑ کا مالک ہونا نہایت ناخوشگوار ہوتا ہے۔“

سفر کے دوران ہم سویڈن کے نظام حکومت، خارجہ پالیسی، تعلیم اور سماجی بہبود کے پروگراموں کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ شیل کو اپنی حکومت کی پالیسیوں سے شدید اختلاف تھا۔

”غیر جانبداری منافقت کا دوسرا نام ہے۔“ وہ کہہ رہا تھا ”ہمارے ملک نے تو اسے کاروبار بنا رکھا ہے۔ 1805ء کے بعد ہم کسی جنگ میں شریک نہیں ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم میں جب یورپ کے تمام ملک نازیوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو رہے تھے اور وہاں کے باشندے بھوکوں مر رہے تھے، ہم غیر جانبداری کا ڈھونگ رچا کر تماشا دیکھتے رہے بلکہ ہٹلر کو جنگی سامان فراہم کر کے خوب ہاتھ رنگے۔ اسی دولت سے اس فلاحی مملکت کی تعمیر ہوئی۔ اب سویڈن کے ایک عام مزدور کو لیجئے۔ اس کی نوکری کا ذمہ سرکار پر ہے۔ گھر ”مزدوروں کی انجمن“ فراہم کرتی ہے۔ اگر وہ بیمار ہو جاتا ہے تو مزدوروں کے فلاحی ہسپتال میں مفت علاج کرواتا ہے۔ جسمانی صحت کے لیے مزدوروں کی کھیلوں کی تنظیم کا رخ کرتا ہے۔ اگر وہ مر جاتا ہے تو..... یعنی صبح سے شام تک یا تو بڑی سرکار اس کی نگہداشت کرتی ہے یا وہ بڑی اماں مزدوروں کی انجمن کے زیر سایہ رہتا ہے۔ ملک نہ ہوا چڑیا گھر ہو گیا جہاں جانوروں کی دیکھ بھال داروغے کے ذمے ہوتی ہے۔“

میں نے اسے بتایا کہ ترقی پذیر ملکوں میں سویڈن کو سماجی بہبود کے معاملے میں نمونے کا ملک سمجھا جاتا ہے۔

”وہ میں آپ کو بتاتا ہوں۔“ اس نے غصے سے سٹیئرنگ پر ہاتھ مار کر کہا ”جنسی بے راہ روی میں ہم تمام دنیا کو مات کرتے ہیں۔ خود کشیاں تو قومی مشغلے کی صورت اختیار کر چکی ہیں۔ یورپ کے تمام ملکوں میں اتنے پاگل اور عادی شرابی نہیں جتنے ہم نے پال رکھے ہیں۔ ایک شخص کار چوری کرتا ہے تو اسے تنبیہ کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ بھی بری بات ہے، ایسا نہیں کرتے۔ دوسری بار پکڑا جائے تو ناراضگی کا اظہار کیا جاتا ہے کہ کہا جو تھا ایسا نہیں کرتے۔ تیسری مرتبہ دھر لیا جائے تو معذرت کے ساتھ دو چار ماہ جیل بھیج دیا جاتا ہے اور اس کے بیوی بچوں کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا جاتا ہے۔ یہ ہوگئی آپ کی سماجی بہبود اور مجرموں کی اصلاح، ادھر ہفتے کی رات کو معدودے چند

سویڈش نشے میں ڈھت ہوئے بغیر گھر لوٹتے ہیں۔ پاگل پن وبا کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اور تو اور ہمارا عظیم ڈرامہ نویس سٹرنڈ برگ بھی پاگل ہو کر مرا تھا۔ اور پھر ہم جنسی کی لعنت..... یہ ہے ایک نمونے کی فلاحی مملکت، ہمیں ایک خونی انقلاب کی ضرورت ہے۔“ اس نے مکالمہ کرتے ہوئے فیصلہ دیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے افرڈ ٹوبل کا نام لیا۔

”ہاں وہ ذات شریف۔ اس کی بھی سنئے۔“ اس نے چمک کر کہا ”آج کی دنیا کی آدھی مصیبتوں کا سہرا اس شخص کے سر ہے۔ ڈائنامائٹ ایجاد کرنے والا آدمی بنی نوع انسان کی بھلائی کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہے؟ نوبل انعامات ایک ڈھکوسلے کے سوا کچھ بھی نہیں۔

شیل جب مجھے شاک ہوم سے تیس میل ادھر اتار کر اپالا جانے والی شاہراہ پر مڑا تو سویڈن کے بارے میری معلومات میں گرا نقدر اضافہ ہو چکا تھا۔

فارم سے نکلی ہی تھی کہ تم نظر آ گئے۔ مشرقی ناک نقشے کا ایک اجنبی رات کے اس پہر سنسان سڑک کے کنارے لیٹا ہوا اور پھر یہ خوفناک کھال کا کوٹ، میں نے سوچا ہونہ ہو ضرور کوئی بھوت ہے۔“

”ہو سکتا ہے۔“ میں نے جہائی لے کر کہا۔

”کیا ہو سکتا ہے؟“ بڑھیا نے چونک کر کہا اور پھر اپنا پو پلا منہ کھول کر بننے لگی۔

بڑھیا نے مجھے شہر کے باہر اتار دیا۔ یہ شاک ہوم کی نواحی آبادی تھی۔ خوشنار ہاشی فلیٹوں کی درجنوں جدید بلند عمارتیں پھولوں کے حسین قطعات میں گھری ہوئی تھیں۔ پاس ہی ایک بہت بڑا پارک تھا۔ ابھی صرف تین بجے تھے مگر سورج جیسے سوانیزے پر آ گیا ہو۔ ہر سو چند ہیادینے والی دھوپ تھی۔ سارا علاقہ بالکل سنسان پڑا تھا۔ سڑکیں پارک، فٹ پاتھ بالکل خالی تھے۔ دور دور تک کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہاں ایٹمی دھماکہ ہونے والا ہے اور یکدم خبر ہونے پر یکمین اپنے گھروں کو چھوڑ کر کسی اور جگہ منتقل ہو گئے ہیں۔ میں نے پارک کے کونے میں لگے فون بوتھ سے ریاض کو فون کیا۔

”ری آؤ سپیکنگ“ نیند میں ڈوبی ہوئی ایک بھاری آواز آئی۔

”ابے اوری آؤ کے بچے۔ سورج سر پر آ گیا ہے اور تم ابھی تک سو رہے ہو؟“

”کون بول رہا ہے؟“ آواز میں گھبراہٹ کا پہلو نمایاں تھا۔

”آپ کے والد صاحب سیالکوٹ سے تشریف لائے ہیں۔“ میں نے بمشکل اپنی ہنسی روکتے ہوئے کہا ”مستصر بول رہا ہوں بھئی۔“ اس کے بعد جو کچھ ریاض نے کہا وہ ناقابل اشاعت ہے۔

میں ریاض کو کالج کے زمانے سے جانتا تھا۔ قانون کی ڈگری لینے کے بعد اس نے وکالت کا پیشہ اختیار کر لیا۔ وکالت تو خوب چلی مگر آمدن نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس کی وجہ اس کے لاتعداد دوست تھے جو اپنے جاننے والوں کے مقدمے اس کے پاس لے آتے اور فیس کے طور پر صرف چائے پلا کر خادیتے۔ ایک مشترکہ دوست کے کہنے کے مطابق آدھا پاکستان ریاض کا دوست ہے اور باقی آدھا اس سے ابھی متعارف نہیں ہوا۔ خوش قسمتی سے اسے شاک ہوم یونیورسٹی میں بین الاقوامی قانون کا وظیفہ مل گیا۔ کورس کے خاتمے پر ”مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ“ کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے ریاض سویڈن میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہو گیا بلکہ شادی

شاک ہوم کی نیلی شفق

رات کے دو بجے کو تھے مگر گھپ اندھیرا ہونے کی بجائے ہر سو ہلکی سی روشنی تھی جیسے شام کا دھند لگا ہو۔ شاک ہوم جانے والی سڑک، اونچے درخت اور لہلہاتے کھیت مدھم روشنی میں نہائے ہوئے تھے۔ سامنے سنگ میل پر ”شاک ہوم 45 کلومیٹر“ کے الفاظ صاف پڑھے جا رہے تھے۔ اس خطے میں گرمیوں میں کسی وقت بھی مکمل تاریکی نہیں ہو پاتی۔ رات کا ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دینے والی تاریکی کا جو تصور ہمارے ذہنوں میں ہے وہ سویڈن میں آ کر مہل ہو جاتا ہے۔ گرمیوں میں گیارہ بجے سورج غروب ہوتا ہے تو صبح دو بجے پھر طلوع ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ صبح تین بجے دھوپ ہمارے ہاں کی تیز دو پہروں کی مانند چمک رہی ہوتی ہے۔ طلوع و غروب کے درمیانی وقفے میں بھی زمین اور فلک کے درمیان روشنی کی ایک ایک مدھم چادر بچھی رہتی ہے۔ اہل سویڈن اس روشنی کو نیلی شفق کا نام دیتے ہیں۔ صبح کی خنکی سے بچنے کے لیے میں نے اپنی ہراتی پوسٹین پہن لی اور وہیں سڑک کے کنارے گھاس پر سستانے کی غرض سے لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک پرانی کار سڑک پر سے گزری۔ کچھ دور جا کر ڈرائیور نے بڑے زور کی بریک لگائی اور کار پیچھے لے آیا۔ یہ ایک بوڑھی کسان عورت تھی۔ جھریوں سے بھرپور چہرے پر حیرت اور خوف کی پرچھائیاں تھیں۔

”سکول“ میں نے وہیں لیٹے لیٹے بڑھیا سے مخاطب ہو کر کہا۔

”سکول“ اس نے ایک دم خوش ہو کر جواب دیا۔ ”اگر شاک ہوم چلنا ہے تو بیٹھ جاؤ۔“

میں اپنا سامان اٹھا کر کار میں آ بیٹھا۔

”تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔“ بڑھیا نے کار سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنے

بھی کر ڈالی۔ مجھے فون بوتھ سے باہر آئے ہوئے ابھی چند منٹ ہوئے ہوں گے کہ ریاض اپنی کار پر پہنچ گیا اور آتے ہی مجھ سے لپٹ گیا۔ مجھے اس میں اور تین سال قبل کے ریاض میں کوئی فرق نظر نہ آیا۔ البتہ اس کی مشہور زمانہ پھرتی ہوئی مونچھیں غائب تھیں۔ کالج میں دوستوں کے ساتھ تاش کھیلتے ہوئے اس کے پاس اچھے پتے آ جاتے تو غیر ارادی طور پر اس کی باتیں مونچھ پھرنے لگتی۔ یار لوگ فوراً اپنے پتے پھینک جاتے اور وہ کچھ بھی جیت نہ پاتا۔ وطن کے حالات اور دوستوں کی خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد اس نے میرا سامان کار میں رکھا اور ہم سولنا کی طرف روانہ ہو گئے جہاں طلباء کے ایک جدید ہوٹل میں اس کا قیام تھا۔ ہوٹل پہنچے تو ریاض کی بیوی آرڈرے برآمدے میں واقع باورچی خانے میں ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ ریاض نے میرا تعارف کروایا۔

”ہیلو مستصر“ آرڈرے نے گردن میں ہلکا سا خم دے کر کہا اور اپرن سے ہاتھ صاف کر کے مجھ سے مصافحہ کیا۔ ”ریاض نے مجھے تمہارے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے۔ تم لوگ کمرے میں بیٹھو، میں ناشتہ لے کر آتی ہوں۔“

ناشتے سے فارغ ہو کر دیر تک وطن کی باتیں ہوتی رہیں۔

”مجھے یونیورسٹی جانا ہے اور ریاض کے دفتر کا وقت بھی ہوا چاہتا ہے۔“ آرڈرے نے معذرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”تم تمام رات سفر میں رہے ہو، اس لیے بہتر ہے آرام کر لو۔“

میرے قیام کا انتظام برابر والے کمرے میں تھا۔ یہ آرڈرے کی ایک سہیلی کا تھا جو گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے لیے اپنے آبائی قصبے کو جا چکی تھی۔ کمرے کا سامان اور کتابوں کے شیلف اس کے کمین کے سبجے ہوئے ذوق کا پتہ دیتے تھے۔ دیواروں پر مشہور مصوروں کی تصاویر کے ساتھ ساتھ ماؤ، ہوچی من اور پے گویا کی بڑی بڑی تصاویر بھی آویزاں تھیں۔ یہ شخصیتیں مخصوص نظریات سے قطع نظر اصولوں کی خاطر قربانی اور انقلابی جدوجہد کی وجہ سے یورپ کی نئی نسل میں بے حد مقبول ہیں۔ میں آرام دہ بستر پر لیٹا تو پچھلی رات کی تھکاوٹ کا احساس سفید چادروں میں بسی ہوئی شہیل اور ہیلن کرٹس کی مہک میں جذب ہو گیا۔

میری آنکھیں کھلیں تو آرڈرے کمرے کی صفائی میں مشغول تھی۔ ”تم پورے بارہ گھنٹے سوئے ہو۔“ اس نے میرا سوٹ کیس پلنگ کے نیچے دھکیلتے ہوئے کہا۔ ”جلدی سے تیار

ہو جاؤ۔ آج شب ہم اپنے دوستوں کے ہمراہ شاہک ہوم سے باہر ایک پارٹی پر جا رہے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے آج میڈم سمرنائٹ (Mid Summer Night) ہے؟“

”وہ شیکسپیر والی؟“ میں نے ہانک لگائی۔

”وہ خواب تھی یہ حقیقت ہے۔“ آرڈرے کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔

مجھے یاد آیا کہ آج جون کی تیس تاریخ ہے اور موسم گرما کا نصف سفر مکمل ہو چکا ہے۔ ”نصف گرمیوں کی شب“ سویڈن کا ثقافتی تہوار ہے جسے یہاں کے باشندے کرسمس سے بھی زیادہ دھوم دھام کے ساتھ مناتے ہیں۔

ریاض کے کمرے میں بے شمار لوگ جمع تھے جن میں اکثریت پاکستانیوں کی تھی۔ میرا تعارف ہوا۔ ”مشتاق صاحب بھی لاہور کے ہیں۔ یہاں فلاسفی میں ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں۔“ مشتاق کے کندھوں تک پھیلے ہوئے لائے بالوں پر شیشوں سے مزین بلوچی ٹوپی نہایت بھلی لگ رہی تھی۔ ”اور فرصت اوقات میں فیشن کے رسالوں کے لیے فوٹو بناتے ہیں۔ مچھلیاں پالتے ہیں۔ مشرقی موسیقی کا ایک کلب چلاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔“

”ستار بھی بجاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔“ مشتاق نے اپنی بھاری مونچھوں کو تالاؤ دیتے ہوئے گرہ لگائی۔

”اور یہ ہے فاروق۔“ میرے سامنے ایک وجیہہ اور خوش وضع نوجوان کھڑا تھا۔ ”کنگز گارڈن میں پاکستانی ملبوسات کی دکان کرتا ہے۔ جب اسے اپنے دوسرے ”مشاغل“ سے فرصت ملے تو!“

فاروق نے ایک فلک شکاف قہقہہ بلند کیا۔ معلوم ہوا کہ اس کا قہقہہ لگانے کا انداز شاہک ہوم کی لڑکیوں کے لیے سم قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔

پتلا دبلا حامد انڈونیشیا کا تھا۔

”کٹر جیسا کہ نام سے ظاہر ہے پاکستانی عیسائی ہے۔“ ریاض نے ٹیپ ریکارڈر کے پاس کھڑے لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ ”اپنے کمرے کی پوری دیوار پر پاکستانی پرچم آویزاں کر رکھا ہے۔ ہندوستانیوں سے کہتا ہے جوتے اتار کر کمرے میں آؤ۔ پونچر جگہ ہے۔“

آرڈرے نے کافی اور کریم کیک سے مہمانوں کی تواضع کی۔ اب سورج کے غروب

ہونے کا انتظار تھا۔ ”ڈسمر نائٹ“ منانے کے لیے رات کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ گیارہ بجے تک انتظار کرنا پڑا۔ ہم سب ہوٹل کی سیڑھیاں اتر کر کاروں میں بیٹھ ہی رہے تھے کہ شہر سے آنے والی سڑک کے موڑ پر ایک ننھی منی ”بل کار“ نمودار ہوئی جو واقعی ایک غبارے جتنی تھی۔ کار ہمارے پاس آ کر رُکی تو اس کا سامنے کا پورا حصہ دروازے کی صورت میں کھل گیا اور ایک نہایت پھرتیلی اور شوخ قسم کی لڑکی اُچک کر باہر نکل آئی۔ وہ ایک تیز سرخ رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس کے لبوں پر ایک شرمیلی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور چہرے پر پسینے کے قطرے تھے۔

”ماگ ریتا کی بچی کہاں مر گئی تھیں؟“ آرڈرے نے آگے بڑھ کر غصے سے پوچھا۔ ”ہم لوگ تمہارا انتظار کرنے کے بعد اب جا رہے تھے۔“

”ہمیں پیرس میں تاخیر ہو گئی تھی۔ پرواز ابھی ابھی یہاں پہنچی ہے۔ سیدھی ایئر پورٹ سے آرہی ہوں۔“ اس نے معذرت بھرے لہجے میں کہا۔

”مستنصر! یہ میری عزیز ترین سہیلی ماگ ریتا ہے ملو۔“ آرڈرے نے تعارف کروایا۔

”سکینڈے نیوین ایئر سروس میں ایئر سوسٹن ہے۔“

”ہیلو۔“ اس کے لبوں پر ایئر ہوسٹس کی مخصوص مصنوعی مسکراہٹ کھیل گئی۔ یہ تبسم یہ تکلم اس کی عادت ہی تو تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ابھی پوچھے گی۔ ”آپ نے اپنی حفاظتی بیٹی کس کر باندھ لی ہے نا؟ ہم پرواز کرنے والے ہیں۔“

ماگ ریتا کی ”بل کار“ میں چونکہ صرف دو نشستیں تھیں اس لیے اسے ہوٹل کے باہر پارک کر دیا گیا اور ہم مشتاق کی کار میں سوار ہو گئے۔ ماگ ریتا اور آرڈرے اگلی نشست پر تھیں۔ میں ریاض اور ایک بیوقوف سی سویڈش لڑکی کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔

”مجھے امید ہے کہ آپ کا سفر خوش گوار طریقے سے کٹا ہوگا؟“ ماگ ریتا نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

”ماگ ریتا تم مستنصر کے ساتھ اپنے ہوائی مسافروں ایسا سلوک کر رہی ہو۔“ میرے کچھ کہنے سے قبل ہی آرڈرے نے ڈانٹ پلا دی۔ ”تم اب پرواز پر نہیں ہو۔“

”سوری۔ بس عادت ہی ہو گئی ہے۔“ اس نے جھینپ کر کہا۔

پہلے شاک ہوم کی جدید نواحی بستیاں گزریں پھر چھوٹے چھوٹے خوبصورت قصبے آئے۔ اب ہم بڑی شاہراہ سے مڑ کر ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پر جا رہے تھے۔ یکلخت ہر سوتا ریکی چھاگئی۔ ہم صنوبر کے گھنے جنگل میں سے گزر رہے تھے۔ جنگل ختم ہوا تو ذرا فاقی پر ایک جمیل نظر آئی۔

”جمیل کے کنارے ایک قدیم گاؤں ہے جس کے قریب کھلی فضا میں ہر سال ”ڈسمر نائٹ“ کا جشن منایا جاتا ہے۔“ آرڈرے نے مجھے بتایا۔

مشتاق ماگ ریتا کو اپنی محبوب مچھلیوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ”میں پچھلے سال پاکستان گیا تو سارا عرصہ مقامی مچھلیوں کی مدد سے گوادر کے آس پاس بحیرہ عرب میں مچھلیاں پکڑتا رہا اور پھر انہیں پانی سے بھرے پلاسٹک کے تھیلوں میں بند کر کے یہاں لے آیا۔ نہایت نادر اقسام ہیں۔ اب میں ان کی نسل کو فروغ دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”آپ مچھلیوں کے زراور مادہ میں کیسے تمیز کرتے ہیں۔“ ساتھ بیٹھی بیوقوف سویڈش لڑکی نے جلدی سے سوال کیا۔

”بچوں کو نہیں بتایا کرتے۔“ مشتاق نے جواب دیا اور پھر ماگ ریتا سے مخاطب ہو کر پوچھنے لگا۔ ”آپ کو مچھلیوں سے دلچسپی ہے؟“

”مجھے تلی ہوئی مچھلیاں بے حد پسند ہیں۔“ ماگ ریتا نے شوقی سے جواب دیا۔

مشتاق نے منہ بنا لیا۔

جمیل کے کنارے سینکڑوں لوگ سویڈن کے روایتی لباسوں میں ملبوس خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ساتھ والے جنگل سے کاٹے ہوئے سفیدے کے تنے زمین میں گاڑ کر انہیں جنگلی بیلوں، خوشنما پھولوں اور ہرے بھرے پتوں سے سجایا گیا تھا۔ سبزے کے ان ستونوں کے پاس میزوں پر کھانے اور خاص طور پر پینے کی وافر مقدار موجود تھی۔ میں نے ہجوم سے دور ایک پرسکون کونے کا انتخاب کیا اور اپنی سفید برساتی نرم گھاس پر بچھا کر بیٹھ گیا۔ سب سے اونچے آرائشی تنے کے نیچے مقامی موسیقاروں کا ایک طائفہ سویڈن کے روایتی رقص کی دھن بجانے لگا۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ کر سچے ہوئے تنوں کے گرد ایک دائرہ سا بنا کر ناچنا شروع کر دیا۔ بوڑھوں کو رقص سے بالکل دلچسپی نہ تھی۔ وہ شراب کے تسلوں

کے گرد کھڑے ہاتھوں میں اپنے والٹنگ آباؤ اجداد کی طرح سینک نما جام لیے صرف شور مچانے پر ہی اکتفا کر رہے تھے۔

”تم رقص کیوں نہیں کرتے؟ مگر بتا بھاگتی ہوئی میرے پاس آگئی۔ وہ مسکرا رہی تھی، بالکل ننھے سے معصوم بچے کی مانند۔ مجھے احساس ہوا کہ اس کی مسکراہٹ بے حد دلکش تھی۔ لمبی ترنگی سنہری بالوں والی سویڈش لڑکیوں سے وہ یکسر مختلف تھی۔ اس کا بونا سا قد اور کالے بال بالکل اطالوی لڑکیوں کی طرح تھے۔

”میں رقص کے فن سے ناواقف ہوں۔“ میں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

”بالکل مشکل نہیں۔“ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر شوخی سے کہا۔ ”دائرے میں شامل ہو کر یونہی ہاتھ پاؤں ہلاتے رہنا۔ تمام روایتی رقص اسی طرح کے ہوتے ہیں۔“

ہم نے ایک آرائشی تانے کے گرد رقص کرتے ہوئے لوگوں میں شامل ہونے کی کوشش کی تو یکدم پیچھے سے کسی نے ہم دونوں کو دھکیل دیا۔ اب ہم دائرے کے درمیان میں کھڑے تھے اور تمام لڑکے اور لڑکیاں چیخ چیخ کر ہمیں رقص کرنے کا کہہ رہے تھے۔ مگر بتانے گردن کو ہلکا سا خم دیا اور میری دیکھ کر مسکرا دی جیسے پوچھ رہی ہو کیا خیال ہے؟ میں نے سر ہلادیا، مجھ سے نہ ہوگا۔ اس نے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ دیے اور ہنس کر کہنے لگی ”بزدل۔“ میں نے اس کے ہاتھ پکڑ کر نیچے کر دیے اور پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ مگر بتا کھلکھلا کر ہنس دی اور دونوں ہتھیلیاں گولہوں پر جما کر روایتی دھن پر ایک تیز اور شوخ رقص شروع کر دیا۔ اس کے قدم نپے تلے تھے اور تال کے مطابق اٹھ رہے تھے۔ چند لوگوں نے موسیقی کے ساتھ ساتھ تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ میں ٹھوڑی تالے ہاتھ رکھے اس کی والہانہ ہنسی اور رقص کی بے ساختگی کے انداز دیکھتا رہا۔ موسیقی کی لے تیز ہوئی تو مگر بتانے بچوں کے بل تیزی سے گھومنا شروع کر دیا۔ وہ اتنی تیزی سے حرکت کر رہی تھی کہ اس کے چہرے کے نقش بھی دھندلے سے دکھائی دینے لگے۔ مگر اس حالت میں بھی اس کی سدا بہار مسکراہٹ کی لہریں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ اس کا سرخ لباس اس کے گرد ہوا میں ایک دائرے کی صورت میں گھوم رہا تھا جس کے درمیان مگر بتا کا سفید جسم ایک کنول کی مانند کھلا ہوا تھا۔ موسیقی ختم ہوئی تو دائرہ ٹوٹ گیا اور ہم کھانے کی میز پر آ گئے۔

”کچی مچھلی کے سینڈویچ کھاؤ اہل سویڈن کی مرغوب غذا ہے اور مجھے بھی بیکہ پسند ہیں۔“

”لیکن تمہیں تو تلی ہوئی مچھلی نہایت اچھی لگتی ہے۔“

”وہ صرف ایک ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینے والے مسافر سے پیچھا چھڑانے کے لیے کہا گیا تھا۔“

”اور جو مسافر ضرورت سے کم دلچسپی لے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے؟“

”اسے کچی مچھلی کھلائی جاتی ہے۔“ اس کے نیم وا ہونٹوں پر ایک بار پھر مسکراہٹ

کھیلنے لگی۔

موسیقی دوبارہ شروع ہوئی تو ایک بوڑھے سویڈش نے کمال خوش اخلاقی سے مگر بتا کو رقص کے لیے مدعو کیا اور وہ دونوں رقص کرتے ہوئے لوگوں کے دائرے میں شامل ہو گئے۔ میں نے یہ موقع غنیمت جانا اور واپس اپنے کونے میں آ کر برساتی پریٹ گیا۔ لوگوں کا شور اور موسیقی کی آواز مدھم ہوتی گئی اور میں سو گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ جھیل کی سطح اتنی روشن اور چمکدار تھی کہ اس طرف دیکھنا بھی دو بھر ہو رہا تھا۔ چند لوگ اب بھی رقص کر رہے تھے۔ باقی ادھر ادھر گھاس پر سو رہے تھے۔ میں کروٹ بدل کر اٹھنے لگا تو معلوم ہوا کہ مگر بتا میرے پہلو میں بیٹھی بڑے مزے سے سینڈویچ کھا رہی ہے۔ ”صبح ہوگئی ہے؟“ میں نے جمائی لے کر کہا۔

”صبح نہیں ہوئی ابھی صرف سورج نکلا ہے۔ تین ہی تو بجے ہیں۔“ اس نے سینڈویچ کا ایک حصہ مجھے تھما دیا۔ تمام شب رقص کرنے کے باوجود وہ تازہ اور شگفتہ نظر آ رہی تھی۔ میں نے جھیل پر جا کر خنک پانی سے ہاتھ منہ دھویا اور واپس آ گیا۔

”باقی لوگ کہاں ہیں؟“

”ریاض اور آرڈرے نصف شب کے فوراً بعد واپس شاگ ہوم چلے گئے تھے۔“

فاروق تین لڑکیوں کے ساتھ جنگل کی طرف گیا تھا۔ واپس نہیں لوٹا، البتہ مشتاق یہیں پر ہے اور ایک بوڑھے کے ساتھ اس جھیل پر مچھلی کے شکار کا پروگرام بنا رہا ہے۔“

”تم بھی ریاض اور آرڈرے کے ساتھ چلی جاتیں۔“

”میں چلی جاتی تو یہاں سوئے ہوئے مسافروں کی دیکھ بھال کون کرتا؟“ اس کی

مسکراہٹ میں شرارت کی پھلجھڑیاں تھیں۔

آخر میں موسیقی نے ایک لوک نغمے کی دھن چھیڑ دی۔ سب لوگوں نے گانا شروع کر دیا۔ ”ویم کان سیگافراوٹن وینڈ“

”اس کا مطلب تو سمجھ نہیں آتا۔“ میں نے ماگرتا سے کہا جواب میرے ساتھ برساتی پر بیٹھی خاموشی سے نغمے کے بول سن رہی تھی۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ دیا اور کہنے لگی ”اس کا مطلب ہے.....“

”کون ہے جو ہوا کی غیر موجودگی میں کشتی رانی کر سکتا ہے؟“

کون ہے جو چپوؤں کے بغیر نیا کھے سکتا ہے؟

اور..... کون ہے جو اپنے محبوب سے آنسو بہائے بغیر جدا ہو سکتا ہے؟“

وہ تھوڑی دیر کے لیے رُک کر نغمے کے بول سنتی اور پھر ایک ایک لفظ کا ترجمہ کرتی جاتی۔

”میں ہوا کے بغیر کشتی رانی کر سکتی ہوں۔“

میں چپو کے بغیر نیا کھے سکتی ہوں۔

لیکن..... اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے ہنس کر کہا

میں اپنے محبوب سے اشک بار ہوئے بغیر جدا نہیں ہو سکتی۔“

نصف گرمیوں کی شب کے خواب کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

چند سال پیشتر جب میں پہلی مرتبہ سویڈن آیا تو شاگ ہوم سے چند میل ادھر مجھے ایک سویڈش جوڑے نے لفٹ دی۔ مرد کی ٹانگیں فاج گرنے سے ناکارہ ہو چکی تھیں اس لیے کار اس کی بیوی چلا رہی تھی۔ اس شام موسم بے حد خراب تھا، بارش کے ساتھ تیز ہوا بھی چل رہی تھی۔ ان دونوں نے مجھے اپنے گھر شب ب سری کی دعوت دی، لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اس رات کی مپنگ میں شدید بارش ہوئی اور میرا چھوٹا سا نیمہ پانی میں تیرنے لگا۔ میں اپنے سامان پر بیٹھا سردی سے

نخضر رہا تھا کہ ایک کار کی روشنیاں میرے خیمے پر پڑیں اور ساتھ ہی کسی نے میرا نام پکارا۔ یہ وہی میاں بیوی گستاخ اور بریگتا تھے۔ ”ہمیں گھر پہنچ کر احساس ہوا کہ اس طوفانی رات میں تمہیں یہاں چھوڑ کر ہم نے سخت حماقت کی ہے۔ تم ابھی ہمارے ساتھ گھر چلو۔“ وہ مجھے ساتھ لے آئے اور میں شاگ ہوم کے قیام کے دوران اُنہی کے ہاں ٹھہرا رہا۔ اُن کی بے لوث محبت اور پیار نے میرا دل موہ لیا۔ آج میں اُن دونوں کو اتنے عرصے کے بعد ملنے جا رہا تھا۔ سلاؤسن کے علاقے میں واقع فلیٹ پر میں نے گھنٹی بجائی اور تھوڑی دیر بعد میرے سامنے بریگتا کھڑی تھی۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہی والہانہ طور پر گلے لگا لیا اور پھر ماتھے کو چوما۔ ”تم نے ہمیں اپنے آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی؟ کہاں ٹھہرے ہو! کتنے روز ہو گئے؟ شادی ہو گئی؟“ اس نے وہیں کھڑے کھڑے لا تعداد سوال پوچھ ڈالے۔

”بریگتا دروازے پر کون ہے؟“ اندر سے آواز آئی۔

”مستنصر آیا ہے گستاخ پاکستان سے۔“

گستاخ اپنی بیساکھیوں کے سہارے چلتا ہوا باہر آ گیا۔ ”ہا ہا۔ میرا پاکستانی بیٹا آ گیا ہے۔“ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور اپنی ایک بیساکھی میز پر رکھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ میں اپنی آنکھیں جھپکنا نہیں چاہتا تھا مبادا آنسو پ سے بہہ نکلیں۔

”ٹوٹی۔ ٹوٹی۔“ گستاخ نے آواز دی۔ پانچ چھ سال کا ایک خوبصورت بچہ کمرے سے نکلا اور حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ ”مستنصر تمہیں یاد ہے ہمیں اولاد کی کتنی چاہت تھی۔ خدا نے پچھلی عمر میں ہمیں یہ چاند سا بیٹا دیا ہے۔“ میں نے شفقت سے ٹوٹی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”بھئی یہاں کیوں کھڑے ہیں سب لوگ۔ ڈرائنگ روم میں چلتے ہیں۔“ بریگتا میرا بازو پکڑ کر اندر لے گئی۔

”تم اب کم از کم ایک سال ہمارے پاس رہو گے۔“ گستاخ نے حکمانہ لہجہ اختیار کرنے کی ناکام کوشش کی۔ ”تم جہاں بھی ٹھہرے ہو فوراً اپنا سامان لے کر یہاں آ جاؤ، تمہارا پرانا کمرہ اتنے عرصے سے تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ بلکہ میں کار پر جا کر سامان لے آتا ہوں۔ میں اب کار بھی چلا لیتا ہوں۔ والوو کمپنی نے میرے لیے خاص طور پر ایک کار تیار کی ہے جسے چلانے کے لیے ٹانگوں کا استعمال نہیں کرنا پڑتا، صرف ہاتھوں سے کام لیا جاسکتا ہے۔“

میں نے نہیں بتایا کہ اب کی بار میں لنڈن سے نہیں بلکہ سیدھا پاکستان سے آ رہا ہوں اور ابھی مجھے اور بھی بہت سے ملک دیکھ کر سردیاں شروع ہونے سے قبل وطن لوٹ جانا ہے جہاں ان جیسے ہی شفیق ماں باپ میری واپسی کے منتظر ہیں۔

برگیتا نے شام کے کھانے پر میرے لیے خصوصی طور پر پلاؤ اور بھنا ہوا گوشت پکایا جس کی ترکیب اس نے عورتوں کے کسی رسالے میں پڑھی تھی۔ ”سوئڈن میں لوگ اب مشرقی کھانوں کی لذت سے آشنا ہو رہے ہیں۔ مرچیں، ادک، پودینہ اور گرم مصالحہ تقریباً ہر بڑے سٹور سے دستیاب ہے۔“ برگیتا نے میری پلیٹ پلاؤ سے لبا لب بھری۔

کھانے کے بعد میں نے انہیں وہ تحفے دیے جو میں خاص طور پر ان کے لیے پاکستان سے لایا تھا۔ گتاف کے لیے ملل کا کڑھائی دار کرتہ اور چاندی کے کف لنک، برگیتا کے لیے کشمیری شال اور سندھی ہار، دونوں میاں بیوی نے ایک مرتبہ پھر اٹھ کر میرے ماتھے کو چوما۔

”کم از کم آج رات تم ہمارے ہاں ٹھہرو گے۔“ گتاف نے کرتہ اپنی قمیض کے اوپر ہی پہن لیا تھا۔

”اور کل ہم چند روز کے لیے اپنے سمر ہاؤس جا رہے ہیں۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔“ برگیتا نے خالص مشرقی انداز میں چادر اپنے سر پر اوڑھتے ہوئے کہا۔

گتاف کا خوب صورت سمر ہاؤس شاک ہوم سے پچاس میل کے فاصلے پر ایک گھنے جنگل میں تھا۔ لان میں بے تحاشا گھاس اُگی ہوئی تھی۔ میں نے گھاس کاٹنے والی زنگ آلود مشین کے کل پرزے کسے اور گھاس کاٹنے میں مصروف ہو گیا۔

”جوان بیٹے اسی طرح بوڑھے ماں باپ کی خدمت کرتے ہیں۔“ گتاف نے جو آرام کرسی پر بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا، پائپ کا ایک لمبا کش لگاتے ہوئے کہا۔ برگیتا اندر کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ شام کو ہم وہاں سے تھوڑی دور ایک قصبے میں گئے جہاں گتاف کے عمر رسیدہ والدین ایک آرام دہ گھر میں زندگی کے آخری ایام بڑے سکون سے گزار رہے تھے۔

سمر ہاؤس میں گزارے ہوئے شب و روز مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے اپنے گھر سے باہر کبھی قدم بھی نہیں رکھا۔ مجھے وہاں ماں باپ کی شفقت اور اپنے گھر کا سا آرام میسر تھا۔ جنگل کی دُھند آلود اور خوشگوار صبح مجھے اور برگیتا کو اپنے درمیان پاتی۔ ہم دوپہر

کے کھانے کے لیے کھمبیاں اکٹھی کرتے اور جنگلی پھول چن کر ان کے گلدستے تیار کرتے جو سمر ہاؤس کے کمروں کی زینت بنتے۔ پچھلے پہر میں اور گتاف جھیل کی طرف سیر کے لیے نکل جاتے جہاں اُس کی اپنی موٹر بوٹ لکڑی کے ایک تختے سے بندھی ہوتی۔ میں اسے سہارا دے کر موٹر بوٹ میں بٹھاتا اور انجن شارٹ کر دیتا۔ ہم جھیل کا ایک چکر لگا کر کشتی عین درمیان میں لے جا کر انجن بند کر دیتے۔ کشتی ساکن ہو جاتی تو ہم مچھلیاں پکڑنے کی ڈوری پانی میں ڈال دیتے۔ شام تک جتنی مچھلیاں پکڑتے وہ رات کو کھانے کی میز پر سج جاتیں۔

گتاف کی چھٹیاں ختم ہو گئیں اور ہم واپس شہر آ گئے۔ انہوں نے مجھے ہوٹل سے باہر اتار دیا۔ ریاض کے کمرے میں آرڈر کے علاوہ حامد اور فاروق بھی براجمان تھے۔

”تم کہاں غائب رہے اتنے روز؟ ہم آج پولیس کو اطلاع کرنے والے تھے۔“

ریاض مجھ پر برس پڑا۔ اس کی تشویش بجا تھی۔ مجھے سمر ہاؤس جانے سے قبل اُسے فون کر دینا چاہیے تھا۔ میں نے بھرپور معذرت کی اور بڑی مشکل سے منایا۔

”میں تو کہتا تھا کہ مستنصر جیسے لڑکے کا شاک ہوم میں ”محفوظ“ رہنا ناممکن ہے۔ ضرور کسی لڑکی وڈکی نے اغوا کر لیا ہے۔“ فاروق نے اپنا مخصوص قہقہہ لگاتے ہوئے میرے کندے پر دھپ رسید کی۔ ”بہر حال تم جلدی سے کپڑے بدل لو۔ شام کو کھانا کسی ریسٹوران میں کھائیں گے۔“

”بارنز“ شاک ہوم کا قدیم ترین اور سب سے مہنگا ریسٹوران ہے۔ ہم جوئے کے کمرے اور بار سے گزر کر ایک وسیع ہال میں آ گئے جہاں بے شمار لوگ سر جھکائے کھانے میں مصروف تھے۔ ہم نے موسیقاروں کے ایک طائفے کے نزدیک ایک میز کا انتخاب کیا اور کھانے کا آرڈر دے دیا۔ ”گراں قیمت ہونے کی وجہ سے یہاں صرف امیر بوڑھے اور غیر شادی شدہ بوڑھیاں ہی آتی ہیں۔“ فاروق نے ایک تجربہ کار شکاری کی مانند ”شکار گاہ“ کا جائزہ لیا۔

”ہاں بوڑھیاں۔“ حامد منہ کھول کر ہنسنے لگا۔ موسیقی شروع ہوئی تو وہ بھی نہایت ست اور دھیمی قسم کی تھی۔ فاروق نے اپنی ٹائی کی گرہ درست کی۔ حامد نے ایک گہرا سانس لیا اور دونوں

بڑے اعتماد سے کونے میں بیٹھی ہوئی لڑکیوں کی طرف چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ ان کے ساتھ محور قص تھے۔ میں آرڈرے کو سمر ہاؤس میں گزارے ہوئے شب و روز کے بارے میں بتانے لگا۔ موسیقی ختم ہوئی تو فاروق لڑکی کے ساتھ واپس آ گیا۔ حامد اکیلا تھا۔

”کیا ہوا میرے دوست؟“ میں نے اس کا لٹکا ہوا چہرہ دیکھ کر پوچھا۔

”میں نے لڑکی کو اپنی عمر پچیس سال بتائی تو کہنے لگی تم میرے لیے بہت ہی کم عمر ہو۔ پھر میں نے کہا کہ دراصل میں پینتیس سال کا ہوں تو وہ ناراض ہو کر چلی گئی کہ تم تو بالکل بوڑھے ہو۔“

”ویسے تمہاری عمر ہے کیا حامد؟“

”پینتالیس سال۔“ حامد نے کھسیانے ہو کر جواب دیا۔ ”ہم انڈیشن میں شکل سے

ہمیشہ کم عمر دکھائی دیتے ہیں۔“

فاروق کی ساتھی لڑکی بے حد باتیں کر رہی تھی۔ ”کتنا رومانی تخیل ہے۔“ وہ مجھ سے کہہ رہی تھی۔ ”افریقہ کے گھنے جنگلوں میں کافی کے باغ۔ آپ کو شیروں وغیرہ سے ڈر نہیں لگتا۔“

”کون سے شیروں سے؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ فاروق نے ایک زودار ٹھوکا میری کمر میں رسید کیا۔ میں پھر بھی بات کی نہ کو نہ پہنچ سکا۔

”وہی جورات کی تاریکی میں آپ کے مویشی اٹھالے جاتے ہیں۔“

”کون سے مویشی؟“ میں نے بوکھلا کر کہا۔

”تم سمجھتے کیوں نہیں۔“ فاروق نے جلدی سے اردو میں کہا ”میں نے اسے بتایا ہے کہ افریقہ میں ہم دونوں کا شکاری کرتے ہیں۔ لڑکیوں کو اپنی اصل شہریت بتانے سے ملک کی بدنامی ہوتی ہے۔“

”ہاں وہ شیر!“ میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور جم کاربٹ کے سارے کارنامے اپنے نام سے موسوم کر کے سنا دیے۔ فاروق اب بے حد خوش تھا اور حق تعالیٰ لگا رہا تھا۔ کھانے کے بعد کافی کا دور چلا۔ فاروق اور اس کی ساتھی لڑکی دوبارہ رقص کے لیے چلے گئے۔ وہ بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ شاید فاروق اسے ان خونخوار ہاتھیوں کے بارے میں بتا رہا تھا جو ہماری گنے گنی فصل کا ستیاناس کر جاتے تھے۔ ریاض اور آرڈرے کچھ دیر کے لیے اپنے کسی واقف کار جوڑے کی میز پر چلے گئے۔

”معاف کیجیے گا۔“ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک معمر ویٹر سر جھکائے سرگوشی کر رہا تھا۔ ”میز نمبر فلاں پر ایک محترمہ آپ کی رفاقت کی خواہش مند ہیں۔ آپ ان کے ساتھ رقص کرنا پسند کریں گے؟“ اس نے سر ہلائے بغیر دونوں آنکھیں گھما کر ہال کے نسبتاً تاریک حصے کی جانب اشارہ کیا۔ موم بتی کی مدھم روشنی میں ایک محترمہ ہاتھ میں جام لیے میری طرف دلنواز مسکراہٹوں کے انبار پھینک رہی تھیں۔ کم از کم پچاس کا سن ہوگا۔

”ان سے کہیے گھر بیٹھ کر اللہ اللہ کریں کیوں اپنی عاقبت کا ستیاناس کرتی ہیں۔“ ویٹر

خاموشی سے واپس چلا گیا۔

”بارنز رفاقت کی خواہش مند امیر عورتوں کا پسندیدہ ریستوران ہے۔“ حامد نے بتایا۔

کافی پینے کے بعد فاروق کی معیت میں جوئے کے کمرے کی زیارت کی گئی۔

”مقصود جو اکیلے نہیں۔“ فاروق نے سرخ تھپیپے رولٹ کی میز پر جماتے ہوئے

کہا، ”بلکہ ایک خوبصورت شام کے احساسات میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ رقص و طعام کے ساتھ جو ابھی انہی احساسات میں شامل ہے۔“

چنانچہ احساسات میں ہم آہنگی پیدا کی گئی اور نتیجے میں فاروق کو گھر جانے کے لیے

ٹیکسی کا کرایہ حامد سے اُدھار لینا پڑا۔

دوسری صبح میں غسل خانے میں شیو بنارہا تھا کہ باہر دستک ہوئی۔ میں نے تو لیے سے

صاحبن کا جھاگ پونچھا اور کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

”صبح بخیر۔“ باہر ماگریتا کھڑی ہنس رہی تھی۔ ”آج میری کوئی پرواز نہ تھی میں نے

سوچا آرڈرے سے ہی مل آؤں۔“

”اگر تم آرڈرے سے ہی ملنے آئی ہو تو وہ ساتھ والے کمرے میں رہتی ہے۔“ میں

نے مذاق سے کہا ”نی الحال میرے بارے میں کیا خیال ہے؟“ ہم کمرے میں آ گئے۔

”بہت ہی اچھا خیال ہے۔“ اس نے شوشی سے کہا اور صوفے پر بیٹھ کر سر پر بندھا

سرخ رومال اتار کر اپنے سیاہ بال ٹھیک کرنے لگی۔ ”ویسے بھی میں روزانہ آرڈرے کو فون

کر کے تمہارے بارے میں دریافت کرتی تھی مگر تم جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔“

میں نے اسے گستاخ کے سمر باؤس کے بارے میں بتایا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم اب تک صرف شاک ہوم کے نواح میں گھومتے رہے ہو، شہر بالکل نہیں دیکھ پائے۔“

”اور آج.....“ میں نے اپنا کٹ پہنتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری کوئی پرواز نہیں اور تم آسمانی مسافروں کی بجائے ایک پاکستانی مسافر کو شہر کی سیر کراؤ گی۔“

”بالکل درست۔“ وہ فوراً صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”اور آج..... موسم بھی خوش گوار ہے۔“

سوئڈن میں پاگل پن، جنس اور الکوحل کے ساتھ موسم بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ موسم سرما میں بخ بستہ ہواؤں اور بریفے طوفانوں کا ایک لائق تباہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اگر اتفاق سے سورج نکل آئے تو روشنی صرف دو گھنٹے رہتی ہے۔ لوگ ایک نیم تاریک برفانی ماحول میں بے جان لاشوں کی طرح گھسٹتے پھرتے ہیں۔ فرانسیسی فلاسفر ڈیس کارٹیس سوئڈن میں ہی رائل لائبریری کے خنک کمروں میں سردی کی تاب نہ لاتے ہوئے مر گیا تھا۔ ایک سوئڈش کے لیے خوش گوار موسم کا مطلب چمکتی دھوپ اور نیلا آسمان ہے جو سال میں دس ماہ اُس کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔

ہم ہوٹل کے سامنے والے پارک کو عبور کر کے زمین دوز ریلوے اسٹیشن پر آئے اور شہر کے قلب میں واقع سینٹرل اسٹیشن کے ٹکٹ خرید لیے۔ ریلوے کے ڈبے میں مسافروں کے درمیان دو بوڑھے فرش پر بے سدھ پڑے تھے۔ ”سوئڈن کے لاکھوں عادی شراپیوں میں سے دو“ ماگرتا کے چہرے پر ایک ناخوشگوار تاثر تھا۔ سینٹرل آیا تو ہم دونوں اتر گئے۔ میں دروازے کے ساتھ شال پر سگریٹ خرید کر پیچھے مڑا تو ایک ایشیائی لڑکا ماگرتا سے باتیں کرنے میں مصروف تھا۔

”مستنصر یہ بیچارہ راستہ بھول گیا ہے۔“ ماگرتا کے لہجے میں تاسف تھا۔

درمیانے قد کا ایک خوش شکل لڑکا ہاتھ میں شاک ہوم کا نقشہ لیے بڑی معصومیت سے دروازے کے ساتھ کھڑا تھا۔

”آپ راستہ بھول گئے ہیں تو ہم آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔“ میں نے آگے بڑھ کر انگریزی میں کہا

”راستہ وغیرہ نہیں بھولا جی!“ اس نے اردو میں جواب دیا۔ اس کے چہرے کی معصومیت غائب ہو چکی تھی۔ ”یہ تو لونڈیاں پھانسنے کے چکر ہیں۔“

”جی.....!“

”جی ہاں۔ میں ویسے تو لنڈن میں نوکری کرتا ہوں مگر گرمیوں کی چھٹیاں میں شاک ہوم آ جاتا ہوں۔ بڑی مٹا ہے یہاں پر ایشیائی لڑکوں کی.....“ اس نے لچوں کی طرح مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ ”شہر کا نقشہ ہاتھ میں لے کر کسی بھی اسٹیشن کے باہر کھڑا ہو جاتا ہوں اور پھر ہر حسین لڑکی سے راستہ پوچھتا ہوں۔ دس میں سے چھ فون نمبر دے جاتی ہیں۔ کم از کم تین ملنے کے لیے بھی آ جاتی ہیں اور ایک..... بڑی بد معاش قوم ہے جی۔“ اس کے زوردار قہقہے نے چند راگبیروں کو ہماری طرف متوجہ کر لیا۔ میں نے ماگرتا کا ہاتھ پکڑا اور جلدی سے اسٹیشن کے باہر آ گیا۔

”کم از کم اس بے چارے کو راستہ ہی بتا آتے۔“ ماگرتا نے کہا۔

”وہ بے چارہ تمام راستے بخوبی جانتا ہے۔“

اسٹیشن کے سامنے والی سڑک پار کر کے ہم سینٹرل پل پر آ گئے۔ پل کے پہلو میں سے شاک ہوم کے ٹاؤن ہال کو میٹریاں اترتی تھیں۔ او مسٹرگ کی تعمیر کردہ ٹاؤن ہال کی یہ عمارت وینس کے سینٹ مارک کلیسا سے بے حد مشابہت رکھتی ہے۔ شاک ہوم کا شہر بھی وینس کی طرح چند بڑے جزیروں کا مجموعہ ہے جنہیں اطالوی طرز کے پل ایک دوسرے سے ملاتے ہیں۔ ٹاؤن ہال دیکھنے کے بعد ہم شہر کی مشہور سڑک کنگز گارٹن پر گھومتے رہے۔ کانرٹ ہال، کبزا پل، پب کا ڈیپارٹمنٹل سٹور جہاں گریٹا گار بوا ایک معمولی سیلر گرلز کی حیثیت سے عورتوں کے ہیٹ فروخت کیا کرتی تھی۔ کنگز گارٹن کے بعد ہم شہر سے باہر شہزادہ یوجین کا محل دیکھنے گئے۔ شہزادہ یوجین کا محل گھنے درختوں اور سرسبز پہاڑوں کے درمیان واقع ہے۔ یہاں سے سمندر کی ایک شاخ نہر کی صورت میں شاک ہوم کے شہر میں داخل ہوتی ہے۔ شہزادے کا محل 1948ء میں پبلک کے لیے وقف کر دیا گیا تھا۔ پھولوں کے تختوں اور بلند درختوں کے درمیان چلتے ہوئے ہم سمندر کے کنارے آ گئے۔ جہاں بے شمار لوگ بیٹھوں پر بیٹھے دھوپ اور تازہ سمندری ہوا سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ہم ساحل کے ساتھ پانی میں ابھری ہوئی ایک چٹان پر بیٹھ گئے۔

”نہر کے پاس سنانے والی پہاڑی پر میرا فلیٹ ہے۔“ ماگ ریتا نے جدید عمارتوں کے ایک مجموعے کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔ وہ اپنے سفید لباس میں بالکل کوپن ہیگن کی ننھی جل پری لگ رہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ننھی جل پری بندرگاہ کی طرف نظریں جمائے شہزادے کے انتظار میں سوگوار بیٹھی تھی اور ماگ ریتا نے کبھی سوگوار ہونا سیکھا ہی نہ تھا۔ ہم شام ڈھلے شہر کے لیے واپس روانہ ہوئے۔ بس کی بجائے ہم سکانسن پارک کے گھاٹ سے ایک سینئر پری بیٹھ گئے جو شہر کے دوسرے حصے سلاؤسن تک جا رہا تھا۔ سمندر کی غم آلود ہوا میں خنکی تھی۔ میں نے اپنا کوٹ اتار کر ماگ ریتا کے کندھوں پر ڈال دیا۔ سینئر سکانسن کے تفریحی پارک سے لوٹتے ہوئے جوان لڑکے اور لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا جو باقی مسافروں کی موجودگی سے بے نیاز آزادانہ ”چہلیں“ کر رہے تھے۔ ایک سرخ بالوں والی لڑکی گیگ دے پر تیزی سے چلتی ہوئی آئی اور ایک دم میرے قریب آ کر بالوں کی لٹ پکڑ کر کچھ سے قہقہے کے ساتھ کاٹ ڈالی۔ ”سوویئر“ وہ ناک سیکڑ کر مسکرا دی اور لٹ ہینڈ بیگ میں رکھ کر اگلے قدموں اسی تیزی سے چلی گئی۔

”حجام کی بچی“ میں نے بوکھلا کر کہا۔

ماگ ریتا نے ہنسنا شروع کر دیا۔ ”تمہیں ناراض نہیں ہونا چاہئے۔ ہمارے ہاں کالے بال، کالی آنکھیں اور گندمی رنگ بے حد پرکشش سمجھے جاتے ہیں۔ سرخ، سنہری اور بھورے بال اور آنکھیں دیکھ دیکھ کر ہم اکتا چکے ہیں۔ سویڈن کے بچے بھی کالے رنگ کی گڑیاں پسند کرتے ہیں۔ اس لڑکی کو شاید تم ایک حسین گڈے کی صورت میں نظر آئے تھے۔“

میرا چہرہ سرخ ہو گیا۔

سینئر سے اتر کر ہم نے سلاؤسن کا پل پار کیا اور ”پارلیمنٹ کے جزیرے“ پر آ گئے جہاں شہر کی قدیم عمارتیں مثلاً رائل پیلس، ہاؤس آف نو بلز اور مرکزی کلبسا واقع ہیں۔ یہ شاک ہوم کا پرانا حصہ ہے جہاں اب بھی پتھر کی ٹنگ گلیاں اور بوسیدہ مکان ہیں۔ قدیم اور دیدہ زیب پل مختلف حصوں کو آپس میں ملاتے ہیں۔ ہم نے ایک پل کے نیچے جھانکا تو پانی میں ہمارا عکس نظر آ رہا تھا۔

”میں کل صبح ایک پرواز پر روم جا رہی ہوں۔ ایک ہفتے کے بعد واپسی ہوگی۔ آج سے سات روز بعد اگر تم اسی شہر میں ہوئے تو کنگز کلپان کی آٹھویں منزل پر فلیٹ نمبر بائیس میں ایک

لڑکی رات کے کھانے پر تمہارا انتظار کرے گی۔“ ماگ ریتا نے اپنے عکس سے مخاطب ہو کر کہا۔

”اگر میں سات روز بعد اسی شہر میں ہوا تو اس لڑکی کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔“

میں نے اپنے عکس پر نظریں جمائے ہوئے جواب دیا۔

”روم پہنچتے ہی میں ”تریوی فوارے“ پر جاؤں گی اور اس کے پانی میں سکے ڈال کر دعا کروں گی کہ.....“

”نہ نہ نہ یہ غضب نہ کرنا، وہاں تو پہلے سے ہی ڈھیروں سکے پڑے ہوں گے۔“ مجھے وینس کی ریکا یاد آ گئی۔ میں نے ماگ ریتا کو سینئر ایلن ٹینشن پر چھوڑا اور خود مین دوز ریلوے پر سوار ہو کر واپس ہو چلا آ گیا۔

ایک ہفتہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ میرا زیادہ تر وقت گسٹاف اور ریگیتا کے ہاں گزرا۔ ان کا بیٹا ٹونی اب مجھ سے مانوس ہو چلا تھا۔ ریاض اور آرڈرے مجھے اپنے دوستوں سے ملاتے اور پارٹیوں پر لے جاتے۔ فاروق اور حامد سے جب بھی ملاقات ہوتی وہ مجھے ”ریستوران بارنز“ چلنے کا مشورہ دیتے۔ مشتاق کے کمرے میں مشرقی موسیقی کے ریکارڈ سنتے ہوئے شیشے کے مرتبانوں میں تیرتی رنگ برنگی پالتو مچھلیاں بالکل غل نہ ہوتیں۔

بالا خر شاک ہوم میں میرے قیام کا آخری دن آ پہنچا۔ اس روز ماگ ریتا کو روم گئے ہوئے ایک ہفتہ بیت چکا تھا۔ سر شام میں بس پر سوار ہو کر کنگز کلپان پہنچ گیا۔ ایک خوشنما پہاڑی پر گھنے درختوں کے درمیان جدید عمارتوں کا ایک جھنڈ جو ایک ہفتہ قبل مجھے شہزادہ یوچین کے محل سے نظر آیا تھا۔ میں خود کار لفٹ سے آٹھویں منزل پر پہنچا تو ماگ ریتا فلیٹ سے باہر برآمدے میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ آج اس کی مسکراہٹ میں حزن کا پہلو نمایاں تھا۔

”میں دوپہر سے بالکونی پر کھڑی تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے تمہیں نیچے فٹ پاتھ پر آتے دیکھ کر ہاتھ بھی ہلایا تھا مگر تم نے میری جانب دیکھا ہی نہیں۔“ وہ سیاہ رنگ کے ایک دیدہ زیب لباس میں ملبوس تھی جس کا گلا گول شیشوں کے بلوچی کام سے مزین تھا۔

”تم اس لباس میں ایک بلوچی خانہ بدوش لڑکی لگتی ہو۔“

”تمہیں پسند ہے نا؟“ اس نے چل کر کہا۔ ”میں نے آج ہی یہ فاروق کی دکان سے

ماگرتا کی ننھی منی بل کار کارل ستاد جاتی ہوئی شاہراہ پر بالکل بچوں کا کھلونا لگ رہی تھی۔

”ہم شاک ہوم سے پچاس میل دور تو آ گئے ہیں۔ اب تم واپس چلی جاؤ۔“
 ”بس تھوڑی دور اور.....“ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ کارل ستاد آیا تو میں زبردستی اتر گیا۔

”اگر میں نے آج پرواز پر نہ جانا ہوتا تو میں ناروے کی سرحد تک تمہارے ساتھ جاتی۔“ اس نے کار کی چابی سے کھیلتے ہوئے کہا۔ ”یاد ہے جب ہم ڈسٹرناٹ کے جشن پر گئے تھے تو آرڈرے نے کہا تھا ”ماگرتا تم مستنصر کے ساتھ اپنے ہوائی مسافروں ایسا سلوک کر رہی ہو“ میں نے تو اسی شام اپنے آپ کو بدل لیا لیکن تم تو مسافر ہی رہے نا؟“
 ماگرتا کی کار شاک ہوم شاہراہ پر کچھ دیر نظر آتی رہی اور پھر کاروں اور دیوبیل ٹرکوں کے جھوم میں کھو گئی۔

”میں ہوا کے بغیر کشتی رانی کر سکتی ہوں

میں چپو کے بغیر نیا کھے سکتی ہوں

لیکن.....

میں اپنے محبوب سے اشک بار ہوئے بغیر جدا نہیں ہو سکتی۔“

خریدا ہے۔ خالص پاکستانی ہاں!“

ماگرتا کا مختصر فلیٹ نفاست پسندی اور جمالیاتی حسن کا حسین مرقع تھا۔ ہم بالکونی پر چلے گئے۔ شاک ہوم کی درجنوں نہریں خوبصورت جزیرے اور بلند عمارتیں بے ترتیبی سے ہمارے قدموں تلے پھیلی ہوئی تھیں۔ پورے شہر پر ایک سرمئی سا اندھیرا اچھایا ہوا تھا جس میں لاتعداد برقی روشنیاں جذب ہو رہی تھیں۔ ماگرتا نے میری آمد سے قبل ہی بالکونی پر کھانے کی میز سجادی تھی۔ میز پر دماسک کا میز پوش بچھا ہوا تھا جس کے عین وسط میں سرخ پھول ایک سفید گلدان میں بڑی نفاست سے سجائے گئے تھے۔ گلدان کے دونوں طرف بلور کا ایک ایک شمع دان رکھا تھا جن میں درجنوں موم بتیاں روشن تھیں۔ نیچے سمندر سے ایک سیلی خوشبو کے ساتھ ہوا پہلو بدلتی ہوئی آتی، شمعوں کی لو تھر تھراتی اور ان کا پرتو ماگرتا کے بلوچی لباس کے گول شیشوں میں منعکس ہو کر جھل جھل کرنے لگتا۔ ہم دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کو تنک رہے تھے۔ تیز ہوا کے ایک جھونکے نے چند شمعیں گل کر دیں۔ میں نے اسے اپنی رواں گی کے بارے میں بتایا۔

”میں نے بچپن میں واشنگٹن اردنگ کی ”الحمر اکہانیاں“ پڑھی تھیں۔ غرناطہ جا کر مجھے خط لکھنا کہ وہاں کونسا ایسا فسوس ہے جو لوگوں کو سب کچھ چھوڑ کر وہاں جانے پر مجبور کر دیتا ہے۔“ میں نے ماگرتا کی طرف دیکھا اس کا گول چہرہ، گول بلوچی شیشے اور درجنوں شمعوں کے شعلے آپس میں مدغم ہو کر رہ گئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ستارے تھے یا شمعیں جھللا رہی تھیں۔ میں فیصلہ نہ کر پایا۔

”میں تمہیں الحمر اکہانیاں کے ایوانوں میں بیٹھ کر خط لکھوں گا۔ تم یہاں اس بالکونی پر بیٹھی بہتے پانی کی مدھم آواز اور فواروں کی سریلی کن من من لوگی۔“

ماگرتا مجھے ہوشل تک چھوڑنے آئی۔ سنجیدگی نے اس کے چہرے کا تاثر یکسر بدل دیا تھا اور وہ ایک مختلف انسان نظر آرہی تھی۔ مسکراہٹ کے بغیر ماگرتا نامکمل تھی۔

”اگر تم پسند کرو تو میں کل صبح تمہیں شاک ہوم سے چند میل دور ناروے جانے والی شاہراہ پر چھوڑ آؤں گی۔“

”تمہیں خدشہ ہے کہ میں کہیں پھر واپس نہ آ جاؤں؟“

اس نے میری بات کا جواب دیے بغیر کار سٹارٹ کی اور شہر جانے والی سڑک پر مڑ گئی۔

دوستوں سے ملنے چلے جاتے۔ رات گئے جب واپس لوٹے تو دریائے گوٹا اور اس میں سے نکلنے والی نہروں کے کنارے جنگلی گھاس اور خود رو بیلین دھند سے اٹی ہوئیں۔ کناروں سے چند گز کے فاصلے پر گھٹا جنگل سویڈن کی نیلی شفق میں نہایا ہوتا۔ سپیڈ بوٹ نہروں کے کمان نما پلوں کے نیچے سے گزرتی تو پل بھر کے لیے مکمل تاریکی چھا جاتی۔ دریا کی پرسکون سطح کو چیرتی ہوئی سپیڈ بوٹ آگے بڑھتی تو بخ پانی کی پھوار ہمارے کپڑے بھگو جاتی اور لہریں کناروں پر اُگے ہوئے سرکندوں میں تلاطم برپا کر دیتیں۔ گھر قریب آتا تو خاموشی اور دھند میں بھی اضافہ ہو جاتا۔ دھند ایک اُجلے بادل کی طرح دریا کی سطح پر بچھی ہوئی۔ میری آمد سے چار روز بعد راڈنی مجھے اپنی کار پر ہیلسو رجانے والی شاہراہ پر چھوڑ آیا۔

پھولوں کے دیس میں

ناروے کا صدر مقام اوسلو شمالی یورپ میں میرے سفر کی انتہا تھی۔ یہاں سے مجھے ایک مرتبہ پھر سویڈن ڈنمارک اور جرمنی کے راستے ہالینڈ جانا تھا۔ چند روز کے قیام کے بعد ایک چمکتی ہوئی صبح کو جب اوسلو کے شاہی محل کے باہر محافظ دستوں کی ڈیوٹی تبدیل ہو رہی تھی، میں سویڈن کے دوسرے بڑے شہر یوٹے برگ کے لیے روانہ ہوا۔ اس روز شاید اکثر کاروں والے میری ہی تلاش میں سفر کر رہے تھے۔ چنانچہ پچھلے پہر تک یوٹے برگ پہنچ گیا۔ جس علاقے سے گزر ہوا وہاں ان دنوں سٹرا میری پھل کا موسم تھا۔ ہر دس بیس میل کے فاصلے پر دھقان لڑکیاں روایتی لباسوں میں ملبوس سٹرا میری کے سرخ بیروں کی ٹوکریاں لیے سڑک کے کنارے کھڑی تھیں۔ کار کھڑی کیجیے اور وہ دو کروڑ کے عوض آپ کو سٹرا میری کی ایک ٹوکری دے دیں گی۔ جب بھی مجھے کوئی نئی لفٹ ملتی تو ڈرائیور میرے لیے ایک ٹوکری خرید لیتا۔ ”تم نے شاید اس سے پہلے سٹرا میری کا پھل نہیں کھایا۔ سویڈن کی خاص چیز ہے۔“ اگرچہ پچھلے تمام ڈرائیور مجھے کئی ٹوکریاں کھلا چکے تھے مگر میں ان کا دل رکھنے کی خاطر پھل کھانے لگتا۔ یوٹے برگ پہنچنے تک سویڈش مہمان نوازی میرے دانت کھٹے کر چکی تھی۔

یوٹے برگ کے نواحی قصبے کنگ لاو سے باہر دریائے گوٹا کے کنارے ایک جنگل میں میرے سویڈش دوست راڈنی کا مکان تھا۔ راڈنی سے میری واقفیت لاہور میں ہوئی جہاں وہ سویڈش بچوں کے ایک سکول میں پڑھایا کرتا تھا۔ ہر شام راڈنی دریا کے کنارے سرکندوں سے بندھی ہوئی اپنی سپیڈ بوٹ کھولتا اور ہم دونوں قصبے کی چھوٹی چھوٹی نہروں کے راستے اس کے

ہیلسو (ڈنمارک) کی کیمپنگ سمندر کے کنارے کروں برگ قلعے کے پہلو میں واقع تھی۔ میں اپنا خیمہ نصب کر کے اس قدیم شہر کی سیر کو نکل گیا۔ رات واپس آیا تو ساحل کے ساتھ کروں برگ قلعہ کی کائی زدہ دیواریں تاجے کی چھت، گنبد اور مینار آسب زدہ لگ رہے تھے۔ قلعے کی پوری عمارت دھند میں لپٹی ہوئی تھی۔ کسی زمانے میں یہاں ایک خونی ڈرامہ کھیلا گیا تھا۔ سلطنت کے لیے ایک قتل ہوا اور پھر مقتول بادشاہ کی روح سرشام اسی قلعہ کی دیوار پر نمودار ہوتی اور اپنے بیٹے ہیملٹ کو انتقام پر ابھارتی۔ ہیملٹ جو ڈنمارک کا شہزادہ تھا اور جسے شیکسپیر نے لازوال کر دیا۔ بہر حال یہ سارا واقعہ ایک ادبی اختراع ہے۔ اصلی ہیملٹ شاید ہیلسو کے نام سے بھی ناواقف تھا۔ جب فریڈرک دوم نے کروں برگ قلعہ تعمیر کرایا، ہیملٹ اس سے سات سو برس پیشتر مورس کے جزیرے میں دفن ہو چکا تھا۔ اس کا نام آملتھ تھا۔ ایک قبائلی سردار کا اکلوتا بیٹا۔ سرداری کے لالچ میں آملتھ کے چچا نے اس کے باپ کو قتل کر ڈالا۔ اس گھناؤنے جرم میں اس کی ماں بھی شامل تھی۔ انیس سالہ آملتھ سارا دن قلعہ کے آتش دان کی ٹھنڈی راکھ کو کریدتا رہتا اور ہر سوال کا جواب ایسے دیتا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔ ایک شب اس نے اپنے چچا کے محافظ کو شراب پلا کر مدہوش کر دیا اور چچا کو قتل کر کے سردار بن بیٹھا۔ 1200ء میں سالکروگاما ٹیکس نامی ایک ڈینش نے اس واقعے کو کہانی کو روپ دیا۔ 1601ء میں لنڈن کے گلوب پلیئر ز کروں برگ قلعہ میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے آئے۔ ان میں ایک گمنام ایکٹر شیکسپیر نام کا تھا۔ شیکسپیر نے

اس ڈینش کہانی کو ڈرامے کی صورت میں لکھا مگر جائے واقعہ مورس کے جزیرے سے ہیلسور کے کروں برگ قلعہ میں تبدیل کر دی۔ حقائق سے قطع نظر رومان پسندی اب بھی قلعہ کی دیواروں پر ہیملٹ کے باپ کی روح دکھ لیتی ہے.... بلکہ شہر والوں نے سیاحوں کی تسلی کے لیے یہاں ہیملٹ کی قبر بھی بنوا رکھی تھی۔

ہیلسور کے بعد ڈنمارک کے چھوٹے قصبوں اور ساحلی دیہاتوں سے ہوتا ہوا میں کوپن ہیگن پہنچ گیا۔ اگرچہ ”نچ ہانگنگ“ بے حد دلچسپ ذریعہ سفر ثابت ہوا تھا مگر اب میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ تین ماہ کے قلیل عرصے میں مجھے ہالینڈ، انگلینڈ اور فرانس کی سیاحت کے بعد پورا ہسپانیہ بھی دیکھنا تھا۔ لہذا میں نے ریل اور بس کا ”شریفانہ“ سفر اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ بذریعہ ریل کوپن ہیگن سے ہیبرگ (جرمنی) جاتے ہوئے وارڈن برگ کا طویل ترین ریلوے پل دیکھا۔ ہیبرگ سے سیدھا فرینکفرٹ آ گیا جہاں اب پھر بارش ہو رہی تھی۔

جی ہاں فرینکفرٹ میں اب پھر بارش ہو رہی تھی۔ بہر حال مجھے اس سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا کیونکہ میں اب اس شہر کی گیلی اور کھراؤد عمارتیں دیکھے بغیر ہالینڈ جا رہا تھا جہاں ویرن کے قصبے میں میرا ایک پاکستانی دوست میری آمد کا منتظر تھا۔ حنیف لاہور میں سائیکلس بنانے والے ایک کارخانے میں انجینئر تھا اور ان دنوں ہالینڈ میں سائیکلوں کی صنعت کا جائزہ لینے کے لیے آیا ہوا تھا۔ اہل ہالینڈ سائیکلوں کے اتنے شیدائی ہیں کہ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سائیکل پر ہی پیدا ہوتے ہیں۔ میں نے نقشے پر ویرن کا تعین کیا۔ پہلے آرٹھم جانا ہوگا۔ بارہ بجے ہماری گاڑی فرینکفرٹ کے گندے اور پرہجوم سٹیشن سے نکلی۔ تھوڑی دور بعد جرمنی کا مشہور دریائے رائن ساتھ ہو لیا۔ دریا کے چوڑے پاٹ میں بادبانی کشتیاں، سامان بردار کشتیاں اور جہاز ہر سو بکھرے پڑے تھے۔ دوسرے کنارے پر سرسبز پہاڑیوں کے دامن میں ننھے ننھے گاؤں تھے۔ چوٹیوں پر خوبصورت پریوں کے قلعے ایک لمحہ کے لیے گاڑی کی کھڑکی سے نظر آتے اور پھر طلسماتی طور پر غائب ہو جاتے۔ جرمنی کے صدر مقام بون سے گزر کر ہم کولون پہنچے جہاں رائن کے کنارے گوٹھک طرز تعمیر کا کلیسا یورپ بھر میں بے مثال ہے۔ کولون سے ہالینڈ جانے والی گاڑی میں سوار ہو کر میں شام کے ساڑھے سات بجے آرٹھم پہنچ گیا اور وہاں سے ایک مقامی گاڑی کے ذریعے

ویرن تک آ گیا۔

ویرن ایک بہت ہی معمولی قسم کا قصبہ تھا جو بمشکل ایک درجن دکانوں اور چند سو رہائشی مکانوں پر مشتمل ہوگا۔ میں نے پھولوں کی ایک دکان سے حنیف کا پیچہ دریافت کیا اور قصبے کی اکلوتی سڑک کے پیچوں بیچ چلنا شروع کر دیا۔ سڑک بالکل خالی پڑی تھی۔ چند بچے سڑک کے درمیان چاک سے کھینچی ہوئی لکیروں پر ”کیڑی کاڑا“، قسم کا کوئی کھیل کھیل رہے تھے۔ کبھی کبھار کوئی سائیکل سوار بھی آ نکلتا۔ ہالینڈ کے لوگ انگریزوں کی مانند اپنے گھر کو قلعہ بنا کر نہیں رکھتے بلکہ سرے سے چار دیواری بنانے کا رواج ہی نہیں۔ سرشام لوگ آرام کرسیاں باغیچے میں ڈال کر پڑوسیوں کے ساتھ خوش گپیاں کرتے ہیں اور سڑک پر کھیلنے ہوئے بچوں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ باغیچوں میں گڑیوں اور پرن چکیوں کے ماڈل بچے ہوتے ہیں۔ میں ان باغیچوں کے سامنے سے گزرتا تو اکثر لوگ مسکرا کر ہاتھ ہلاتے۔ وہ مجھے اور میرے پیچھے گھسٹتے ہوئے سوٹ کیس کو نہایت دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ چند بچے میرے ساتھ ساتھ چلنے لگے اور ان میں سے ایک نے راہبر کے فرائض انجام دیئے شروع کر دیئے۔ قصبے کی آخری حد سے چند سو گزرے ریلوے لائن کے ساتھ ایک پرانی طرز کا فارم نما گھر تھا جس کے باغیچے میں حنیف آرام کرسی پر دراز کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے اپنی ہینڈل بار نما موٹھوں کو ایک بل دیا اور کرسی سے اٹھ کر بڑی بے دلی سے ہاتھ ملایا۔ یوں لگتا تھا جیسے میری آمد سے وہ قطعاً خوش نہیں ہوا۔

”تمہیں ان فتنوں نے تنگ تو نہیں کیا؟“ اس نے اکتاہٹ سے بھرپور لہجے میں میرے گرد کھڑے ہوئے بچوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا اور پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر کہنے لگا۔ ”میں نے تو ان کے روزمرہ کے تعاقب سے بچنے کے لیے شام کو گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا ہے۔ جہاں جاتا ہوں پیچھے ہو جاتے ہیں اور تالیاں بجاتے ہیں۔ ان کے لیے ایک پاکستانی عجبے کی حیثیت رکھتا ہے۔“ اس نے میرا سوٹ کیس اٹھایا اور مکان کے اندر ڈرائنگ روم میں لے گیا جہاں ایک ڈچ مرد اور عورت آرام دہ صوفوں میں دھنسے ٹیلی ویژن دیکھ رہے تھے۔

”مسٹر اور مسز کپ جن کی فیکٹری میں میں تربیت حاصل کر رہا ہوں۔“ حنیف نے تعارف کروایا۔

”تم ضرور مستنصر ہو گے۔“ کپ کے وجہہ چہرے پر ایک مشفقانہ مسکراہٹ کھیل گئی۔ ”حنیف بڑی شدت سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔“

”واقعی!“ میں نے حنیف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو ایک کونے میں میری موجودگی سے بے خبر اپنی بڑھی ہوئی داڑھی کھانے میں مشغول تھا۔

حنیف کی شخصیت صرف ہالینڈ میں ہی نہیں بلکہ لاہور میں بھی ایک عجوبے سے کم نہ تھی۔ گرمیوں کی تپتی دوپہروں میں کار کی موجودگی میں بھی سائیکل پر فیکٹری جاتا۔ کسی بڑی دعوت پر مدعو ہوتا تو اپنے درجنوں سوٹ چھوڑ کر کسی پرانے سویٹر کے ساتھ کارڈرائے کی پتلون اور پاؤں میں چیل پہن کر وہاں پہنچ جاتا۔ کسی موضوع پر بحث چھڑتی تو ہمیشہ کہتا کہ اگر ایسا ہے تو کیا خرابی ہے اور اگر ویسا ہے تو کون سی قیامت برپا ہو جاتی۔ اپنی سکی طبیعت کی وجہ سے اکثر لوگوں میں انتہائی غیر مقبول تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود اس میں منافقت اور تصنع نام نہ نہ تھا۔ حنیف کا باطن خلوص اور پیار کا ایک ایسا برفانی تودہ تھا جو دوستی کے جذبے کی ہلکی سی آنچ سے پکھلنے لگتا۔

لکڑی کی تین سیڑھیاں طے کر کے وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا جہاں اس نے میرے لیے ایک علیحدہ پلنگ ڈالوا تھا۔

”تمہارے پر جوش استقبال نے میری رُوح کو گرمادیا ہے۔“ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے جل کر کہا۔ حنیف کی دھیمی طبیعت کو اچھی طرح سمجھنے کے باوجود اس کی سرد مہری میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اس نے خود ہی مجھے شاک ہوم میں لکھا تھا کہ ایمسٹرڈیم جانے سے قبل ویرن میں میرے پاس ضرور رکنا۔

”تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہیں دیکھ کر خوشی سے ناچنے لگوں گا؟“ اُس کے باوقار چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ برف کا تودہ پکھل رہا تھا۔ ”تم آ گئے۔ بس ٹھیک ہے۔ کھانے کا وقت ہوا چاہتا ہے تم جلدی سے کپڑے بدل کر نیچے آ جاؤ۔“

اُس شب ہم نزدیکی شہر ایل ڈارن میں واقع ایک مشہور ریستوران ”میوزیم ٹیورن“ میں گئے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ”میوزیم ٹیورن“ ریستوران کم اور عجائب گھر زیادہ تھا۔ قدیم وضع کے چھوٹے سے ہال میں کھانے کی میزوں اور دیواروں پر بے شمار شخصے کے مرتبان دھرے

تھے جن میں مختلف انواع کے جانوروں کے لاشے کسی آبی محلوں میں تیر رہے تھے۔ مگر مجھ ’گرگٹ‘ کچھوئے، گلہریاں اور جانے کیا کیا! مرتبانوں کے اُوپر حنوط شدہ پرندے قطار اندر قطار اپنے بے جان پر پھیلانے ماحول کو اور بھی وحشت ناک بنا رہے تھے۔ گول گول آنکھوں والے اُلُو کر یہہ النظر چگاڑیں، لمبی چونچوں والے گدھ۔

”مجھے یہاں آ کر بڑا سکون ملتا ہے۔“ حنیف نے سنجیدگی سے کہا۔ ”دنیا کی بے ثباتی کا احساس شدید ہو جاتا ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ کل کلاں مر جاؤں تو مجھے بھی ششے کے مرتبان میں..... خیر تم کھاؤ گے کیا؟“

”مجھے تو بالکل بھوک نہیں۔“ ہماری میز پر رکھے مرتبان میں ایک کر یہہہ اشکل چھپکی اوندھی تیر رہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ فراعنہ کے مصر میں کسی بڑی دعوت میں کھانے سے قبل مہمان کو دنیا کی اسی بے ثباتی کا احساس دلانے کے لیے اس کے سامنے ایک می پیش کی جاتی۔ میرا خیال ہے کہ کم از کم کھانے کے دوران میزبان می اٹھا کر واپس تابوت میں رکھ دیتا ہوگا تاکہ آئندہ دعوت پر کام آئے مگر یہاں تو سینکڑوں جانوروں کی میاں پورے ماحول کا ایک لازمی جزو تھیں۔ حنیف کے اسرار پر میں نے مچھلی منگالی اور بہ مشکل چند ٹکڑے نکلے۔ وہ کم بخت چھپکی اب اوندھی تیرنے کی بجائے سیدھی ہو گئی تھی۔

ہم رات گئے واپس لوٹے۔ میں نے کپڑے تبدیل کیے اور بستر پر لیٹ گیا۔ مکان کے ساتھ ہی ریلوے کا پھانک تھا۔ گاڑی کی آمد سے چند منٹ قبل پھانک پر خطرے کی تیز گھنٹی زور زور سے بجنے لگتی۔ گاڑی گزرتی تو دھمک کی وجہ سے پورے مکان پر کپکپی کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ یہ سلسلہ تمام رات جاری رہا اور میں بالکل نہ سو سکا۔

”آج ہم تمہیں اپنے ملک کا سب سے خوبصورت گاؤں اور سب سے عجیب و غریب قصبہ دکھائیں گے۔“ دوسری صبح ناشتے پر کپ نے مجھ ہالینڈ کے مشہور پنیر کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دیتے ہوئے کہا۔

”بہت ہی عجیب و غریب۔“ حنیف نے جویاہ کافی پی رہا تھا مسکرا کر سر ہلایا۔ وہ آج بہتر موڈ میں دکھائی دے رہا تھا۔

”تم لوگ تھوڑی دیر انتظار کرو۔ میں بوڑھوں کو ناشتہ دے آؤں۔“ کپ اٹھ کر باورچی خانے میں چلا گیا۔ حنیف نے بتایا کہ کپ عادات و اطوار کے لحاظ سے خالصتاً مشرقی ہے۔ اگرچہ مقامی رواج کے مطابق اس کے عمر رسیدہ والدین کو کسی ”بوڑھوں کے گھر“ میں پڑا ہونا چاہیے مگر اس نے انہیں اپنے پاس رکھا ہوا ہے اور ان کا بے حد خیال رکھتا ہے۔ فیکٹری میں تربیت کے دوران دوستی ہوگئی تو اپنے گھر بلا لیا اور کرایہ بھی وصول نہیں کرتا۔ ہالینڈ کی روایتی کنجوسی سے شدید نفرت کرتا ہے اور تو اور ہر اتوار کو اپنی سیکرٹری کے گھر جا کر اس کی کار صاف کرتا ہے۔

ہم کپ کی سرخ کار پر قصبے سے باہر نکلتے تو سامنے ایک بارات آ رہی تھی۔ دولہا اور دلہن شادی کے روایتی لباس میں ملبوس ایک سنہری بگھی پر سوار تھے جسے مشکلی رنگ کے چار چاک و چوبند گھوڑے کھینچ رہے تھے۔ ان کے پیچھے اور بھی درجنوں گھیاں تھیں جن پر باراتی سوار تھے۔ اس قافلے کے دونوں طرف گھڑ سوار ہاتھوں میں بگل لیے بارات کی آمد کا اعلان کر رہے تھے۔ ”دولہا میری فیکٹری میں سائیکلوں کے ہینڈل بار بناتا ہے۔“ کپ نے بتایا۔

”فیکٹری میں مزدور ہے تو شادی کا یہ شاہانہ ٹھانٹھا بٹھ کیسا!“ میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”اس سارے شو کا خرچہ صرف دو ہزار گلڈر مقرر ہے۔ بارات کے ماہرین کی دکان سے گھیاں، گھوڑے اور بگل نواز ایک گھنٹے کے لیے اسی کرائے پر اٹھتے ہیں۔“

آج اتوار تھا اور سڑک کے ساتھ ساتھ بے شمار سائیکل سوار قریبی دیہات اور نہروں کے کنارے پکنک منانے جا رہے تھے۔ ایک سائیکل کی ٹوکری میں ایک ننھا مناجچہ بڑے مزے سے لینا انگوٹھا چوس رہا تھا۔ سڑک کے ساتھ کھیتوں اور چھوٹی چھوٹی نہروں کا ایک لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ نہروں کے کنارے دیوڑا تیلیوں کی مانند اپنے چوڑے پر پھیلائے درجنوں ہوائی چکیاں ساکن کھڑی تھیں۔ جیسے ذرا سی آہٹ سے جھٹ فضا بے بسط میں پرواز کر جائیں گی۔ ہالینڈ کی ہوائی چکی واقعی کسی زمانے میں دھن کی پوری اور کام کی چکی ہوا کرتی تھی۔ پچیس ہزار مربع میل کے کل رقبے میں سے ہالینڈ کا سوا چار ہزار مربع میل زیر آب ہے۔ تقریباً پورا ملک سطح سمندر سے دس فٹ نیچے ہے۔ دنیا کی اور کوئی قوم اہل ہالینڈ کے اس بظاہر ناممکن کارنامے کی ہمسری نہیں کر سکتی کہ انہوں نے اپنا ملک خود اپنے ہاتھوں سے تخلیق کیا۔ پورے ہالینڈ کا آدھا رقبہ سمندر کو

جنگ کر کے حاصل کیا گیا ہے۔ آج سے ایک ہزار سال قبل ہالینڈ یعنی ”نیشبی علاقے“ کے باشندوں نے اپنے دلدل اور پانی سے گھرے ہوئے مکانوں اور زمینوں کو وسعت دینے کا خواب دیکھا۔ اس کی تکمیل کے لیے انہوں نے بند باندھے۔ نہریں کھودیں اور اپنے ہاتھوں سے پانی کا نکاس کیا۔ زمانہ بدلاتو انسانی ذہن کی اختراع نے ہوائی چکیوں کو جنم دیا جو زمین کو خشک کرنے میں بے حد معاون ثابت ہوئیں۔ بجلی کی ایجاد اور جدید مشینوں نے ہوائی چکیوں کی افادیت کو ختم کر دیا اور نکاس کے لیے واٹر پمپ استعمال ہونے لگے۔ اب یہی ہوائی چکیاں جن کی بدولت ہالینڈ کا ملک نقشے پر ابھرا اپنی افادیت کی مدت پوری کر کے فٹن یافتہ بوڑھوں کی مانند آرام کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ ہمارے سامنے سڑک کے کنارے ایک ہوائی چکی پر پھیلائے کھڑی تھی۔ ہم کار سے اتر کر اندر چلے گئے۔ پہلی منزل پر ٹورسٹ آفس تھا۔ ایک بل دار آہنی سیڑھی آخری منزل تک جاری تھی۔ ہوائی چکی کا نظام کار خاصا پیچیدہ ہوتا تھا۔ لوہے کی بڑی بڑی گریاں اور بھاری زنجیروں کا ایک جنگل۔ بوڑھے رکھوالے نے ہمیں بتایا کہ اس ہوائی چکی سے اب بھی آٹا پیسنے کا کام لیا جاتا ہے۔

تھوڑی دور جانے کے بعد سڑک کے دائیں کنارے ایک بوڑھا نظر آیا۔ ”گیتھورن بائیں طرف“ میں نے بائیں جانب دیکھا۔ وہاں کسی قصبے کی بجائے ایک پرسکون نہر بہہ رہی تھی۔ ہم کار سے اتر کر نہر کے کنارے کھڑی ہوئی ایک کشتی میں سوار ہو گئے۔ کشتی کے مالک ڈچ لڑکے نے کشتی کے پچھلے حصے پر نصب انجن کے پٹے کو زور سے کھینچا۔ انجن سے پھٹ پھٹ کی متواتر آواز آنے لگی اور ہم نہایت ست روی سے نہر کی پرسکون سطح پر تیرنے لگے۔ کنارے پر چند قہوہ خانوں اور ہرے بھرے کھیتوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ ایک مقام پر نہر تو بے درجے کا زاویہ بناتے ہوئے دائیں ہاتھ مڑ گئی تھی۔ ڈچ لڑکے نے موڑ پر کشتی کا انجن بند کر دیا اور کمر کے ساتھ بندھے ہوئے سینگ نمابگل کو ہاتھ میں لے کر پوری قوت سے بجایا تاکہ موڑ کے دوسری جانب آنے والی کشتیوں کو ہماری آمد کی خبر ہو جائے اور اس طرح تصادم نہ ہونے پائے۔ جب دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا تو لڑکے نے انجن دوبارہ شارت کر دیا۔

”مستنصر اپنا کیمرہ تیار رکھو۔“ کپ نے میرا کندھا دبا کر کہا ”تم ہالینڈ کا حسین ترین قصبہ دیکھنے والے ہو۔“

میں نے چمڑے کے کیس میں سے اپنا مووی کیمرہ نکالا۔ ایک ہاتھ سے ہینڈل کو مضبوطی سے تھاما اور دوسرے سے فوکس درست کر کے آنکھ ویو فائنڈر (View Finder) پر جمادی۔ کشتی دھیرے سے دائیں طرف مڑی تو کیمرے کی آنکھ میں سبز اور نیلے رنگوں کا ایک سمندر ابل پڑا۔ منظر پورے طور پر واضح نہ تھا۔ میں نے لینز گھما کر فوکس پھر درست کیا۔ میں کیمرے کی آنکھ سے گیتھورن کا خوبصورت قصبہ دیکھ رہا تھا۔ قصبے کے پتوں بیچ بننے والی پرسکون نہر کے کنارے کسانوں کے قدیم وضع کے مکان درختوں اور خود ویلیوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ سورج کی تیز کرنیں گھنے درختوں میں چھن چھن کر پانی کی سطح سے ٹکراتیں اور پھر کیمرے کے لینز سے ٹکرا کر شوخ رنگوں میں بکھر جاتیں۔ سفید پٹھوں کے ایک غول نے کشتی کے انجن کی آواز سن کر پر پھیلائے اور تیزی سے تیر کر دوسرے کنارے پر چلی گئیں، لمحہ بھر کے لیے نہر کی پرسکون سطح پر ہلکا سا تلاطم پیدا ہوا۔ پانی میں منعکس خوبصورت گھر ویلیوں کے جھنڈ اور درخت تھوڑی دیر کے لیے گھل مل سے گئے اور پھر اس عکسی تصویر کے خدوخال دوبارہ ابھر آئے۔ میری انگلی متواتر کیمرے کے بٹن پر دباؤ ڈال رہی تھی۔ فلم تیزی سے سرک رہی تھی۔ نہر کے دونوں کناروں کو لکڑی کے درجنوں کمان نما پل آپس میں ملارہے تھے۔ ایک پل آیا تو اوپر کھڑے دھقانی بچوں نے ہم پر پھولوں کی پتیوں کی بو چھاڑ کر دی۔ ہمارے گرد مکمل سکوت تھا جسے صرف انجن کی پھٹ پھٹ کی بے ہنگم آواز توڑ رہی تھی۔ جب کبھی کشتی چلانے والا لڑکا اپنا سینک نمابگل بجاتا تو کناروں کے ساتھ ساتھ تیرنے والی بٹھیں بدک کر کسی گہرے سبز کنج میں گھس جاتیں۔

”ایک نظر ادھر بھی۔“ کپ نے سرگوشی کی۔

میں نے کیمرے کی آنکھ سے نظر ہٹا کر بائیں جانب دیکھا۔ ایک ننھی منی ندی بڑی نہر سے جدا ہو کر چند سوگزن کے فاصلے پر واقع قصبے کے واحد کلیسا تک چلی گئی تھی۔ ہر گھر کے ساتھ ذاتی کشتیاں کھڑی کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے گھاٹ بنے ہوئے تھے۔ کپ نے بتایا کہ یہاں رہنے والے کسان ڈھور ڈنگر سمیت انہی کشتیوں پر اپنے کھیتوں کو جاتے ہیں۔ روزمرہ کے استعمال کی چیزیں بھی انہی کشتیوں پر سجا کر قصبے میں فروخت کی جاتی ہیں۔ دائیں جانب سیاہ لکڑی کی ڈھلوان چھت کے ایک قدیم مکان کے باغیچے میں ایک بوڑھا بارائش مصو اپنے سامنے کیٹوس رکھے تصویر کشی میں مگن تھا۔ ہماری کشتی پاس سے گزری تو اس نے دونوں ہاتھوں سے تصویر اٹھا کر

رخ ہماری طرف کر دیا۔ تصویر میں گہرے سبز اور چمکتے نیلے رنگوں کی بھرمار تھی۔ خود رو گھاس، ویلیوں اور گھنے درختوں کا شوخ سبزہ شفاف آسمان اور پانی کی نیلگوں لہریں۔ کپ نے ہاتھ ہلا کر تصویر کی پسندیدگی کا اظہار کیا اور ہماری کشتی آگے بڑھ گئی۔ تھوڑی دور جا کر نہر کا پاٹ قدرے چوڑا ہو گیا اور ہم بائیں ہاتھ مڑ کر قصبے کے پچھواڑے سے ہو کر واپس اسی جگہ پہنچ گئے جہاں ہماری کار کھڑی تھی۔ ”گیتھورن“ یا ”پانی کا سینک“ واقعی ہالینڈ کا خوبصورت ترین قصبہ ثابت ہوا۔ خوبصورت ترین کے بعد اب سب سے عجیب و غریب کی باری آتی ہے۔“ میں نے کشتی سے باہر قدم رکھتے ہوئے کپ سے کہا۔

”ابھی نہیں۔“ کپ نے انگلی اٹھا کر کہا ”پہلے دوپہر کا کھانا کھالیا جائے۔“ ہم نہر کے کنارے ایک ریستوران میں چلے گئے۔

ہالینڈ کے ہر باشندے کو جتنا قلق انڈونیشیا چھٹ جانے کا ہے اتنا شاید دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمنوں کے ہاتھوں پٹ جانے کا بھی نہیں۔ انڈونیشیا کا ذکر چھڑ جائے تو ڈچ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بڑی دردناک قسم کی آپہں بھرنا شروع کر دیتے ہیں اور منہ پھلا کر یوں بیٹھ جاتے ہیں جیسے کسی ننھے بچے کا نگین غبارہ ہاتھ سے چھوٹ گیا ہو۔ میں نے چاول پاڑ اور مرغ کے قتلوں پر مشتمل ایک انڈونیشی کھانے کا آرڈر دیا تو کپ پر بھی اسی قسم کی کیفیت طاری ہو گئی۔ حنیف نے بڑی مشکل سے منایا۔ ہالینڈ میں انڈونیشی کھانے روزمرہ کی خوراک کا ایک لازمی جزو بن چکے ہیں۔ یہاں تک کہ خالص یورپی کھانوں میں بھی کشمش اور انناس کا استعمال ہوتا ہے۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم نے کار میٹل جانے والی شاہراہ پر موڑ دی۔ اب ہم ”سٹاپ ہارس“ کا قصبہ دیکھنے جا رہے تھے۔

سٹاپ ہارس کے چند سومکانوں پر مشتمل قصبے کی تمام سڑکیں اور گلیاں مکمل طور پر سنسان پڑی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہم بھوتوں کے قصبے میں آ گئے ہوں۔ قصبے کے شروع میں ایک بڑا بورڈ آویزاں تھا۔

”یہاں فوٹو گرافی قلعی ممنوع ہے۔ خلاف ورزی کرنے والے نتائج کے خود ذمہ دار ہوں گے۔“

میں نے حیرت سے کپ کی طرف دیکھا جو ایک ہاتھ سے سٹیرنگ سنبھالے دوسرے سے کار کے شیشے اوپر چڑھا رہا تھا۔ ”میں نے تمہیں ہالینڈ کا سب سے عجیب و غریب قصبہ دکھانے کا وعدہ کیا تھا۔“ اس کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔ مکانوں کی گھاس پھوس کی ڈھلوان چھتوں کے اوپر لکڑی کی چنیاں تھیں۔ ہر دروازے پر مکینوں کا مکمل شجرہ نسب نقش تھا۔ گھروں کے باغیچے بھی بالکل ویران پڑے تھے۔ شاپ ہارس کے مکین ازمنہ وسطی کے ایک ایسے مذہبی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں جس نے صدیوں سے اپنے عجیب و غریب رسم و رواج اور رہن سہن کے طریقے نہیں بدلے۔ جدید روشنی کو کم قاتل سمجھتے ہیں اور اس چھوٹے سے جزیرے میں اپنی روایات کو سینے سے لگائے اسی راہ پر گامزن ہیں جس کا تعین ان کے آباؤ اجداد نے زمانہ قدیم میں کیا تھا۔ اتوار کے روز کسی قسم کا کام کرنا گناہ کبیرہ سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ 1953ء کے عظیم سیلاب میں انہوں نے اتوار کے روز ٹوٹے ہوئے بند کی مرمت سے بھی انکار کر دیا تھا۔ اسی لیے آج شاپ ہارس کے کوچہ و بازار ویران پڑے ہیں۔ آج اتوار تھا۔ اس قصبے کا اپنا علیحدہ کلیسا ہے اور وہاں کے پادری کا ہر لفظ ان کے لیے خدائی احکام کا درجہ رکھتا ہے۔ سگریٹ اور شراب کے قریب نہیں پھٹکتے۔ لڑکے اور لڑکیوں کی شادیاں گاؤں کے مکین آپس میں ہی کرتے ہیں۔ اگر کوئی باہر کا لڑکا مقامی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے تو کہا جاتا ہے کہ قصبے کے لوگ اسے پکڑ کر دیکتے ہوئے تانے کے سکوں سے داغ دیتے ہیں۔ شادی کی رسم بے حد عجیب و غریب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لڑکی جوان ہونے پر اپنے کمرے کی کھڑکی ہمیشہ کھلی رکھتی ہے۔ اس کا محبوب بظاہر چوری چھپے رات کو کھڑکی پھلانگ کر کمرے میں آ جاتا ہے اور شب بصری کے بعد صبح سویرے اسی راستے واپس چلا جاتا ہے۔ اگر معینہ مدت کے بعد لڑکی کا پاؤں بھاری ہو جائے تو والدین دونوں کی شادی کر دیتے ہیں۔ ورنہ لڑکی کے لیے عشق کے امتحان اور بھی ہوتے ہیں۔ بہر حال یہ صرف روایت ہے اور چونکہ شاپ ہارس کے باشندے اپنے فرقے کے بارے میں کسی قسم کی گفتگو کرنے پر تیار نہیں ہوتے اس لیے اس روایت کی تصدیق نہیں کی جاسکتی۔ کپ نے کار ایک ذیلی سڑک پر موڑ دی۔ یہاں بھی مکمل خاموشی تھی۔

”توجہ مبذول کیے بغیر مکان کے باغیچے میں دیکھو۔“ حنیف نے سرگوشی کی۔

باغیچے میں ایک ننھی مٹی لڑکی شاپ ہارس کے روایتی لباس میں ملبوس ایک سیاہ پوش گڑیا

سے کھیل رہی تھی۔ لڑکے نے لمبے سیاہ چننے کے ساتھ اسی رنگ کی ٹوپی اوڑھ رکھی تھی۔ کپ نے کار کھڑی کر دی۔ میں نے آہستہ سے کیمرا اٹھا کر رُخ گڑیا کی جانب پھیر دیا۔ ابھی شاید ایک فٹ فلم بھی نہ بنی ہوگی کہ مکان کا دروازہ کھلا اور ایک عورت باہر نکلی جس نے شاید کھڑکی سے ہماری کار اور کیمرے کو دیکھ لیا تھا۔ اس نے قہر آلود نظروں سے ہماری جانب دیکھا اور گڑیا کو گھسیٹتی ہوئی اندر لے گئی۔ کپ نے فوراً کار سٹارٹ کر دی اور ہم واپس بڑی سڑک پر آ گئے۔ میں ایک مشاق شکاری کی مانند کیمرے کو بندوبست کی طرح ہاتھ میں تھامے فلم بنانے کے لیے ”شکار“ کی تلاش میں تھا۔ اس مرتبہ قسمت نے یاوری کی۔ ہم سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر شاپ ہارس کے مکینوں کا ایک جوڑا بڑے آرام سے سائیکلوں پر جا رہا تھا۔ میں بڑی احتیاط سے تصویریں کھینچنے لگا۔ جوڑے نے اپنے فرقے کا مخصوص لباس پہن رکھا تھا۔ عورت نے کالے چننے کے علاوہ سر پر لیس (LACE) سے آراستہ ایک ٹکونی ٹوپی پہن رکھی تھی جس کی وضع امریکہ کی دہشت پسند تنظیم کا کلکس کلان (K.K.K) کی ٹوپوں کی طرح تھی۔ ہم بالکل آہستہ رفتار سے ان کے پاس سے گزرے تو میں نے کیمرے کا رخ ان کی طرف موڑ دیا۔ ایک دم وہ دونوں سائیکلوں سے اتر کھڑے ہوئے اور سڑک سے پتھر اٹھا کر ہماری کار پر برسائے شروع کر دیئے۔ ساتھ ساتھ وہ اپنی زبان میں چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہے تھے۔ ایک کار کے شیشے پر آگیا اور میں نے کیمرا نیچے کر لیا۔ کپ نے فوراً کار کی رفتار تیز کر دی اور ہم شاپ ہارس کے قصبے سے باہر نکل آئے۔ واپس ویرن پہنچنے تک تمام لوگ بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ دراصل ہم سب بری طرح سہمے ہوئے تھے۔ مجھے بار بار یہ خیال ستا رہا تھا کہ اتوار کے مقدس دن ان کی فلم بنا کر میں نے انہیں اپنا زلی دشمن بنا لیا ہے اور اب چاہے میں کہیں بھی چلا جاؤں شاپ ہارس کے مکین ہاتھوں میں دھکی سلاخیں لیے مجھے آ لیں گے۔

اس شب ہم نے کھانا گھر پر ہی کھایا کیونکہ ٹیلی ویژن پر ایک بہت ہی خصوصی پروگرام دکھایا جاتا تھا۔ آج خلائی جہاز اپالو گیارہ چاند پر اتر رہا تھا۔ علی الصبح نیل آسنرائنگ ایک آؤٹ آف فوکس بھوت کی طرح چاند پر اترا۔ ”انسان کا ایک قدم مگر انسانیت کے لیے ایک عظیم جست“ چاند پر انسان کے اولین الفاظ۔ شاپ ہارس کا قصبہ ایک قدم اٹھا کر ہی رک گیا تھا اور دنیا ایک عظیم جست لگا چکی تھی۔ مجھے اس سائیکل سوار جوڑے کا خیال آ گیا جنہوں نے صرف تصویر اتارنے کے جرم میں ہمیں پتھر مارے تھے۔ شاید وہ بھی اس وقت ٹیلی ویژن دیکھ رہے ہوں گے۔

ازمنہ وسطیٰ کی ذہنیت کا انسان چاند کے انسان کے بارے میں کیا سوچتا ہوگا۔ شاید وہ اس وقت نیل آسمانگ کو کوس رہے ہوں گے۔ اس نے چاند پر قدم رکھنے جرات کیونکر کی؟ آج تو اتوار تھا۔

اگلی صبح حنیف اور کپ اپنے کام پر چلے گئے اور میں ناشتے کے بعد کپ کی پرانی سائیکل لے کر قصبے کی سیر کو نکل گیا۔ ہالینڈ کا ملک ہموار ہونے کی وجہ سے سائیکل سواری کے لیے انتہائی موزوں ہے۔ ہر شاہراہ کے پہلو میں سائیکل سواروں کے لیے علیحدہ راستے بنے ہوئے ہیں۔ میں تمام صبح قصبے سے ملحقہ کھیتوں اور نہروں کے کنارے گھومتا رہا۔ پچھلے پہر گھر لوٹا تو حنیف کام سے واپس آچکا تھا اور مکان کے پچھواڑے میں آرام گری پر لیٹا دھوپ سے بچاؤ کے لیے چہرے پر اخبار پھیلائے اٹک رہا تھا۔ میں بھی اس شاندار مشغلے میں شامل ہو گیا۔ شام کو کپ بھی آ گیا اور ہم کار پر گھومنے چلے گئے۔ اگلے چند روز یہی سلسلہ جاری رہا۔ صبح سائیکل پر آوارہ گردی، پچھلے پہر حنیف کی رفاقت میں اٹکنا اور پھر شام کو کپ کے ساتھ کسی نزدیکی شہر یا قصبے کی سیر۔ اس سے پہلے کہ یہ سب معمول مجھے مکمل طور پر کابل بنادیتا میں نے دیرین سے ہالینڈ کے دل ایسٹرڈیم جانے کا فیصلہ کر لیا۔ حنیف کو روانگی کے بارے میں بتایا تو اس نے اپنی روایتی قنوطیت کا مظاہرہ کیا۔ ”لنڈن آج کل رنگ و نسل کے جھمیلوں میں پھنسا ہوا ہے۔ پیرس والے تو ویسے ہی چور ہیں اور ہسپانیہ؟ بھلا دو چار بھلے مانس بھینسوں کو قتل ہوتے دیکھنے کے لیے اتنی دور جانا کہاں کی عقل مندی ہے۔ میری مانو تو یہیں دیرین میں پڑے رہو۔ ستمبر میں اکٹھے ہی پاکستان چلیں گے۔“

کپ کا رویہ حقیقت پسندانہ تھا۔ ”میں کل فیکٹری سے چھٹی کر لوں گا۔ پہلے تمہیں ہالینڈ کا سب سے بڑا بند ”زورڈی ڈانک“ یا ”ساؤتھی ڈیم“ دکھائیں گے اور پھر واپسی پر ایسٹرڈیم میں اتار دیں گے۔“

دوسری صبح سورج طلوع ہونے سے قبل ہی ہم شمالی سمندر کے درمیان تغیر کردہ عظیم بند کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم آئریز سے گزرے جو ہالینڈ میں پھولوں کی تجارت کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ ”بلو مین سینٹر“ بقول کپ۔ میں نے ٹیولپ کے پھولوں کے کھیت دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو

معلوم ہوا کہ ان کا موسم مئی میں ختم ہو گیا تھا۔ ہوائی چکیاں اور ٹیولپ کے پھول ہالینڈ کا امتیازی نشان بن چکے ہیں۔ ٹیولپ کا پھول بیج سے نہیں بلکہ ایک پیاز نما گانٹھ کو زمین میں دبا کر اگایا جاتا ہے۔ ٹیولپ دراصل ترکی کا پھول ہے اور اس کے معنی بھی ”ترکی قبا“ کے ہیں۔ اس کی گتھی ہوئی چوڑی پتیوں پر فی الواقع ایک مشرقی گکڑی کا گمان ہوتا ہے۔ سولہویں صدی میں آسٹریا کے ایک سفیر نے ٹیولپ کی گانٹھیں ترکی سے لاکر یورپ میں متعارف کرائیں۔ ہالینڈ میں اس کا فروغ ایک ماہر نباتات کالسیس کے ہاتھوں ہوا۔ ٹیولپ کے شوغ رنگوں اور بناوٹ نے اہل ہالینڈ کے دل موہ لیے۔ ماہرین نے نت نئے رنگوں اور بناوٹوں کے ٹیولپ اگانے شروع کیے تو پورے ملک میں تہلکہ مچ گیا۔ اسی دور میں نئی قسم کے ٹیولپ کی ایک گانٹھ کی قیمت دو ہزار ڈالر تک ادا کی گئی۔ دوسری جنگ عظیم میں لوگوں نے بھوک سے مجبور ہو کر ان گانٹھوں سے پیٹ پالا اور ٹیولپ کی بے شمار نادر اقسام نذر شکم ہو گئیں۔ اب ہالینڈ میں پھول صرف خوبصورتی اور شاعری کی علامت نہیں رہے بلکہ ایک منافع بخش تجارت بن گئے ہیں۔ ایسٹرڈیم کے شپول ہوائی اڈے سے ہر سال کروڑوں روپے کے پھولوں کے بیج، ٹیولپ کی گانٹھیں، گلاب کے پودے اور تازہ چنے ہوئے پھول دنیا کے دوسرے ملکوں کو برآمد کیے جاتے ہیں۔ آئریز میں ہم نے کئی ”شیشے کے گھر“ دیکھے جن کے اندر درجہ حرارت حسب ضرورت معتدل کر کے ہر موسم میں پھول اگائے جاتے ہیں۔ آئریز کا پینزی یا گل راحت بھی دنیا بھر میں مشہور ہے۔ کپ نے ہمیں پھولوں کے ایک تاجر سے ملایا جو روزانہ پھولوں کے ٹوکڑے بذریعہ ہوائی جہاز شاہ ایران کے لیے بھیجتا ہے۔

آئریز سے ہم ہارلم پہنچے جو پھولوں کی تجارت کا ایک بڑا مرکز ہے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے الکمار کے شہر میں کھایا جو اپنے پیر کی نسبت مشہور ہے۔ حنیف کی رگ شاعری پھڑکی اور فی البدیہہ فرمایا۔

لو وہ چودھویں کا چاند اُبھرا
جیسے الکمار کے زرد پنیر کا لذیذ ٹکڑا

میں نے وزن کے بارے میں اعتراض کیا تو کہنے لگا۔ ”وزن سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

پنیر مزیدار ہونا چاہئے۔“

اب ہم جس سڑک پر جا رہے تھے اس کی ایک جانب زورڈی کی عظیم جھیل ٹھاٹھیں مار رہی

تھی اور دوسری طرف نکاسی آب سے حاصل شدہ زمینوں پر جدید قصبے اور لہلہاتے کھیت تھے۔ پچھلے پہر ہم زوڈرزی کی ڈانک یا بند پر پہنچ گئے۔ ایک عظیم بند پھرے ہوئے سمندر کے پتھوں بیچ تیر کی طرح ایک لائن تھی نکلنے تک چلا گیا تھا۔

نارتھ سی کوڈانک کی تعمیر سے مقید کرنے کی تجویز لیلی نامی شخص نے پیش کی جس کے تحت ایک بڑے بند کے ذریعے شمالی ہالینڈ کے صوبے کو فرنین ساحل کے ساتھ ملانا مقصود تھا۔ ڈانک کی تعمیر دونوں طرف سے بیک وقت شروع ہوئی۔ لاکھوں ٹن پتھر اور مٹی سمندر کی تہہ میں غرق کیے گئے اور پانی میں سے بند ابھرتا گیا۔ مئی 1932ء میں ڈانک کے دونوں سرے مل گئے۔ سطح سمندر سے اکیس فٹ بلند نوے گز چوڑا بند انیس میل سے زائد لمبا ہے۔ سمندر کے اس حصے کو قید کرنے کے بعد اسے مختلف ٹکڑوں میں بانٹ کر پانی کا نکاس کا شروع ہوا۔ زمین کو نمکیاتی مادوں سے پاک کر کے نئی سڑکیں اور پل تعمیر کیے گئے۔ آب رسانی، فون اور بجلی کا سلسلہ قائم کیا گیا۔ اب جہاں کسی زمانے میں سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا وہاں خوبصورت قصبے اور کھیت ہیں جو کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں کے خواب کی تعبیر ہیں۔ جس مقام پر ڈانک کے دونوں سرے آپس میں ملے تھے وہاں ایک یادگار کھڑی ہے۔ ہم یادگار کی سیڑھیاں طے کر کے اوپر پلیٹ فارم تک چلے گئے جہاں سے پورے ڈانک کا منظر سامنے آ گیا۔ ہم زوڈرزی ڈانک دیکھنے کے بعد ایمسٹرڈیم جانے والی شاہراہ پر گامزن ہوئے تو مجھے ڈانک کی یادگار پر کندہ عبارت کے الفاظ یاد آ گئے۔

”زندہ تو میں اپنے مستقبل کی تعمیر کرتی ہیں۔“

ایک خوبصورت نظم۔ ایمسٹرڈیم

ڈانک سے واپسی پر حنیف اور رپ مجھے ہالینڈ کے سب سے بڑے شہر ایمسٹرڈیم کے ایک پرسکون علاقے میں واقع ”ہوٹل کاک“ کے باہر اتار کر خود واپس دیرن چلے گئے۔ ”ہوٹل کاک“ کے طرز تعمیر سے ظاہر تھا کہ چند سو برس پیشتر یہ عمارت کسی ڈچ سوداگر کا شاہانہ گھر تھا۔ ڈھلوان چھتیں، شیشے کی قد آدم کھڑکیاں اور دیز چوبی دروازہ جس پر لوہے کا ایک بھاری کنڈالٹک رہا تھا۔ ڈیک پر اپنا نام اور پتہ رجسٹر میں لکھنے کے بعد میں نے سامان کمرے میں رکھا اور شام کے کھانے کے لیے ہال میں واپس آ گیا۔ ہال کے ایک کونے میں چند نوخیز لڑکے اور لڑکیاں ”جیوک باکس“ پر بجنے والی تیز موسیقی پر دھم دھما دھم ناچ رہے تھے۔ یورپ میں جہاں نئی نسل نے تمام پرانی اقدار سے منہ پھیرا ہے وہاں روایتی رقص کی بھی مٹی پلید کی ہے۔ وہ وقت گئے جب ایک یورپی نوجوان صرف اس لیے خودکشی پر مائل ہو جاتا تھا کہ اس نے والزنناچتے ہوئے غلط قدم اٹھانے کی وجہ سے اپنی ہم رقص کا پاؤں مل دیا تھا۔ جس طرح تجریدی مصوری کے لیے صرف ایک برش اور چند رنگوں کی ضرورت ہے اسی طرح آج آپ کو ایک ماہر رقص بننے کی خاطر صرف کانوں کے پردے چیر دینے والی موسیقی اور ایک مضبوط اعصابی نظام درکار ہے۔ جھن، جھن، جھن کی دھمک پر کان رکھیے اور جسم کے تمام اعضا ڈھیلے چھوڑ کر جو چاہے کر گزریں۔ ”فروگ“ اسی بلا کا نام ہے۔ ”جرک“ میں جھٹکے لگتے ہیں اور ”منکی“ یعنی ”بندر“ میں ظاہر ہے آپ کو بندر ناچ ناچنا پڑے گا۔

ہال کے دوسرے حصے میں کھانے کا کاؤنٹر تھا جس کے پیچھے ایک خوبصورت ڈچ لڑکی

کھانا سرور کر رہی تھی۔ میں نے سبزی گوشت کے گاڑھے مرکب کا ایک پیالہ خریدا اور کاؤنٹر کے ساتھ سٹول پر بیٹھ گیا۔ ساتھ والے سٹول پر ایک سرخ بالوں والا ہی بیئر پینے میں مشغول تھا۔ وہ کاؤنٹر پر جھک کر بیئر کا گونٹ بھرتا تو شانوں تک آئے ہوئے سرخ بال اس کی آنکھوں کے آگے آ جاتے۔ وہ اپنی عینک کی پتلی کمائیاں بالوں میں چھپے ہوئے کانوں سے چھڑاتا۔ عینک کاؤنٹر پر رکھتا اور جیب سے کنگھی نکال کر بڑے ٹھنڈے سے بال سنوارتا۔ عینک اٹھا کر دوبارہ ناک پر جماتا اور پھر بیئر پینے میں مصروف ہو جاتا۔ عام ہٹی کی موجودگی کا احساس قوت بینائی استعمال کرنے سے نہیں ہوتا بلکہ قوت شامعہ پر موقوف ہوتا ہے، لیکن یہ صاحب وضع قطع سے خاصے صاف ستھرے دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے گاڑھے مرکب کا چھچھرہ کر منہ میں ڈالا تو ایک دم ابائی آ گئی۔ نہایت بدذائقہ تھا۔ میں نے منہ بنالیا۔

”بدمزہ ہے نا؟“ سرخ بالوں والے ہٹی نے ماتھے پر سے بال ہٹاتے ہوئے پوچھا اور پھر مسکرا کر کہنے لگا ”پہلے دن میں بھی پھنس گیا تھا۔“

میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”ہالینڈ میں صرف بیئر اچھی ملتی ہے۔“ اس نے ایک لمبا گھونٹ بھرا اور خالی ملک کاؤنٹر پر کٹکلانے لگا۔ ”میرا نام جوشوا ہے۔ واشنگٹن ڈی سی۔“

”اور میرا نام مستنصر ہے لاہور پاکستان۔“ میں نے بھی امریکی طریقہ تعارف اپنایا۔ ”پاکستانی؟“ اس نے ہونٹ بھیج کر مایوسی سے سر ہلادیا۔ ”پھر تو شاید تم میری رفاقت پسند نہ کرو۔ میں امریکی یہودی ہوں۔“

”ہر قومی سانچے پر ہتھیاروں سے مسلح ہو کر یہودی رہائشی علاقوں پر چڑھ دوڑنے کی طرح مشرق والوں نے نہیں ڈالی۔ میں سیاح ہوں اور ذات صفات اور بھیس پر یقین نہیں رکھتا۔“ اس کے چہرے پر رونق آ گئی۔ ”ہم پیوں کے بارے میں تمہارے کیا خیالات ہیں۔“

”تمہاری امن پسندی اور عالمی بھائی چارے کی اقدار سے بھلا کون اختلاف کر سکتا ہے؟ لیکن اخلاقی اقدار کی پامالی اور منشیات کا استعمال میری سمجھ سے باہر ہے۔“

”میں تمہیں کل اپنے چند دوستوں سے ملاؤں گا۔ ان سے مل کر شاید تم پیوں کو بہتر

طور پر سمجھ سکو۔“

”کیا وہ بھی امریکی ہیں؟“

”یہ تو قومی یادگاری سیڑھیوں پر جا کر معلوم ہوگا کہ وہ کہاں کے باشندے ہیں۔“

”تم نے دوست کا لفظ استعمال کیا تھا؟“

”اور تم بھی عالمی بھائی چارے کا لفظ استعمال کر کے بھول گئے ہو۔ تمام ہٹی ایک

دوسرے کے دوست ہیں چاہے وہ کسی بھی ملک یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔“

ہال کے دوسرے حصے میں ابھی تک وہ دھم دھام والا رقص جاری تھا۔ یکا یک چند

لڑکیوں پر جو وہ جداری ہوا تو انہوں نے موسیقی کی دھمک کے ساتھ سر ہلاتے ہوئے اپنے آپ کو

لباس کی قید سے آزاد کرنا شروع کر دیا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ میں نے گھبرا کر جوشوا سے پوچھا۔

”جو بھی ہو رہا ہے اچھا ہو رہا ہے۔“ اس نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے نر مسرت

لہجے میں کہا۔ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی شکلوں سے لگتا تھا جیسے وہ وہیں بیٹھے بٹھائے منجمد

ہو گئے ہوں۔ وہ سب بے حس و حرکت ٹکلی باندھے ان لڑکیوں کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے کن

اکھیوں سے دیکھا۔ لڑکیاں اپنے لباس تلے جامہ غسل پہنے ہوئے تھیں۔ کئی چہرے جامہ غسل کی

غیر متوقع رکاوٹ دیکھ کر لٹک گئے۔ لڑکیوں نے شیشے کی قد آدم کھڑکی کے کواڑ کھولے۔ ابراؤد

آسمان کی طرف ایک نظر دیکھا اور پھر یکفخت ہا ہا۔ ہو ہو کا شور مچاتیں باہر سڑک پر کود گئیں جہاں

زوروں کا مینہ برس رہا تھا۔

”آج پورے تین روز بعد بارش ہوئی ہے۔“ کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی صحت مند ڈچ

لڑکی نے بلاؤز کے ٹن ٹنولتے ہوئے ہم سے کہا۔ ”میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی ان کے ساتھ غسل

میں شریک ہو جاؤں۔“

”ہوسکتا ہے اس کبخت نے لباس کے نیچے جامہ غسل سرے سے پہنا ہی نہ ہو۔“ میں

نے گھبرا کر سوچا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتی اور اپنا اصلی جامہ اتارتی میں

جوشوا سے اگلی صبح ملنے کا وعدہ کر کے دوسری منزل پر اپنے کمرے میں آ گیا۔ سونے سے پہلے میں

نے کمرے کی کھڑکی کھول کر نیچے جھانکا۔ سڑک کے عین وسط میں جوشوا اپنے تمام کپڑوں سمیت

ہندوستانی سادھوؤں کی مانند آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور اپنے گرد بارش میں نہاتی ہوئی لڑکیوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ کاؤنٹر والی صحت مند کے بارے میں میرے شکوک درست تھے۔

دوسری صبح جوشوا (جسے اب میں جوش کے نام سے پکارتا تھا) اور میں ہوٹل سے بذریعہ ٹرام منٹ ٹاور یعنی ایمرسٹڈیم کے نکسالی دروازے آئے اور پھر شہر کی خوبصورت ترین سڑک اور خرید و فروخت کے سب سے بڑے مرکز کا لورسٹراٹ پر چہل قدمی کرنے لگے۔ یہاں میکا کی آمدورفت کی ممانعت تھی۔ چنانچہ لوگ بے دھڑک ہو کر سڑک کے عین وسط میں چل رہے تھے۔ لاہور کے انارکلی بازار کی مانند یہاں پر بھی خرید و فروخت میں دلچسپی رکھنے والے لوگوں کی کمی تھی۔ اکثریت صرف رونق میلہ دیکھنے کے لیے آئی تھی۔ کارلورسٹراٹ کے نزدیک دریائے ایمل ہے جس پر ڈیم یعنی بند باندھا گیا تو نواحی آبادی ایمرسٹڈیم کے نام سے موسوم ہوئی۔ اسی طرح دریائے روٹر پر بند باندھنے پر روٹر ڈیم وجود میں آیا۔ اہل ہالینڈ جب بھی اپنے شہروں کا تذکرہ کرتے ہیں تو وہ روٹر ڈیم کو حرکت سے بھرپور شہر کہتے ہیں۔ ہیگ کو ”بزرگی“ کا جامہ اوڑھا دیا جاتا ہے اور ایمرسٹڈیم ”ایک خوبصورت نظم ہے جو دھیرے دھیرے دل میں اترتی رہتی ہے۔“ ایک ایسے ملک میں جو بظاہر بے جان اور بے حد سپاٹ ہے، ایمرسٹڈیم ایک دھڑکتے ہوئے حساس دل کی مانند ہے۔ ایک ایسا دل جس میں سینکڑوں نہریں حیات آفریں شریانوں کی مانند پھیلی ہوئی ہیں۔ ان عجوبہ روزگار نہروں نے شہر کو سینکڑوں خاموش اور چمکتے ہوئے تالابوں سے چھید ڈالا ہے۔ تالابوں کے گرد پرانے زمانے کے ڈچ سوداگروں کے شاہانہ مکان کھڑے ہیں۔ سفید کھڑکیاں خوبصورت زینے اور قدیم چوبی دروازے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور بھی دیدہ زیب ہو گئے ہیں۔ ایک جدید شہر ہونے کے باوجود ایمرسٹڈیم میں دیہاتی اطوار کی جھلک موجود ہے۔ منٹ ٹاور کے پاس کشتیوں میں سبجے ہوئے پھولوں کا بازار سکون اور خاموشی تنگ گلیوں میں سے آتی ہوئی لوک دھنوں کی سحر انگیز موسیقی، کبھی کبھار شیشے کی چھت والی کشتی اس خوبصورتی میں تیر جاتی تو پانی میں ہلکے تلاطم کی وجہ سے نہر میں تیرتی ہوئی لاتعداد سفید بطخیں اپنے پر پھڑپھڑا کر کمان نما پلوں کی نیچے گھس جاتیں۔ ہر جگہ بہتا ہوا پانی، نیلگوں آسمان لائٹ کی زرد کلیاں، ایلیم کے خوبصورت پتے، نہروں پر لیٹے ہوئے پلوں کے بل کھاتے جنگلوں سے نیچے جھانکیں تو اپنا عکس جھلکتے لگتا ہے۔

اگرچہ ایمرسٹڈیم ملک کا صدر مقام ہے لیکن کاروبار حکومت ہیگ سے چلایا جاتا ہے۔ یہ صورت حال اکثر سیاحوں کے لیے پریشان کن ثابت ہوتی ہے۔ اور تو اور کئی سادہ لوح ڈچ بھی اس گتھی کو سلجھا نہیں پاتے۔ صدیوں سے ان دونوں شہروں میں ملک کا صدر مقام بننے کی رسہ کشی جاری ہے۔ 1806ء میں جب نیپولین نے یورپ کے اکثر ملک اپنے بہن بھائیوں میں بطور ”چیچجی“ بانٹے تو ہالینڈ لوئی بونا پارٹ کے حصے میں آیا۔ لوئی نے ایمرسٹڈیم کو صدر مقام قرار دیا اور ہیگ حکومت اور شاہی نشست کا حقدار ٹھہرا۔ یہ ترتیب کسی قسم کے رد و بدل کے بغیر اب تک چلی آرہی ہے۔ ایمرسٹڈیم صرف ایک خوبصورت شہر ہی نہیں بلکہ بہت بڑا تجارتی مرکز بھی ہے۔ دنیا میں ہیروں کی سب سے بڑی منڈی اسی شہر میں واقع ہے۔ ایمرسٹڈیم کے جوہری ہیروں کی تراش خراش میں دنیا بھر میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ مبارک حویلی موچی دروازے سے برآمد شدہ کوہ نور قلعہ لاہور میں آیا اور پھر سکھوں کی شکست پر لندن منتقل ہوا۔ ملکہ وکٹوریہ کو ہیرے کی دیسی تراش خراش پسند نہ آئی، چنانچہ اسے یورپی وضع دینے کے لیے ایمرسٹڈیم کے ماہر جوہریوں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ کارلورسٹراٹ میں گھومنے کے بعد جوش مجھے حسب وعدہ قومی یادگار کے چوک میں اپنے دوستوں سے ملانے لے آیا جہاں میڑھیوں پر بھانت بھانت کے ہتھی اٹھنے بیٹھنے اور سونے کی مختلف حالتوں میں بکھرے پڑے تھے۔ جوش نے بتایا کہ اس سال یورپ کے پتوں نے ایمرسٹڈیم کی قومی یادگار کی میڑھیوں کو اپنا مرکز قرار دیا ہے۔ چنانچہ دنیا بھر کے ہتھی زیارت کے لیے چلے آ رہے ہیں۔ میں اور جوش بھی اس ہجوم پیمان میں بیٹھ گئے اور وہ مجھے امریکیوں کے ہتھی بن جانے کی وجوہات بتانے لگا۔ ”میری ماں واشنگٹن کی ایک مشہور خاتون صحافی ہیں اور وہ شاکی ہیں کہ اس دور میں امریکہ میں دیانت دارانہ صحافت ایک ناممکن امر ہے۔ کانگریس کے لیڈروں اور امیر تاجروں کی مرضی کے بغیر ایک لفظ بھی لکھنا گویا خود اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔ ایک خاص ٹولے نے اپنے شخصی وقار اور فائدے کی خاطر پورے امریکی معاشرے کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ ان حالات میں نسل ایک عجیب سی کشش کا شکار ہے۔ تعلیم و تدریس کے ادارے البتہ کسی حد تک خود غرضی کے اس زہر سے پاک ہیں۔ ان اداروں میں چند گنے چنے لوگ موجودہ اقدار اور معاشرتی برائیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیے ہوئے ہیں۔ انجلا ڈیوس مارکوس، چومسکی اور پاکستان کے اقبال احمدان میں سرفہرست ہیں۔ امریکی معاشرے نے اعلیٰ تہذیب و تمدن کا جو جامہ اوڑھ رکھا ہے نئی نسل کو اس کے پیچھے چھپے

ہوئے گھناؤنے اور مکروہ چہرے کا علم ہو گیا ہے۔ یہی حالت یورپ کی ہے جہاں خود غرضی اور مادی ترقی کی بنیادوں پر استوار معاشرے میں سے سزا انداٹھ رہی ہے۔ نوجوان طبقہ سکون، امن اور سچائی کی تلاش میں بھٹک رہا ہے۔ ہم سکون کی خاطر چرس پیتے ہیں تو لوگ مشتعل ہو کر اس پر پابندی عائد کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ چرس پینے والا شخص ہمیشہ پر امن رہتا ہے اور اس کے مضرت اثرات کے بارے میں ابھی تک کوئی ٹھوس ثبوت نہیں پیش کیا جا سکا۔ ادھر شراب جیسی لعنت اور تمباکو نوشی جیسے مضرت نشے کی کھلی چھٹی ہے۔ آج یورپ میں نوجوانوں کی جتنی تحریکیں بھی ابھری ہیں، یہی ازم ان سب میں سے پُر امن ہے۔ ہم مغرب سے مایوس ہو چکے ہیں اور اپنی نجات کے لیے مشرق کا دامن تھامنا چاہتے ہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ ہمیں مشرقی موسیقی بے حد پسند ہے اور ہم مشرقی لباس اور عادات و اطوار کے گرویدہ ہوتے جا رہے ہیں۔“

میں نے اپنے گرد نگاہ ڈالی تو جوش کے دلائل میں حقیقت کا روپ نظر آیا۔ اکثر یہی لڑکے اور لڑکیوں کا لباس مشرقی تھا۔ کھدر کے کرتے، واسٹ اور ساڑھیاں۔ ایک صاحب ستار بجا کر راگبیروں سے پیسے کھڑے کر رہے تھے۔ ایک گنجاہتی مجھے کے اوپر ایک ٹانگ پر کھڑا ہنسی بجا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ اتنا جھوم رہا تھا کہ ہر لمحہ ہی خطرہ رہتا کہ ابھی دھڑام سے نیچے آ گرے گا۔ چند بہتی فٹ پاتھ پر دستکاریوں کی دکان لگائے بیٹھے تھے۔ انگوٹھیاں، چوڑیاں، کنگن اور تسبیحیں ان کے اپنے ہاتھوں کی بنی تھیں۔ سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے تمام بہتی بغیر کسی رکھ رکھاؤ اور بناوٹ کے ایک دوسرے سے جو گفتگو تھے۔ سنٹرل نیشن سے آنے والی سڑک پر جب کوئی نیا بہتی نمودار ہوتا تو سب لوگ باؤز بلند اسے خوش آمدید کہتے۔ وہ اپنا مختصر اثاثہ زمین پر رکھ کر وہیں لیٹ جاتا اور اپنے سفر کے بارے میں بتانے لگتا۔

”میں افریقہ سے آ رہا ہوں، وہاں ایک امیر بہتی نے اجتماعی فارم بنا رکھا ہے جس کے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے ہیں۔ فارم پر معمولی محنت کے بدلے رہائش اور خوراک کا انتظام ہو جاتا ہے۔ میں وہاں زندگی میں پہلی مرتبہ پیارا اور دوستی کے جذبے سے آشنا ہوا۔“

”یونانی جزیروں کی غاریں بے حد آرام دہ ہیں۔ سمندر سے مچھلی پکڑنا بھی آسان ہے۔ میک ناس کا جزیرہ آج کل زرد پھولوں سے چاڑھا ہے۔ میں وہیں سے آ رہا ہوں۔“

نو وارد اپنی داستان کہہ چکتا تو سب لوگ اپنے ٹھکانوں پر واپس چلے جاتے اور وہ

مزے سے وہیں پاؤں دراز کر کے اوگھنے لگتا۔

یادگار کے سامنے چند بہتی لڑکے اور لڑکیاں بے تحاشا ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ ”ان

کو کیا ہوا؟“ میں نے جوش سے دریافت کیا۔

”فٹ بال کھیل رہے ہیں۔“

دونوں نہیں بڑے زور و شور سے ایک دوسرے کے گول پر حملہ آور ہو رہی تھیں۔ یوں

لگتا تھا جیسے عالمی چیمپئن شپ کا مسئلہ درپیش ہو۔ بہتی کھلاڑیوں کے چہرے سکون اور مسرت کے

جذبات سے بھر پور تھے۔ گول کیپر نہایت چابکدستی سے گول کی حفاظت کر رہا تھا۔ جب کبھی گول

ہو جاتا تو ارد گرد کھڑے تماشا کش تالیاں بجاتے۔ لیکن..... میں نے سر کھجاتے ہوئے غور سے

دونوں ٹیموں کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ ”فٹ بال تو کہیں بھی نظر نہیں آ رہا۔“ میں نے جوش

سے پوچھا تو کہنے لگا ”فٹ بال کی کیا ضرورت ہے۔ تخیل کی پرواز ہی کافی ہے۔“

دوپہر کے کھانے کے لیے ہم یادگار کے سامنے والی گلی میں واقع ”مازار یستوران“

میں چلے گئے جو کم خرچ ہونے کی وجہ سے بیٹوں میں بے حد مقبول تھا۔ دروازے کے ساتھ خوراک

کے کوپن فروخت ہو رہے تھے۔ کوپن خرید کر ہم کاؤنٹر پر آ گئے جہاں چند بوڑھی عورتیں کوپنوں

کے عوض چائے اور کھانا دے رہی تھیں۔ یہاں بھی بیٹوں کا راج تھا۔ اکثر بیٹوں کی کوشش تھی کہ

بوڑھی عورتوں کو غچہ دیکر چائے کے کوپن کے بدلے گوشت کی پلیٹ مل جائے، مگر وہ بھی ان

ہتکنڈوں سے واقف تھیں۔ اس لیے انہیں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوتی۔ میں نے پیچھے مڑ کر جوش کی

جانب دیکھا تو ایک گنجا بہتی بڑے مزے سے میری کھانے کی پلیٹ اٹھا کر چل دیا۔ میں نے شور

مچایا تو وہ فوراً واپس آ گیا اور بھرپور معذرت کے بعد پلیٹ میز پر رکھ دی۔ ایک صاحب خالی پلیٹ

ہاتھ میں لیے تمام میزوں کا چکر لگا رہے تھے۔ ”ایک آلو تو عنایت کر دیجئے۔“ تھوڑی دیر میں

انہوں نے خاصی خوراک اکٹھی کر لی۔ اس کے بعد ہاتھ میں مشروب پینے والا تنکا لے کر آ گئے۔

میں آپ کے کوکا کولا میں سے ایک چسکی لے لوں؟“

”مازہ“ میں خوراک ”ہوٹل کاک“، جتنی ہی بد مزہ تھی مگر قیمتوں میں زمین آسمان کا

فرق تھا۔ ہم وہاں کافی دیر بیٹھے رہے اور جوش کے ”دوستوں“ کے ساتھ تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔ مثلاً

پاکستان میں آجکل چرس کا کیا بھاد ہے؟ وہاں کے ملنگ بھنگ میں بادام کیوں استعمال کرتے

ہیں؟ میں نے انہیں جو کالیاں کے قریب ”بیٹے“ یعنی دریائی جنگل میں پائی جانے والی خود رو بھنگ کے بارے میں بتایا کہ کس طرح وہاں چرنے والی بھینسیں کبھی کبھار آنکھیں موند کر جھومنے لگتی ہیں۔

مانزا سے پچھلے پہر باہر نکلے تو دھوپ ڈھل چکی تھی اور شہر کی نہروں کے کنارے خوب رونق تھی۔ روکن نہر کے کنارے لوگوں کا ایک ہجوم پانی میں جھانک رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ نہر میں ایک کارگر گئی تھی جسے کرین کی مدد سے نکالا جا رہا ہے۔ ایمسٹرڈیم میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی موڑ یا گھاٹی پر ڈرائیور نے بروقت کار آہستہ نہ کی اور سیدھا نہر میں سدھارا۔ اس حادثے میں ہمیشہ کی طرح ڈرائیور بچ گیا تھا اور کنارے پر کھڑا کرین والوں سے استدعا کر رہا تھا کہ کار میں کرین کا کنڈالگاتے وقت احتیاط برتی جائے۔ وہ بڑی مشکل سے یہ کار ایک شام کے لیے اپنے باپ سے مانگ کر لایا تھا۔

”مستنصر“ جوش نے مجھ ٹھوکا دیا۔ ”وہ لڑکیاں دیکھ رہے ہو؟ مشرقی لگتی ہیں۔“ شلوار قمیض میں ملبوس دو پاکستانی لڑکیاں پل سے نیچے پانی میں جھانک رہی تھیں۔ میں ان کے پاس چلا گیا۔

”آپ پاکستان سے آئی ہیں؟“ مدت بعد وطن کے جانے پہچانے لباس کو دیکھ کر مجھے بے انتہا مسرت ہو رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ مجھے وطن کے بارے میں کچھ بتائیں۔

”جی ہاں۔“ ان میں سے ایک نے بڑے روکھے پن سے جواب دیا اور منہ پھیر لیا۔ اس سے قبل کہ میں کچھ اور کہتا دوسری محترمہ نے چمک کر کہا ”آپ کو فلرٹ کرتے شرم نہیں آتی؟“ میں رو ہانسا ہو کر واپس چلا آیا۔

”کیا بات ہے دوست؟“ جوش نے مجھے واپس آتے دیکھ کر پوچھا۔ ”کامیابی نہیں ہوئی؟“

”یہ بات نہیں وہ ہندوستانی ہیں۔“ میں نے جھوٹ بول دیا۔ ”چلو واپس ہوٹل چلتے ہیں۔“

”ہوٹل؟ بالکل نہیں۔ ایمسٹرڈیم کی خوبصورتی شام کو ہی تو نکھرتی ہے۔ آج میں تمہیں ایک ایسے ریسٹوران میں لے چلتا ہوں جہاں شاید ہی کوئی پاکستانی گیا ہو۔“ اس نے میرا ہاتھ پکڑ

کر کہا۔ میں نے چلتے چلتے پل پر نگاہ ڈالی۔ وہ پاکستانی لڑکیاں ابھی تک وہیں کھڑی تھیں مگر اب ان کے پاس دو سفید فام سیاح بھی تھے جن کے ساتھ وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔

روکن نہر کے کنارے چلتے ہوئے ہم دائیں ہاتھ پر واقع ایک زریز مین ریسٹوران کی سیڑھیاں اتر کر اندر چلے گئے۔ ریسٹوران میں مجھے کوئی ایسی غیر معمولی خوبی یا برائی نظر نہ آئی کہ وہاں پاکستانیوں کا گزر رہی نہ ہو سکے۔ بلکہ ریسٹوران کا تمام عملہ مشرقی شکل و صورت کا تھا۔ سیاہ بال، پست قد اور چوڑی ناکیں۔

”وات دو یولانک سر؟“ ایک ویٹر نے جھک کر دریافت کیا۔ اس کا لہجہ اطالوی لگتا تھا۔ ”تمہیں معلوم ہے؟“ جوش نے ویٹر سے مخاطب ہو کر بڑے ٹھٹھے سے کہا۔ ”میرے دوست کا نام حسین ہے۔“

”حسین؟“ ویٹر کے ہاتھ سے مینو کا رڈ گرتے گرتے بچا۔

”ہاں حسین۔ لیکن اردن والا نہیں۔ یہ میرا دوست ہے اور پاکستان سے آیا ہے۔“

”خوش آمدید جناب۔“ ویٹر نے خوش دلی سے کہا۔ ”آپ پہلے پاکستانی ہیں جو اس

اسرائیلی ریسٹوران میں تشریف لائے ہیں۔“

”اسرائیلی؟“ اب میرے حیران ہونے کی باری تھی۔

”سراسر اسرائیلی۔“ جوش نے ہنس کر کہا۔ ”تمہی نے تو کہا تھا۔ میں سیاح ہوں۔

ذات صفات اور بھیس پر یقین نہیں رکھتا۔“

سامنے دیوار پر ستارہ داؤد سے مزین اسرائیل کا سفید اور نیلا جھنڈا آویزاں تھا۔ اس

کے اوپر بین گورین کی تصویر تھی۔ میں نے غور کیا تو برتنوں پر بھی نیلا ستارہ بنا ہوا تھا۔

”میں نے تمہارے لیے اسرائیل کی ایک روایتی خوراک منگوائی ہے۔“ جوش نے ویٹر

کو آؤ رکھاتے ہوئے مجھے بتایا۔

یہ روایتی خوراک خستہ نان گوشت کے ٹکڑوں اور تیز سرخ مرچوں پر مشتمل تھی۔

”اصل میں یہ فلسطینی عربوں کی مرغوب غذا تھی۔ اسرائیلیوں نے اسے اپنا لیا۔“ جوش مرچوں کے

چٹکارے لے رہا تھا۔

”ہاں جب پورا ملک ہتھیالیا جائے تو غذا اپنانے میں کیا حرج ہے۔“ میں نے سنجیدہ

ہو کر کہا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پلیٹ میں سرخ مرچیں نہیں بلکہ مظلوم عربوں کا خون جما ہوا ہے۔

”یہاں سیاست پر گفتگو کرنا منع ہے۔“ جوش نے مینو کارڈ کی آخری سطر پر انگلی رکھ کر کہا۔

”کیا یہاں انسانیت کے بارے میں گفتگو کرنا بھی منع ہے؟“ میرے لہجے میں تلخی کا عنصر تھا۔ ”تم نے آزاد اسرائیلی ریاست امریکہ کے کسی کو نے میں کیوں نہ قائم کی؟ سوڈن کا شمال بھی تو بے آباد پڑا تھا۔ بیلفور کی نظریں آسٹریلیا کے ویرانوں پر کیوں نہ پڑیں؟ کیا یہ ضروری تھا کہ تم لاکھوں بے گناہوں کو بے گھر کر کے فلسطین میں ہی اپنے قدم جماتے؟“

ریستوران کے تمام ویٹر ایک کونے میں کھڑے ہو کر ہمیں شک کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

”بھئی میں اسرائیل کی طرف داری تو نہیں کر رہا۔“ جوش کے لہجے میں پشیمانی تھی۔ ہم نے جلدی سے بل ادا کیا اور باہر آ گئے۔

”تمہیں معلوم ہے۔“ جوش نے غمزہ ہو کر کہا۔ ”سبھی یہودی اسرائیل کے قیام کو برحق نہیں سمجھتے۔ میں خود اس بات کا حامی ہوں کہ عربوں اور یہودیوں کو امن و آشتی سے رہنا چاہئے۔ میں ظلم کے خلاف ہوں چاہے وہ اسرائیل میں ہو یا وہیت نام میں۔“

”یا کشمیر میں!“ میں نے گرہ لگائی۔

”بالکل۔“ وہ ہنس دیا۔ ”چلو اب ایسی جگہ چلتے ہیں جہاں اکثر پاکستانی جاتے ہیں۔“

”تھار بک پلان“ چوک کے گرد و نواح میں ایسٹریڈیم کی شبینہ زندگی کی جھلکیاں اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ گر تھیں۔ چوڑی سڑک کے دونوں طرف کلبوں، شراب خانوں اور ہوٹلوں کی بھرمار تھی۔ ہر کونے پر کسی نہ کسی محترمہ سے پالا پڑ جاتا جن کے لبوں پر ”وانٹ گڈ ٹائم“ کا استفسار ہوتا۔ ہیمبرگ کی ریپا بہان کی طرح یہاں بھی اکثریت سیاحوں اور ملاحوں کی تھی۔ صبح سے اب تک ہمارا زیادہ وقت پیدل چلنے میں صرف ہوا تھا اور میں اب بے حد تھک چکا تھا۔ جوش کو واپس ہوٹل چلنے کے لیے کہا تو سامنے اشارہ کر کے کہنے لگا ”میرے ایک ڈچ دوست نے اس کلب کے

”نئے پن“ کی تعریف کی تھی۔ ذرا اندر جھانک لیں پھر چلتے ہیں۔“

جوش نے صرف جھانکنے پر اکتفا نہ کیا بلکہ ٹکٹ خرید لیے اور ہم اندر چلے گئے۔ ایک نیم تاریک کمرے میں سٹیج کے سامنے چند میزیں لگی تھیں جن پر بیٹھے ہوئے لوگ مے نوشی میں مصروف تھے۔ ہم بھی ایک کونے میں بیٹھ گئے اور ویٹر کے اسرار کے باوجود شیمپین کی بجائے صرف کوکا کولا کا آرڈر دیا۔ تمام میزیں مردوں سے پر تھیں جو ایک دوسرے سے نہایت بے تکلفی اور پیار سے بات چیت میں مصروف تھے۔ عورتوں کی غیر موجودگی بے حد معنی خیز تھی۔

ایک دم سٹیج پر تیز برقی قہقہے جل اٹھے اور ایک موٹے ڈچ نے کھڑے ہو کر شو کے شروع ہونے کا اعلان کیا۔ سب سے پہلے ایک نہایت حسین محترمہ وارد ہوئیں۔ انہوں نے گھٹنوں تک لمبا بھڑکیلا سرخ لباس پہنا ہوا تھا اور سنہری بالوں کے جہازی سائز جوڑے میں پرندوں کے رنگ برنگے پرانکار کئے تھے۔ گانے سے دل چونڈنے لگی تھی اس لیے میرے پلے تو کچھ نہ پڑا البتہ سامعین نے دل کھول کر داد دی۔ گانے دو۔ ان میں مجھے ایک عجیب قسم کی بے چینی محسوس ہوئی جیسے یہ سب کچھ نقلی ہو اور کہیں نہ کہیں کوئی غلطی رہ گئی ہو۔ اس کے بعد تین لڑکیوں نے ایک بے حد ہیجان خیز رقص پیش کیا۔ میری بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ رقص کے بعد ایک لمبی تزنگی لڑکی سٹیج پر آئی اور مانیکر فون کو ہاتھ میں لے کر گانا شروع کر دیا۔ اب موسیقی نہایت جیسے سرس میں بچ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے گانا بند کر دیا اور موسیقی کی دھن پر بلاؤز کے ٹپن کھول کر لباس اتارنا شروع کر دیا۔ تماشائیوں نے اس حرکت کا استقبال نعروں اور سیٹیوں سے کیا۔ میں نے منہ پھیر لیا اور جوش سے باہر چلنے کے لیے کہا۔ وہ شو کے خاتمے تک بیٹھنا چاہتا تھا۔ میں کرسی سے اٹھا اور دروازے کی جانب چل دیا۔ یکدم تماشائیوں نے تالیاں پیٹ پیٹ کر کمرہ سر پر اٹھالیا۔ میں نے مرکز سٹیج کی جانب دیکھا۔ وہاں صرف لنگوٹ میں ملبوس ایک جوان لڑکا کھڑا تھا جو جھک کر تماشائیوں کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں زنا نہ کپڑے اور دوسرے میں نقلی بالوں کی ایک وگ تھی جو اس نے حسین لڑکی کا روپ دھارتے ہوئے پہن رکھی تھی۔ اب مجھے اپنی بے چینی کا جواز ملا۔ شو میں گانے اور ناچنے والے سب نو خیز لڑکے تھے جنہوں نے تماشائیوں کے ایک خاص ”جذبے“ کی تسکین کی خاطر عورتوں کا سوا نگ بھر رکھا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے ابھی قے ہو جائے گی۔ میں جلدی سے باہر آ گیا اور پیدل ہی ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔

نہروں کے کنارے مکمل خاموشی اور سکون تھا۔ شاہراہوں کی روشنیاں گل ہو چکی تھیں۔ مدہم چاندنی میں سفید گھروں اور پلوں کے آہنی جنگلے میں جھول رہے تھے۔ میں اتنی ساری خوبصورتیوں کو چھوڑ کر اس جہنم میں چلا گیا تھا جہاں بے راہرو مردوں، آوارہ عورتوں اور بدنام کلبوں نے ایسٹریڈیم کے حسین شہر کو داغدار کر دیا تھا۔

نہریں اور زرد کلیاں

اگرچہ ہالینڈ کے زمینی مناظر میں پرشکوہ اور حیرت انگیز عناصر کا فقدان ہے مگر یہاں کے باشندوں میں فن اور خوبصورتی کا شعور کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ان کا اعلیٰ ذوق روزمرہ کی زندگی اور رہنے سہنے کے طریقوں میں پوری طرح اجاگر ہے۔ شاندار طرزِ تعمیر، دیدہ زیب روایتی لباس، گھروں کی سجاوٹ اسی فہم کا حصہ ہے۔ اہل ہالینڈ کی ان فنکارانہ صلاحیتوں نے دنیا کے عظیم ترین مصوروں کو جنم دیا۔ فرانس ہال، پیٹر ہوگ، ریمرانت، روسوڈل، جان شین، درمیر اور خان گوگ ہیمل مصوری کے ستون مانے جاتے ہیں۔ ایسٹریڈیم کا رانک میوزیم یورپ کے بہترین عجائب گھروں یعنی لینن گراڈ کے ہرے تاڑ، پیرس کے لوور، لنڈن کی نیشنل گیلری، فلارنس کے اوفیچی اور میڈرڈ کے پراڈو کا ہم پلہ شمار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ میونخل میوزیم میں جدید مصوروں کے شاہکار دیکھے جاسکتے ہیں۔ آج کا دن میں نے انہی دو عجائب گھروں کو دیکھنے کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔

جو شعور پچھلی شب خاصی دیر سے واپس لوٹا تھا، ابھی تک سو رہا تھا۔ میں نے اسے جگانا مناسب خیال نہ کیا اور تیار ہو کر میونخل میوزیم کی طرف چل دیا جو ہوٹل کا ک کے نزدیک واقع تھا۔

عجائب گھر کے دفتر میں مجھے اپنی برساتی اور کیمرے جمع کروانے پڑے۔ کیمرے اس لیے کہ فوٹو گرافی ممنوع تھی اور برساتی میں کسی شاہکار تصویر کو لپیٹ کر فوچر ہوا جاسکتا تھا۔ میں

نے نکت کے ساتھ تصاویر کی فہرست بھی خرید لی۔ پکا سوشال لائٹرک، گوگین اور پھر فان گوگ میں نے اسی ترتیب سے عجائب گھر کے مختلف کمرے دیکھنے شروع کر دیے۔ اکثر تصاویر نہایت عامیانہ تھیں اور مجھے متاثر نہ کر سکیں۔ جدید مجسموں کے حصے پر کباڑ خانے کا گمان ہوتا تھا۔ زنگ آلود برتن، آہنی تاریں، ٹوٹی ہوئی سائیکلس، ناز اور نہ جانے کیا کیا ابلا جوڑ کر "زندگی کیا ہے؟" کا عنوان دے دیا گیا تھا۔ لوہے کے سینکڑوں ٹکڑے ٹکڑے کینوس پر چپکا کر "مشکلات" کا نام دے دیا گیا تھا۔ میں فنون لطیفہ کی اس شعبہ بازی کو دیکھ کر باہر برآمدے میں آ گیا اور مخالف سمت میں واقع بڑے دروازے سے گزر کر ایک وسیع اور روشن کمرے میں داخل ہو گیا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں تیز رنگوں کے ایک جنگل میں آ نکلا ہوں۔ رنگوں کی بوچھاڑ سے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ سرو کے گہرے سبز درختوں نے میرا گھیراؤ کر لیا۔ میں جوارو مکئی کے رُود پہلی کھیتوں کی باس سوگھ رہا تھا۔ میرے چاروں طرف سورج مکھی کے زرد چمکیلے پھول کھل رہے تھے۔ سامنے سورج ایک آتشیں سیال گولے کی مانند نیلگوں آسمان کو چھید رہا تھا۔ یہ مشہور مصور وینسٹ فان گوگ کی تصاویر تھیں۔ میں اس سے پہلے یہ تصاویر مصوڑی کے رسالوں میں دیکھ چکا تھا مگر میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اصل اور نقل میں اتنا حیران کن فرق ہوگا۔ فان گوگ کی تصاویر کو اصل روپ میں ہی دیکھ کر اس کی عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

فان گوگ 1853ء میں پیدا ہوا۔ اس کی طبیعت میں شروع سے ہی لالابالی پن اور بے چینی کا عنصر نمایاں تھا۔ اسے مصوری سے جنون کی حد تک عشق تھا اور بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ وہ اپنے عشق میں ان حدود کو بھی پھیلا لگ گیا۔ مزدوروں اور کسانوں کی تصاویر بناتے وقت اسے احساس ہوا کہ تصاویر کو حقیقت سے قریب تر لانے کے لیے ذاتی طور پر ان تجربوں میں سے گزرنا لازمی ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ بلجیم جا کر کچھ عرصہ کوئلے کی کانوں میں بطور مزدور کام کرتا رہا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اس نے مصوری چھوڑ کر پادری بننے کا ارادہ کر لیا۔ یہ دور عارضی ثابت ہوا۔ پیرس میں قیام کے دوران میں اسے اس وقت کے غیر معروف مصوروں ڈیگاس، مانے، مونے، بیزان، سیورٹ اور گوگین سے ملنے کا اتفاق ہوا جو مصوری کی سابقہ روایات سے بغاوت کر کے اپنی تصویروں کو شوخ و شنگ رنگوں سے سیراب کر رہے تھے۔ ان دنوں گہرے اور سیاہی مائل رنگ استعمال کیے جاتے تھے۔ تیز رنگ لگانے والے مصور نقادوں کی نظروں میں

صرف کھنڈرے بچوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کھنڈرے بچوں نے جن میں فان گوگ بھی شامل تھا، مصوری کی ایک نئی طرز اثر پرستی (Impressionism) کی بنیاد رکھی جس میں تصویر کے مجموعی تاثر پر زور دیا جاتا تھا۔ فان گوگ کی مصوری کا سنہری دور جنوبی فرانس کے قصبے آرلز میں شروع ہوا۔ وہ ہر صبح خالی کینوس اور رنگ لے کر باہر نکل جاتا اور آرلز کے چمکتے سورج کے تلے مکئی اور جو کے لہلہاتے کھیتوں، سرو کے درختوں اور ٹیڑھی پگنڈیوں کی نقاشی کرتا۔ وہ کسانوں سے کہتا "جیسے تم کنواری زمین میں ہل جوت کر خوراک پیدا کرتے ہو اسی طرح میں بھی اپنے خالی کینوس پر برش کا ہل چلا کر رنگوں کی فصیلیں اُگاتا ہوں۔" اس کی تصویریں گرمیوں کی چٹنی ہوئی دوپہروں کے سورج کی دیوانگی سے بھرپور تھیں اور اسی سورج نے اسے سچ بچ دیوانہ کر دیا۔ جب ریشل نامی ایک طوائف نے تفریحاً اس کے کان کا تحفہ مانگا تو محبت کے بھوکے اور دیوانے فان گوگ نے اسی وقت استرے سے اپنا کان کاٹا اور یہ کہہ کر اپنی محبوبہ کے حوالے کر دیا "دیوانگی میں بھی مسرت ہے جسے صرف دیوانے ہی جان سکتے ہیں۔"

اس کا بڑا بھائی بوجی پیرس میں ایک تصویریں فروخت کرنے والی دکان پر ملازم تھا۔ اپنے بھائی کی یہ حالت نہ دیکھ سکا اور اسے سینٹ ریے کے پاگل خانے میں داخل کروا دیا۔ فان گوگ پاگل خانے میں بھی مصوری کرتا رہا۔ میونسپل میوزیم کے متعدد کمروں میں فان گوگ کے پیرس، آرلز اور سینٹ ریے دور کی کئی تصاویر رکھی ہیں۔ ان میں ایک حساس مصور کی آہستہ اور تکلیف دہ نشوونما کی پرچھائیاں ہیں۔ تخلیقی جدوجہد کی آگ جلانے رکھنے کی کوشش، پھر اظہار کی چٹنگی کی طرف ایک قدم پیرس کا تغیر، آرلز کا جذباتی دھماکہ اور آخر میں سینٹ ریے کا دردناک انجام جو اس کی ایک تصویر میں ایک اندھی پگنڈی کی صورت میں دکھایا گیا ہے۔

ایک فان گوگ کو احساس ہوا کہ اُس کے اندر تخلیق کی جو آگ بھڑک رہی تھی وہ سرد ہو رہی ہے۔ وہ پہروں ہاتھ میں برش تھا بے خالی کینوس کو گھورتا رہتا مگر ایک ہلکا سا خط بھی نہ لگا پاتا۔ ایک چٹنی دوپہر کو جلتے سورج کے نیچے اپنے پیار سرو کے درختوں اور سنہری کھیتوں کے درمیان فان گوگ نے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ اس کے بھائی سمیت جنازے میں صرف سات افراد شریک ہوئے۔ تدفین سے قبل لیونے اپنے بھائی کی لاش کے گرد اس کی بنائی ہوئی خوبصورت تصاویر سجادیں۔ کمرے میں رنگوں کا ایک سیلاب اُٹھ آیا جس کے درمیان فان گوگ کا بے جان جسم

پڑا تھا۔ شاید میوزیم کے ان کمروں میں وہی تصاویر ہیں جو فان گوگ کی لاش کے گرد بچی تھیں۔ فان گوگ آواز کے قبرستان میں سورج کبھی کے چمکیلے پھولوں کے سائے میں دفن ہے۔

میوزیم سے باہر نکلا تو بوندا باندی شروع ہو گئی۔ میں نے اپنی برساتی اوڑھ لی اور دوپہر کے کھانے کے لیے مانزار یستوان کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ قومی یادگار کی سیڑھیاں خالی پڑی تھیں اور وہاں اوگھنے والے پتی بارش سے بچاؤ کی خاطر ٹاؤن ہال کے برآمدوں میں پناہ لے چکے تھے۔ مانزا کا سستا اور بد مزہ کھانا لنگے کے بعد میں نے رانک میوزیم کا رخ کیا۔

رانک میوزیم میں دوسرے ڈچ مصوروں فرانز ہال، جان شٹین اور ورمیر کے علاوہ عظیم ریمبرانت کے درجنوں شاہکار رکھے ہیں جن میں ”نائٹ واچ“، ”سرفہرست ہے۔ اگرچہ اس تصویر کو مونا لیزا کے خالق ڈی ونچی کی ”لاست سپر“ اور مائیکل اینجلو کی ”لاست جج منٹ“ کے ہم پلہ سمجھا جاتا ہے مگر مجھے یہ تصویر بالکل متاثر نہ کر سکی۔ اسے میری کم فہمی جانے لیکن اگر ریمبرانت کا نام اس سے وابستہ نہ ہوتا تو میں شاید اسے دیکھے بغیر گذر جاتا۔ البتہ مجھے ریمبرانت کی بنائی ہوئی ”ماں کی تصویر“، ”یہودی دلہن“ اور ”شادی شدہ جوڑا“ جو اس کے بیٹے ٹائکن کی شادی پر بنائی گئی تھی بے حد پسند آئیں۔

رانک میوزیم کے درجنوں وسیع ہال سرسری طور پر دیکھ کر میں باہر آ گیا۔ اب میری منزل مصور ریمبرانت کا گھر تھا جو ”جوڈن بریس سترات“ یعنی یہودیوں کی گلی میں واقع تھا۔ ریمبرانت جو مائیکل اینجلو اور ڈی ونچی کے بعد یورپ کا سب سے بڑا مصور شمار ہوتا ہے۔

ریمبرانت وان رائن لائنڈن شہر میں ایک ہوائی چکی چلانے والے کے گھر پیدا ہوا۔ اسے یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا مگر ریمبرانت پڑھائی چھوڑ کر ایسٹرڈیم چلا گیا اور وہاں ایک سٹوڈیو بنا کر مصوری شروع کی دی۔ بہت جلد وہ شہر کے امیر سوداگروں کا پسندیدہ مصور بن گیا اور تصویروں کی آمدنی جوڈن بریس سترات میں یہ خوبصورت گھر خریدنے میں معاون ثابت ہوئی۔ مگر یہ شہرت اور امارت عارضی تھی۔ ریمبرانت تاجروں کی تصاویر بناتے وقت ان کی سرمایہ دارانہ خباثت اور کاروباری فریب کو ان کے چہروں پر اجاگر کر دیتا۔ ان امیر تاجروں کو بھلا حقیقت سے کیا سروکار ہو سکتا تھا وہ تو صرف خوبصورت تصاویر چاہتے

تھے چاہے ان کی اپنی شکل و صورت کر یہہ انظر ہی کیوں نہ ہو۔ تاجروں کی گاہکی منقطع ہونے پر اس کی آمدنی بالکل ختم ہو گئی اور بالآخر اسے یہ گھر بیچ کر ایک پرانے اور گندے محلے میں زندگی کے آخری ایام بسر کرنے پڑے جہاں لوگ اس کی تصویروں کا مذاق اڑاتے اور اسے خبطی بوڑھا کہہ کر پکارتے۔ غربت و افلاس کے پہلو بہ پہلو کئی اور آفتوں نے ڈیرے ڈال دیے۔ اس کی بیوی اور چاروں بچے یکے بعد دیگرے مر گئے۔ بوڑھا اور بے سہارا ریمبرانت فاقہ کشی کی حالت میں بھی تصویر کشی کرتا رہا۔ ریمبرانت کا دوست اور ڈاکٹر فان لون ایک کتاب میں لکھتا ہے۔ ”جب ریمبرانت مرا تو اس کے گھر سے اتنے پیسے بھی نہ نکلے جن سے اسے دفن کرنے کے لیے لکڑی کا ایک تابوت بنوایا جاسکتا۔ چند پیشہ ور گورکن جو اس وقت شراب کے نشے میں مدہوش تھے اس کی لاش ایک عام کپڑے میں لپیٹ کر کسی غیر معروف قبرستان میں دفن کر آئے۔“

ڈھائی سو برس پیشتر ریمبرانت اسی گھر میں اپنی بیوی سا سکیا اور بیٹے ٹائکن کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ گھر کی پہلی منزل میں کھانے کے کمرے کی میز اور کرسیاں جوں کی توں پڑی ہیں۔ وہ کرسی جس پر ریمبرانت شام کے وقت آرام کرتا تھا۔ دوسری منزل میں ایک چھاپہ خانہ ہے جہاں وہ تیزاب کے ذریعے تاجے پر نقش و نگار بنا کر کاغذ پر چھاپا کرتا تھا۔ چھاپہ خانے اور گھر کے دوسرے حصوں میں ریمبرانت کے بنائے ہوئے خاکے لٹکے ہیں جن میں سے چند ایک ادھورے ہیں۔

میں ریمبرانت کے گھر سے باہر نکلا تو بارش تھم چکی تھی۔ نہروں کے کنارے ایلیم اور لائم درختوں کے تلے چلنے والے لوگ ابھی تک چھتیاں تانے ہوئے تھے۔ ہوا کا ہلکا سا جھونکا آتا تو درختوں کے پتوں پر جمع شدہ پانی لوگوں پر برس پڑتا۔ میوزیم اور رانک میوزیم کے درجنوں ہال کمروں میں سارا دن گھومنے سے میں تھک چکا تھا۔ اس لیے سرشام ہی واپس ہوئل روانہ ہو گیا۔ ہوئل کے ہال میں جوش پہلے روز کی طرح کھانے کے کاؤنٹر پر بیٹھا بیٹری رہا تھا۔ وہ آج ایسٹرڈیم کے مشہور زمانہ ہیروں کی تراش خراش کے کارخانے دیکھنے گیا ہوا تھا۔ میں نے مذاق سے پوچھا کہ سناؤ کوئی چھوٹا موٹا ہیرا بھی ہاتھ لگا یا نہیں؟ منہ لٹکا کر کہنے لگا کہ کوشش تو بہت کی تھی لیکن وہ جوہری کجخت نہایت کانیاں ہیں۔ فرش پر پڑے برادے اور کاغذوں کو بھی ہاتھ نہیں لگانے دیتے۔ ہر شام کام ختم ہونے پر تمام کوڑا کرکٹ جمع کر کے ایک آہنی انگلیٹھی میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اس طرح کاغذ اور برادہ وغیرہ تو جل جاتا ہے اور تراش خراش کے دوران گمشدہ ہیرے

کی کنیاں انگیٹھی کی تہ میں جوں کی توں پڑی مل جاتی ہیں۔

دوسری جنگ عظیم میں ہالینڈ پر قبضے کے دوران میں نازیوں نے یہاں کی نوے فیصد یہودی آبادی کو بڑی بے دردی سے تہ تیغ کر دیا۔ ان میں ایک ننھی مٹی لڑکی بھی تھی جس کے معصوم جسم میں موت زہر ملی گیس کے دھوئیں کی صورت میں سرائت کر گئی۔ ہالینڈ میں ہٹلر کے منصوبے ”آخری حل“ کے تحت تمام یہودیوں کا باقاعدہ قتل عام شروع ہوا تو وہ ننھی لڑکی اور اس کا خاندان جان بچانے کی خاطر اپنے مکان کی بالائی منزل کے کمروں میں روپوش ہو گئے۔ باہر سڑک سے یوں لگتا جیسے پورا مکان خالی پڑا ہے، لیکن ان دو کمروں میں آس اور امید کے دیے جلتے جن کی لو بڑھانے میں وہ لڑکی سب سے آگے تھی۔ اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک روز نازی اس کے پیارے شہر ایمسٹرڈیم سے باہر نکال دیے جائیں گے اور وہ ایک بار پھر آزادی سے اپنے گھر کے سامنے نہر کے کنارے سائیکل چلا سکے گی۔ وہ مکان کے پچھواڑے میں کھلتی ہوئی کھڑکی سے باہر نکلتی رہتی جہاں سے اسے صرف نیلے آسمان کا ایک ٹکڑا اور درخت کی چند شاخیں نظر آتیں جن سے اسے وقت اور موسموں کے تغیر و تبدل کا اندازہ ہوتا رہتا۔ شام ہوتی تو وہ ایک کونے میں لکڑی کے فرش پر بیٹھ کر موسیقی کی مدد سے روشنی میں اپنی ڈائری کے اوراق لکھتی۔ ”شاید بہار کی آمد ہے۔ میں نے آج کھڑکی میں سے درخت کی شاخوں پر چند سفید کلیاں دیکھی ہیں۔“

”خوراک کا ذخیرہ ختم ہونے کو ہے۔ میں نے دو روز سے کچھ نہیں کھایا۔ مجھے بے حد بھوک لگی ہے۔“

”آج ساری رات گھر کے باہر فٹ پاتھ پر جرمن سپاہیوں کے بھاری بوٹوں کی آواز سنائی دیتی رہی اور ہم میں سے کوئی بھی سونہ سکا۔ آخر مجھ میں اور دوسری چھوٹی لڑکیوں میں کیا فرق ہے جو نازی مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں۔“

ایک روز جرمن سپاہیوں کے بھاری بوٹوں کی آواز باہر فٹ پاتھ کی بجائے مکان کی چوبی سیڑھیوں پر سنائی دی۔ اس لڑکی کو اس کے خاندان سمیت ایمسٹرڈیم کے دوسرے یہودیوں کے ساتھ فوجی ٹرکوں میں بند کر کے ایک اجتماعی کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ دوسری صبح اس ننھی مٹی لڑکی کو برہنہ کر کے ایک آہنی کمرے میں دھکیل دیا گیا۔ اس کمرے کے پچھواڑے میں کوئی کھڑکی نہ کھلتی تھی جہاں سے نیلا آسمان نظر آسکے۔ چھت کے سوراخوں میں سے سفید کلیوں کی بجائے

زہریلی گیس کا سفید دھواں نکلا اور اس کا نازک جسم گیس چیمبر کے چمکیلے فرش پر تڑپنے لگا۔ این فرینک مر گئی۔

جنگ کے اختتام پر این فرینک کا باپ جو نازیوں کے ہاتھوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا، اپنے خاندان کی تلاش میں ایمسٹرڈیم واپس آیا۔ ویران مکان کے ایک کمرے میں این کی ڈائری کے اوراق بکھرے پڑے تھے۔ اس نے چند دوستوں کی مدد سے ”این فرینک کی ڈائری“ کو شائع کروا دیا اور راتوں رات این فرینک ایک گمنام لڑکی سے یورپ میں یہودیوں پر ڈھائے جانے والے نازی مظالم کی علامت بن کر ابھری اور پوری دنیا کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

ہم این فرینک کے گھر کے سامنے کھڑے تھے۔ یہ مکان جسے اب عجائب گھر کی شکل دے دی گئی ہے، نہر کے کنارے پر واقع دوسرے مکاناتوں سے کسی طور مختلف نہ تھا۔ سوائے دروازے پر آویزاں ایک چھوٹی سی تختی کے جس پر ”این فرینک ہاؤس“ کے الفاظ لکھے ہیں۔ ہم لکڑی کی بنی ہوئی تنگ سیڑھیوں پر احتیاط سے قدم رکھتے بالائی منزل پر چڑھنے لگے۔ انہی سیڑھیوں پر جرمن سپاہیوں کے بھاری بوٹوں کی آواز نے این فرینک کو موت کا پیغام سنایا تھا۔ این کے کمرے کی کھڑکی اسی طرح کھلی ہوئی تھی۔ باہر نیلا آسمان اور درختوں کی ہری بھری شاخیں نظر آ رہی تھیں مگر ان پر سفید کلیاں نہیں تھیں۔ موسم بہار گزر چکا تھا۔ کمرے کی دیواروں پر این کے ہاتھوں کی اخباروں سے تراشی ہوئی تصاویر چسپاں تھیں۔ مجھے وہاں اس چھوٹے سے ویران کمرے میں کھڑے ہوئے این فرینک کی بے بسی اور تنہائی کا بڑی شدت سے احساس ہوا۔

مکان کی پہلی منزل پر ”این فرینک فاؤنڈیشن“ کا دفتر ہے جس کی لائبریری میں این فرینک کی ڈائری کے دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کیے ہوئے نسخے موجود ہیں۔ دیواروں پر این اور اس کے خاندان کی تصاویر آویزاں ہیں۔ فاؤنڈیشن کے ایک رکن نے مجھے بتایا کہ ان کا ادارہ ماضی میں کیے گئے مظالم کی تلافی حال میں ہونے والے مظالم کو روکنے کی صورت میں کر رہا ہے۔ اس کا ثبوت وہ پوسٹر اور تصاویر ہیں جو ویت نام میں امریکی مظالم کے بارے میں شائع کیے گئے ہیں۔ ادارہ اسی مکان کے پہلو میں ”این فرینک ہوسٹل“ بھی چلاتا ہے۔ جہاں سیاح معمولی کرائے کی ادائیگی سے قیام کر سکتے ہیں۔ میں نے ”ملاقاتیوں کے رجسٹر“ میں اپنا نام و پتہ درج کیا اور چندے کے صندوق میں دو گلدڑ کا سکہ ڈال کر باہر آ گیا۔

مکان کے باہر شہر کی زندگی اسی طرح رواں تھی۔ نہر کے کنارے فٹ پاتھ پر ایک کالے بالوں والی مٹی لڑکی سائیکل چلا رہی تھی۔ اس نے لکڑی کے بنے ہوئے ڈچ طرز کے ”کلائم“ جوتے پہن رکھے تھے۔ وہ میرے پاس سے گزری تو میں نے مسکرا کر ”ہیلو“ کہا۔ اس نے شرارت سے سائیکل کی گھنٹی زور زور سے بجائی اور کھلکھلا کر ہنس دی۔

”این فرینک کے بال بھی تو کالے تھے۔“ میں نے سوچا۔

آج ایمسٹرڈیم میں میرا آخری دن تھا۔ میں دوسری صبح ہیگ اور برسلز سے ہوتا ہوا لنڈن جا رہا تھا۔ سینٹرل اسٹیشن سے سفر کا ایڈوائس ٹکٹ خرید کر میں منٹ ٹاور کے قریب پھولوں کے بازار کی طرف چلا گیا جہاں سے شہر کی مختلف نہروں کی سیر کے لیے خوبصورت کشتیاں چلتی تھیں۔ میں نے کنارے سے ٹکٹ خریدا اور ایک کشتی میں سوار ہو گیا۔ شیشے کی چھت اور آرام دہ نشستوں سے مزین خوبصورت کشتی غیر ملکی سیاحوں سے بڑھتی۔ وہ بھی میری طرح ایمسٹرڈیم کی نہروں کا حسن قریب سے دیکھنے آئے تھے۔ انجن شارٹ ہوئے۔ ڈرائیور نے بھونپو بجایا اور ہم نہر کی پرسکون سطح پر تیرنے لگے۔ کشتی کے سرے پر ہالینڈ کا پرچم لہرا رہا تھا۔ ہمارے دونوں طرف نہر کے کناروں پر خوبصورت شاہ بلوط چرواں پتوں والے ایلم اور لائٹ درختوں کی قطاریں تھیں جن کے پیچھے ایمسٹرڈیم کے قدیم تاجروں کے شاہانہ مکان کھڑے تھے۔ ان مکانوں کی قدیم وضع اور دیدہ زیب طرز تعمیر قائم رکھنے کی خاطر عمارت میں کسی قسم کا رد و بدل کرنا خلاف قانون ہے۔ اکثر مکان اب تجارتی اداروں اور بینکوں کے دفاتر کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

ہمارا گائیڈ بے حد دلچسپ تھا۔ نہروں کے کنارے پر واقع تاریخی عمارتوں اور قدیم پلوں کی نشاندہی کرنے کے علاوہ وہ چھوٹے چھوٹے چٹکے بھی بیان کرتا چلا جاتا۔

”خوابتین حضرات! کیا آپ کو معلوم ہے کہ ہالینڈ کے ایک باشندے پیٹر شائی دن نے دریائے ہڈن کے کنارے ایک شہر کی بنیاد رکھی اور اسے نیو ایمسٹرڈیم کا نام دیا؟ بعد میں اسے انگریزوں نے ہتھیالیا اور اپنے شہر یارک کا نام دے کر نیو یارک کر دیا۔“

”ہم کینیڈا کی طرف سے وارد ہو جاتے تو اب اس کا نام نیو پیرس ہوتا۔“ ایک فرانسیسی بوڑھے نے خوش دلی سے کہا۔

”دائیں ہاتھ والے مکان میں لوٹی پولین کا قیام تھا اور بائیں ہاتھ پر وہ جگہ ہے جو آج سے پانچ سو سال قبل ایک اصطبل تھی۔“

”اوہ واقعی؟“ ایک عورت نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ ”اور اب کیا ہے؟“

”اب بھی اصطبل ہے۔“ گائیڈ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”اور یہ ہے وہ کلیسا جس کی نقل پیرس میں کلیسائے نوٹر ڈیم کے نام سے مشہور ہے۔“

فرانسیسیوں نے اس بے عزتی پر خوب شور مچایا۔

”آپ ان چار منزلہ مکانوں کو تو دیکھ ہی رہے ہیں جن کے کمروں کی چوڑائی منزل بہ منزل گھٹتی چلی جاتی ہے۔ یہ پچھلی صدی کے ڈچ سوداگروں کے شاہانہ مکان ہیں۔ پہلی منزل پر بڑے کمرے میں گھر کا مالک اور اس کی بیوی قیام پذیر ہوتے تھے۔ دوسری منزل جو نبشتا چھوٹی ہے، بچوں کے لیے مخصوص تھی۔ تیسری منزل جس پر صرف ایک چھوٹا سا کمرہ ہے نوکروں کا کوارٹر تھا۔“

”اور آخری منزل پر کیا گھوڑے باندھتے تھے؟“ ایک لمبے ٹانگے امریکی نے سیاحوں کو محظوظ کرنے کی ناکام کوشش کی۔

”نہیں جناب۔“ گائیڈ نے کہا۔ ”چوتھی منزل کی چھوٹی کوٹھڑی ساس کو رکھنے کے لیے تھی۔“

”کس کی ساس؟ عورت کی یا مرد کی؟“ ایک امریکی عورت نے تزاخ سے پوچھا۔

”اگر امریکہ ہوتا تو یقیناً عورت کی ساس رکھی جاتی مگر ہم ترقی یافتہ ملک ہیں اس لیے یہاں مرد کی ساس کے رہنے کا انتظام تھا۔“

”اور یہ اوپر والی منزل پر لوہے کا کُنڈا کیا ساس کو لوٹکانے کے کام آتا تھا؟“ ایک موٹے جرمن نے قہقہہ لگاتے ہوئے پوچھا۔

”جی نہیں۔“ گائیڈ نے ہنس کر جواب دیا۔ ”اس کے ساتھ رسہ لٹکا کر سامان اوپر چڑھایا جاتا تھا۔ شہر میں تقریباً ساڑھے چار سو نہریں اور ان کی ذیلی شاخیں ہیں۔ ان نہروں پر ساڑھے پانچ سو پل ہیں۔“

”باقی سو پل کیا خشکی پر تعمیر کیے گئے ہیں؟“ کسی نے نعرہ لگایا۔

”یہ وہ پل ہے جہاں سے بیٹلز نے چھلانگ لگائی تھی۔ پلوں کے ساتھ آہنی کُنڈوں والے

لبے بانس اس لیے رکھے گئے ہیں تاکہ اگر کسی صاحب کا ہیٹ ہوا سے اڑ کر نہر میں جا گرے تو بانس کی مدد سے نکالا جاسکے۔

ہم یکے بعد دیگرے سات خوب صورت بچے سجائے پلوں کے نیچے سے گزرے۔ ان سات پلوں کو ”سات بہنوں“ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

”یہ پل صرف لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ سامنے والے پل کو ”مریل پل“ کہا جاتا ہے کیونکہ معمار کا نام SKINNY یعنی ”مریل“ تھا۔ یہاں سے پورے شہر کا گندا پانی بحر الکاہل میں سے ہو کر امریکہ پہنچ جاتا ہے۔“ امریکیوں نے اس بات کا بے حد برا منایا۔

اب شام ہو چکی تھی۔ نہروں میں چلتی ہوئی کشتیوں، درجنوں پلوں، سودا گروں کے شاہانہ مکانوں اور شاہ بلوط کے درختوں میں نصب شدہ قہقہے ایک دم جل اٹھے اور ہزاروں جھلمل جھلمل کرتی روشنیوں کا عکس پانی میں جھولنے لگا۔ شہر کی نہروں کا چکر پورا کرنے کے بعد جب کشتی ہمیں واپس بازار کے پاس واپس لائی تو ایمرسٹڈیم کی سرمئی شام گہری رات میں ڈھل چکی تھی اور ہر طرف چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ میں کشتی سے اتر اور ٹرام میں سوار ہونے کی بجائے پیدل ہی اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایمرسٹڈیم میں یہ میری آخری شام تھی۔ میں نے ایک پل پر سے نیچے جھانکا۔ دودھیا چاندنی کی تہ آسمانوں سے اتر کر ایمرسٹڈیم کی نہروں پر بچھ گئی تھی۔ لائم درختوں کے سرخ پتے اور زرد کلیاں پانی میں تیر رہی تھیں۔ میں پل کے ساتھ سیڑھیوں سے اتر کر نہر کے کنارے چلا گیا اور جھک کر شفاف پانی میں ہاتھ ڈال دیا۔ زرد کلیوں کا ایک گچھا بہتا ہوا آیا اور میری انگلیوں میں اٹک گیا۔ میں نے کلیوں کو بھیج لیا اور پانی سے نکال کر اپنے گالوں کو چھوا۔ ان میں خوشبو تھی۔ خوشبو خوبصورتی کی جو ایمرسٹڈیم میں تھی۔ خوشبو حسن کی جو میری نظر میں تھا۔

”جب موسم بہار کا آغاز ہوگا میں ایک مرتبہ پھر

اپنی محبوبہ کے لیے ایمرسٹڈیم سے گل لالہ لے کر آؤں گا

ہاں! ایک محبت بھرے دل کا تحفہ

میں تمہارے لیے ایمرسٹڈیم سے گل لالہ لے کر آؤں گا۔“

(ایک ڈچ لوک گیت)

شہر بے مثال۔ لنڈن

ایمرسٹڈیم کے سنٹرل سٹیشن سے ہیگ تک کا فاصلہ تیز رفتار ٹرین نے صرف پینتالیس منٹ میں طے کر لیا۔ میں سٹیشن پر اپنا سامان رکھ کر شہر کی سیر کو نکل گیا۔ یورپ والوں کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ہیگ یورپ کا سب سے بڑا قصبہ ہے اور اس کے باشندے کچھ نہ کرنے کو بہت کچھ سمجھتے ہیں۔ ”قصر امن“ جہاں عالمی عدالت کا اجلاس ہوتا ہے شہر کی واحد قابل ذکر عمارت ہے۔ میں پورا دن ہیگ میں گزارنے کے بعد شام کی گاڑی سے بلجیم روانہ ہو گیا۔ راستے میں روٹرڈیم کا شہر آیا جسے دوسری جنگ عظیم میں مکمل طور پر تباہ ہونے کے بعد از سر نو تعمیر کیا گیا۔ برجنٹ سے گزر کر بلجیم کے صدر مقام برسلز میں پہنچے جسے یورپ کے بد صورت ترین شہر کا خطاب ملنا چاہئے۔ رات کے ساڑھے دس بجے ہم بلجیم کے کسٹم سے فارغ ہو کر ہم ایک بجے چلنے والے سٹیٹس میں سوار ہو گئے اور رات کی تاریکی میں رودبار انگلستان عبور کر کے صبح ساڑھے چار بجے ڈوور پہنچ گئے۔ اگرچہ آج کل اکثر پاکستانیوں کو انگلستان میں داخلے کے لیے بے شمار دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن خلاف توقع برطانوی کسٹم کے حکام میرے ساتھ نہایت خوش اخلاقی سے پیش آئے اور بغیر کسی تردد کے میرے پاسپورٹ پر انگلستان میں چھ ماہ قیام کا اجازت نامہ ثبت کر دیا۔ کسٹم ہاؤس کے پہلو میں ڈوور کاریلوے سٹیشن ہے جہاں لنڈن جانے والی گاڑی تیار کھڑی تھی۔

میں آج کئی برسوں کے بعد پھر انگلستان کی سرزمین پر کھڑا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ ڈوور کا وہی پرانا اور کھرا لود سٹیشن جہاں سے میں گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران یورپ کی سیر کو جایا کرتا تھا۔ وہی آرام دہ اور قدامت کی بوسے رچی ہوئی گاڑی اور نیلی وردی میں

ملبوس کا کٹی ریلوے گارڈ۔ ہماری گاڑی جب ڈور سے نکلی تو سورج کی پہلی کرنیں انگلستان کے ہرے بھرے کھیتوں اور خوابیدہ قصبوں کو روشن کر رہی تھیں۔

وکتوریہ شیشین کے باہر کھڑی ہوئی لاتعداد نیکیوں اور کاروں کے ہجوم میں سے نکل کر جب میں سڑک پر آیا تو لنڈن ابھی تک پچھلی شب کے ہنگاموں کے بعد میری طرح نیم غنودگی کی حالت میں تھا۔ دودھ تقسیم کرنے والی لاریوں اور سڑکیں صاف کرنے والے ٹرکوں کے علاوہ ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ لنڈن میرے لیے اجنبی شہر نہ تھا۔ میں جانے پہچانے راستوں کو ماپتا ٹرافلگر سکور میں آ گیا۔ صبح کی ہلکی دھوپ ابھی تک چوک کے وسط میں ایستادہ بلند و بالا ستون کی چوٹی پر اکڑوں کھڑے لارڈ نیلسن کی ترچھی ٹوپی تک ہی آئی تھی۔ ٹرافلگر سکور کے مشہور زمانہ کبوتر بھی شاید ابھی تک نیشنل گیلری کے یونانی ستونوں اور سینٹ پال گر جا کے گنبد میں محو خواب تھے۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ٹورسٹ آفس کھلنے میں ابھی تین گھنٹے باقی تھے اور جب تک سیاحوں کا یہ خضر راہ دکھانے کے لیے ہاتھ نہ تھاے لنڈن جیسے شہر میں قیام و طعام کا مسئلہ حل نہ ہو سکتا تھا۔ میں پچھلے چوبیس گھنٹوں کے متواتر سفر سے خاصا تھک چکا تھا۔ میں نے بڑے فوارے کے سامنے ایستادہ ایک بیچ پر اپنا سامان رکھا اور وہیں لیٹ گیا۔ فوارے کے وسط میں ایک دیوار اچھلی کا مجسمہ گھمردے پھلائے منہ سے کیلوں پانی اگل رہا تھا۔ مجھے استنبول میں کانستپلان کے زیر زمین آبی محل کی گول گول آنکھیں منکاتی مچھلیاں یاد آ گئیں۔ شراپ! شراپ! جانے کب میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

مندروں کی سریلی گھنٹیوں اور ڈھولکیوں کی تھاپ کے سنگ بھجن گانے کی آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ ”ہری اوم“ ایک آواز آئی۔ مندر میں ہزاروں سندروں اور کوئل من موئی داسیاں محو رقص تھیں۔ ”ہری کرشنا“ ایک اور آواز آئی۔ پائل کی جھنکار نے میرے نیم خوابیدہ ذہن کے دروازوں پر چھن چھن دستک دی۔ یادداشت! میں نے لیٹے لیٹے سوچا یہ لنڈن کی بجائے کہیں بنارس میں درود تو نہیں ہو گیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں تو کسی کایاں ہندو پجاری کی بجائے میرے بیچ کے سرے پر ایک بوڑھا انگریز ہاتھ میں صبح کا اخبار تھانے اپنا پوپلا منہ نیم وا

کے میرے طرف دیکھ دیکھ کر مسکرائے جارہا تھا۔

”صبح بخیر“ اس نے اپنا بوسیدہ جیٹ سر سے اٹھا کر کہا ”ہری اوم۔ ہری کرشنا تمہارے ہم وطن ہیں شاید اور نیشنل گیلری کے سامنے والی سڑک کی طرف اشارہ کیا جہاں سے موسیقی اور بھجن الاپنے کی صدائیں آ رہی تھیں۔ پانچ انگریز لڑکے اور دو لڑکیاں ہندو براہمنوں اور مندروں میں رقص کرنے والی داسیوں کا روپ دھارے فٹ پاتھ پر ناچ رہے تھے۔ لڑکوں کے سر سوائے براہمنوں کی رواجی چٹیا کے مکمل طور پر منڈھے ہوئے تھے۔ ان بہروپیوں نے سفید دھوتیاں اور کھڑاویں پہن رکھی تھیں اور ہاتھوں میں گھنٹیاں اور گلے میں ڈھولکیاں لٹکائے وہ لہک لہک کر بڑے بے سرے انداز میں بھجن الاپ رہے تھے۔ آگے آگے ایک حسین اور متناسب جسم کی پستہ قد لڑکی صرف دھوتی میں ملبوس شانون پر بال بکھرائے ماتھے پر تلک جمائے مندروں کے رقص کی ایک بھدی نقل کر رہی تھی۔ ڈھولکی کی تھاپ پڑتی تو دودھیا باہیں فضا میں بلند ہوتیں اور وہ سب ہندوستانی رقص فراموش کر کے خالص مغربی انداز میں ”ہندو ناچ“ ناچنے لگتے۔ دوسری لڑکی ہاتھ میں پیتل کی گڈوی لیے اس تماشے کو دیکھنے والے ہجوم سے چندہ مانگ رہی تھی۔ ”لنڈن کے ہندو مندر کے لیے چندہ دیجئے۔ ہری اوم۔“ وہ کہہ رہی تھی۔ میں بھی بیچ سے اٹھ کر اس جلوس کے ساتھ ہولیا۔ لڑکی میری طرف آئی اور گردن کو ہلکا سا بل دے کر اپنے کھلے ہوئے بال اک ادا سے جھٹکے اور بولی ”مندر کے لیے چندہ۔“

”میں تو مندر ڈھانے والے قبیلے کا فرد ہوں“ میں نے شرارت سے کہا ”ہاں البتہ تم جیسی حسین داسی اس مندر میں ہو تو.....“ اور اس کی نیلی نیلی کاجل بھری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے وقوفی کی طرح مسکرانے لگا۔ لڑکی نے غصے سے پھر اپنے بال جھٹکے اور میری ساتھ کھڑے ہوئے امریکی سیاح کے آگے دست سوال دراز کر دیا۔

”شوزہنی (Sure Honey)“ بے شمار کیمروں سے لدے پھندے امریکی نے لڑکی کے چہرے سے نظریں ہٹائے بغیر اپنی جیکٹ کی لاتعداد جیبیں باری باری ٹولیں اور آخر کار دس شلنگ کا ایک نوٹ گڈوی سے ڈال دیا۔

یکدم مجھے یاد آیا کہ میرا سامان ابھی تک بیچ پر پڑا ہے کہیں وہ بوڑھا انگریز اسے لے کر چمپت ہی نہ ہو جائے۔ میں جلدی سے واپس آیا تو میرا سامان جوں کا توں پڑا تھا اور بوڑھا اپنا

اخبار پڑھنے میں محو تھا۔ میں نے سامان کندھے پر اٹھایا اور سڑک پار کر کے پکاڈلی کی طرف چل دیا جہاں ریجنٹ سٹریٹ میں ٹورسٹ آفس واقع تھا۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ آفس کھلنے میں ابھی چند منٹ باقی ہیں۔ باہر فٹ پاتھ پر بے شمار سیاح دفتر کھلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ پورے نو بجے دروازہ کھلا تو لوگ بھیڑوں کی مانند اندر گھس گئے اور جو میری طرح شرافت کے آداب کی خاطر تواضع میں مصروف رہے وہ باہر فٹ پاتھ پر ہی کھڑے رہ گئے۔ صبح سے دوپہر ہو گئی اور سیاحوں کے جم غفیر میں کوئی کمی نہ آئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اندر ٹورسٹ آفس نہیں بلکہ گرد و آوارہ صاحب ہے جہاں کڑاہ پر شاد تقسیم کیا جا رہا ہے خدا خدا کر کے میری باری آئی اور میں نے کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی لڑکی سے اپنا مدعا بیان کیا۔

”مجھے تقریباً دو ہفتوں کے لیے ارزاق قسم کی رہائش درکار ہے۔“

”تقریباً کتنی ارزاق؟“ لڑکی نے بے دلی سے پوچھا۔

”یہی کوئی دس شلنگ روزانہ“

اس نے مایوسی سے سر ہلایا جیسے کہہ رہی ہو کہ اے فقیر لندن میں دھرم شالے نہیں ہوتے اور پھر میز پر پرنسپل بجا کر بولی ”ناممکن۔ ہاں البتہ ایک پاؤنڈ اور دس شلنگ شاید“

”توبہ! توبہ!“ میں نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا ”بی بی اللہ میاں کو جان دینی ہے کیوں غریبوں کا خون کرتی ہو“ بی بی میرا وعظ سنے بغیر میرے پیچھے کھڑے سیاح کے ساتھ پیٹنگیں بڑھانے لگی اور میں باہر چلا آیا۔

”سن میری بلم سچ بول رہے اب کیا ہوگا؟“ میں نے دل سے سوال کیا۔

اب کیا ہونا ہے مورکھ؟“ دل نے کھٹ سے جواب دیا ”سو جانارات کو ہانڈ پارک میں اور چلے جانا صبح سویرے فرانس کے شہر پیرس میں جہاں رہتی ہے ایک شہزادی.....“ دل صاحب نے کچھ بے پرکی ہانگنی شروع کر دی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے چپ کرایا اور آلتی پالتی مار کر ریجنٹ سٹریٹ کے فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ اب میں منہ کھولے راہ چلتے لوگوں کو تنک رہا تھا کہ ہے کوئی سخی بابا جو لندن شہر میں رہائش کا بندوبست دس شلنگ میں کروادے۔ یکا یک میرے ذہن میں وحید چغتائی کا نام ابھرا جس کے ساتھ پاکستان میں ایک دعوت کی موقع پر مختصر سی ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے اسے اپنے سیاحت کے پروگرام کے بارے میں بتایا تو کہنے لگا، بادشاہواگر لندن

سے گزر ہو تو ضرور ملے گا۔ اور مجھے اپنا فون نمبر لکھ دیا۔ میں نے جھٹ ڈائری جیب سے نکالی اور فٹ پاتھ پر لگے فون بوتھ سے چغتائی کا نمبر ڈائل کیا۔

”ہیلو! چغتائی بول رہا ہوں۔“

”السلام وعلیکم چغتائی صاحب“ میں نے صاحب پر زور دیتے ہوئے کہا ”میں مستنصر

بول رہا ہوں۔“

”کون مستنصر؟“ ادھر سے آواز آئی۔ وہ یقیناً ہماری مختصر ملاقات بھول چکا تھا۔“

اجنبیوں پر بار خاطر بننے کی بجائے ہانڈ پارک میں سو جانا، دل نے پھر ٹانگ اڑائی۔ میں نے سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنا تعارف کروایا، دو سال قبل مال کے ایک ریسٹوران میں فلاں صاحب کی دعوت میں۔ میز کے سرے پر بیٹھا ہوا لڑکا۔ موٹی موٹی آنکھوں والا.....“

دوسری طرف زبردست قہقہہ بلند ہوا ”ٹھیک ٹھیک۔ کہاں ٹھہرے ہو؟“

”ریجنٹ سٹریٹ کے فٹ پاتھ پر“ میں نے گھبرا کر کہا اور اس سے قبل کہ میں عاجزی سے اپنا بیان کرتا چوٹنگے میں سے ”ابھی آیا“ کا نعرہ بلند ہوا اور فون بند ہو گیا۔ میں وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں شام کا سرمئی اندھیرا ہر شو پھیلا اور ریجنٹ سٹریٹ اُس کے پہلو میں آکسفورڈ سٹریٹ سامنے شافسیری ایونیو اور ان سڑکوں کے درمیان مشہور زمانہ پکاڈلی سرکس کے گرد لاکھوں روشنیاں جگمگا اٹھیں۔ پکاڈلی کے درمیان ایریز کے مجتھے کے گرد جہاں آج سے چند برس پیشتر پھول بیچنے والی موٹی عورتیں ”FLOWERS MY LOVE“ کی صدائیں لگاتی تھیں اب لاتعداد پیوں کی آماجگاہ تھی۔ سو ہو کو نکلتی ہوئی سڑک کے کنارے گینس بیئر کے بیون سائن کے عین نیچے پیوں کی مشہور دکان ”میں لارڈ کچر کا ذاتی ملازم تھا“ واقع ہے جہاں فلمی اداکاروں کی قد آدم تصاویر تسلیاں مٹکے، گھنٹیاں اور ہندوستانی کُرتے فروخت ہوتے ہیں۔ ”سوان اینڈ ایڈگر“ اور ”آسٹن ریڈ“ کے مشہور سنورز کے شوکیس اتنی نفاست سے سجے تھے کہ ہر راہ گیر کے پاؤں جکڑے جاتے۔ لندن کے کوچہ و بازار خلقت سے ٹھٹھے پڑے تھے۔

تقریباً دو گھنٹے کے انتظار کے بعد پکاڈلی کے زیر زمین ریلوے سٹیشن سے چغتائی صاحب برآمد ہوئے۔ میں نے فوراً پہچان لیا۔ دراز قد خوش شکل و خوش لباس چغتائی پورے جھوم میں ممتاز نظر آ رہا تھا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا میرے پاس آیا اور پھر مجھ پر ایک اچھتی سی نگاہ ڈال

کردوسری جانب نکل گیا۔ میں سامان چھوڑ کر اس کے پیچھے بھاگ نکلا اور اسٹن ریڈ کے پاس جا لیا خلاف توقع بے حد گرمجوشی سے ملا۔ کہنے لگا۔ ”لاہور کے مستنصر اور لنڈن کے مستنصر میں بہت فرق ہے۔ تمہارے بڑھے ہوئے بالوں اور بے ترتیب کپڑوں نے مجھے محضے میں ڈال دیا تھا۔“ اس نے میرا سوٹ کیس اٹھا لیا اور ہم دونوں بس پر سوار ہو کر لنڈن سے تقریباً دس میل باہر سٹرٹھیم کے علاقے میں اتر گئے جہاں اس کا فلیٹ تھا۔

چغتائی کے چھوٹے سے فلیٹ پر اچھے خاصے عجائب گھر کا گمان ہوتا تھا۔ پاکستانی دستکاریوں کے نمونے۔ مغل مصوری کے مختصر شاہکار، رنگوں کے ڈبے اور خالی بوتلیں۔ ایک کونے میں مصور مشرق عبدالرحمن چغتائی کی تصاویر سے مزین ”مرقع چغتائی“ کے چند نسخے تہ در تہ رکھے تھے وحید اس مایہ ناز مصور کا بھتیجا ہے اور مرقع چغتائی میں شامل تمام تصاویر اسی کی زیر نگرانی لنڈن میں طبع ہوئی تھیں۔ اس نے کچھ عرصہ اپنے چچا کے سٹوڈیو میں مصوری کی تعلیم بھی حاصل کی مگر چند مجبوریوں کی بناء پر اسے لنڈن آنا پڑ گیا جہاں برش اور پنسل جیسی لطیف اشیاء تھانے والے ہاتھ اب ایک اداس اور خنک لوہے کی فیکٹری میں بھاری بھر کم ہتھوڑے کے وار کرتے تھے۔

شام کے کھانے کے بعد چغتائی نے اپنے وکٹورین طرز کے آئینی پلنگ کے نیچے سے ایک فولڈنگ چار پائی نکالی اور کھول کر چند غیر مکمل تصاویر کے اوپر بچھا دی۔ آئندہ دو ہفتوں کے لیے یہ میرا بستر تھا۔

صبح آنکھ کھلی تو دس بج رہے تھے اور چغتائی اپنے کام پر جا چکا تھا۔ میز پر ایک رقعہ پڑا تھا ”ناشتہ باورچی خانے میں شام چھ بجے لیسٹر سکور میں ملاقات ہوگی۔“

گیس کے چولہے کے نچلے حصے میں رکھے پرائیٹے اور انڈے ابھی تک گرم تھے اور فلاسک میں سے تازہ کافی کی اشتہا انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ ناشتے کے بعد میں نے کپڑے بدلے اور ایک سرخ ڈبل ڈیکر بس میں سوار ہو کر کینسلٹن اتر گیا۔ آج دھوپ چمک رہی تھی۔ بگ بین گھنٹہ گھر اور برطانوی پارلیمنٹ کی عمارات کے سامنے والے باغوں اور دریائے ٹیمز کے کنارے بے شمار لوگ بیچوں پر بیٹھے یا گھاس پر اوندھے لیٹے دھوپ سینک رہے تھے۔ میں بگ بین سے

باسکس ہاتھ مڑ کر سیدھا ٹرانسپورٹ میں چلا آیا جس کی عمارتیں آج سے چند برس پیشتر لنڈن کے دھوکیں اور کہر کی وجہ سے بالکل سیاہ ہو چکی تھیں مگر اب انہیں کھرچ کر ایک بار پھر صاف ستھری اور خوبصورت بنایا جا رہا ہے۔

میں پورے آٹھ سال بعد لنڈن آیا تھا۔ ان دنوں یہ شہر ایک نیک چڑھی بجی سجانے بڑھیا کی مانند تھا جس کے بیش قیمت گہنے آئے دن اس کے محکوم ملکوں کے حریت پسند نوج کر لے جاتے۔ یہ گہنے اُن غلام قوموں کے خون پسینے کا ثمر تھے جو اس بوڑھی حرافہ نے تہذیب کے نام پر ہتھیلیا لیے تھے۔ ہر گہنے کے چھنے پر یہ بڑھیا بری طرح جھنجھلا اٹھتی اور اس کی یہ جھنجھلاہٹ اسے ایک نحوست آلود عفریت کا روپ دے دیتی۔ مگر اب اس بڑھیا نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ شاندار ماضی کی یاد اب صرف قدیم شراب خانوں میں اوٹکتے ہوئے بڑھے کھوسٹ انگریزوں کے دل میں ہی باقی ہے ورنہ نئی نسل کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ان کو تو جدید فیشن کے ملبوسات، مشرقی موسیقی اور منشیات سے لگاؤ ہے۔ کہاں وہ دن کہ انگریز یورپ بھر میں لباس کے معاملے میں سب سے کور و ذوق واقع ہوتے تھے۔ لڑکوں کے بد وضع ادنیٰ کوٹ اور لڑکیوں کے کسے ہوئے لباس دیکھ کر غیر ملکی ناک بھوں چڑھاتے ”کیا یہی ہے انگریز کی روایتی خوش پوشاکی؟ ایک ڈھیلے شکن آلود سوٹ کے ساتھ مہینوں استعمال شدہ گندی اور بدبودار قمیض پر ہر روز کا غذا بنا ہوا سفید کارلر لگایا اور بس!“ اور پھر کہاں یہ وقت کہ لنڈن کی جون ہی بدل چکی ہے۔ ڈبل ڈیکر بس کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے نظریں جھکا لینی پڑتی ہیں۔ مبادا آپ کے آگے آگے چڑھتی ہوئی محترمہ کی منی سکرت رہتی بھر اور نہ پھسل جائے۔ لنڈن میں فیشن کے موجدوں نے کپڑے کے رنگ اور وضع کو بالائے طاق رکھ کر صرف خوبصورت اور دل کو لبھانے والے ملبوسات تیار کرنے کا بیڑا اٹھالیا ہے۔ یورپ میں کہیں چلے جائے لڑکے لڑکیاں آہ بھر کر کہتے ہیں کہ آج کل تو لنڈن جھول رہا ہے۔ (London is Swinging) اور کارلن بی سٹریٹ کے نام پر تو اکثر لوگ مراقبہ میں چلے جاتے ہیں۔ میرا رخ اسی کارلن بی سٹریٹ کی طرف تھا جواب روم اور پیرس کی بجائے دنیا بھر کے نئے فیشنوں کا مرکز ہے۔

کارلن بی سٹریٹ ایک سیدھی سادی تنگ سی گلی ہے جس کے دونوں طرف جدید ترین

فیشن کے ملبوسات کی گئی چنی دکائیں ہیں۔ ہر دکان کا مالک وہاں بکنے والے ملبوسات خود ڈیزائن کر کے اپنے درزیوں سے سلواتا ہے اسی لیے ہر دکان پر بکنے والا لباس اس دکان کی خصوصی کاٹ اور طرز کا حامل ہوتا ہے جو ہمیشہ منفرد ہوتی ہے۔ انگلستان کے لوگ جواب تک خود کار مشینوں پر تھوک کے بھاؤ سے ہوئے کپڑے پہن پہن کر لباس میں انفرادیت سے بے نیاز ہو چکے تھے اب کارن بی سٹریٹ کے طفیل بے حد خوش پوشاک ہوتے جا رہے ہیں۔ اس دکان کا نام ”ہز اینڈ ہر“ ”His & Her“ ہے وہ سائنے ”لارڈ اینڈ لیڈی“ (Lord & Lady) نظر آ رہی ہے جہاں پچھلے دنوں جیک اونا س چوری چھپے کپڑے خریدنے آئی تھی اور اس طرف ”ہی اینڈ شی“ (He & She) واقع ہے۔ کارن بی سٹریٹ اب فیشن کا ایک ایسا مرکز بن گیا ہے جس کی قینچی کی ہر کاٹ پر روم۔ پیرس اور برلن کی نظریں لگی ہیں۔ آج مئی ہے تو کل مئی اور پھر میکسی کا دور دورہ ہے۔ ادھر کوٹ کا کالر ایک انچ چوڑا ہو چکا ہے ادھر پتلون کا پانچہ 15 سے 16 ہونے والا ہے۔ غرض کہ یہ بڑی بی کارن بی سٹریٹ فیشن کی جنگ کا وار آفس (War Office) ہے جہاں سے پوری دنیا کو ہر نئی چال اور داؤ پیچ سے باخبر رکھا جاتا ہے۔

دو پہر کا کھانا میں نے سو ہو کے ونڈل تھیٹر کے پہلو میں واقع ایک پاکستانی ہوٹل میں کھایا۔ لنڈن میں چینی اور فرانسیسی خوراک کے ساتھ ساتھ پاکستانی غذا بھی بے حد پسند کی جاتی ہے اور یہاں سینکڑوں ایسے ریستوران موجود ہیں جہاں پان اور پاپڑ سے لے کر تندور کی گرم روٹی تک دستیاب ہے۔ چغتائی شام کے پورے چھ بجے لیسٹر سکور کے اوڈین سینما کے باہر کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ وہ انگریزی کے ایک محاورے کے مطابق پورے شہر کو سرخ رنگ میں رنگنے کے موڈ میں تھا لیکن میں تمام دن کی آوارہ گردی سے تھک چکا تھا اس لیے فیصلہ ہوا کہ صرف فلم دیکھنے پر ہی اکتفا کیا جائے۔ انگمار برگمین کی تازہ ترین فلم (Shame) دیکھ کر جب ہم باہر نکلے تو لنڈن اپنے پورے جو بن پر تھا۔ لیسٹر سکور کے فٹ پاتھ پر اک ہجوم بے کراں تھا جس کے لیے چوک کے چاروں طرف بنے ہوئے لاقعدا قبوہ خانے اور شراب خانے نا کافی ثابت ہو رہے تھے۔ ہم وہاں سے ٹرافلگر سکوائر کی طرف نکل گئے۔ نیشنل گیلری کے فٹ پاتھ پر جہاں صرف ایک روز قبل ہری رام ہری کرشنا کا ورد ہو رہا تھا۔ وہاں ایک بارلش انگریز مصور فٹ پاتھ پر چند تصویریں سجائے کسی قدر دان کی راہ تک رہا تھا۔ میں اور چغتائی وہاں کھڑے ہو کر قدیم لیمپ پوسٹ کی نا کافی روشنی

میں تصویریں دیکھنے لگے۔

”اس تصویر میں ہلکے رنگ کی بجائے گہرا سبز زیادہ تاثر چھوڑتا“ چغتائی نے بے دھیانی میں ایک تصویر اٹھائی اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

”فیکٹریوں میں کام کرنے والے جاہل پاکستانیوں کو مصوری کے بارے میں کیا علم ہو سکتا ہے“ انگریز مصور نے چغتائی کے ہاتھ سے تصویر چھین لی اور بڑی حقارت سے کہا۔

”سوری“ چغتائی رو ہانسا ہو گیا۔

ادھر میرا پارہ ایک دم چڑھ گیا ”چرس کے نشے میں ٹیڑھی ترچھی لکیریں کھینچ کر تم اپنے آپ کو مصور سمجھنے لگے ہو۔ جسے تم نے جاہل پاکستانی کہا ہے وہ خود ایک مصور ہے اور اس کے چچا.....“

”میں اب بھی کہتا ہوں کہ تم جاہل ہو اور فیکٹریوں میں کام کر کے ہماری دولت لوٹتے ہو“

وہ ہر لفظ آہستہ آہستہ چپا چپا کر کہہ رہا تھا جیسے اسے بے حد لطف آ رہا ہو۔

”دولت ہم لوٹتے ہیں“ میں پھٹ پڑا ”تمہاری ملکہ کے تاج میں جڑے ہیروں سے لے کر سامنے نیشنل گیلری کے ستونوں میں لگے پتروں تک میں ہمارے خون پسینے کی مہک ہے۔“ ”بادشاہ جانے دو“ چغتائی نے مجھے ایک طرف کھینچتے ہوئے کہا ”یہاں تو روز ایسے جھگڑے ہوتے ہیں۔“

”اس قسم کے فخر بحث سے نہیں چابک سے سیدھے ہوتے ہیں“ میں نے پیچھے مڑ کر زور سے کہا۔

”جاہل پاکستانی۔ کالے پاکستانی“ وہ انگریز مصور چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ سڑتھم کو واپسی پر بس میں بیٹھے ہوئے چغتائی نے بتایا کہ وہ اس قسم کے جھگڑوں سے ہمیشہ پہلو بچاتا ہے وہ تو شکر ہے کوئی پولیس والا ادھر نہیں آ نکلا ورنہ ہم دونوں نقص امن میں دھر لیے جاتے ”ویسے غلطی میری تھی جو اس کی تصویر پر تنقید کی“ اس نے کندھے جھٹک کر کہا۔ ”لیکن دوست میں نے تمہاری تصویریں دیکھی ہیں۔ تم اس بن مانس کے بچے سے یقیناً بہتر مصور ہو“ میرا پارہ ابھی تک چڑھا ہوا تھا۔

”تم غلطی پر ہو۔ وہ مجھ سے کہیں بہتر مصور ہے کیونکہ یہ اس کا اپنا ملک ہے۔ میں اجنبی ہوں۔ لوگ اس کی تصویریں خریدتے ہیں۔ یہاں آ کر پہلے پہل میں نے بھی اپنے فن کو ذریعہ معاش بنانے کی کوشش کی مگر لوگ میرا مشرقی چہرہ دیکھ کر ہی فیصلہ صادر کر دیتے ”عورت کی آنکھیں اتنی لامبی کیوں ہیں اور گردن.....“ جب فاقوں پر نوبت آئی تو فیکٹری میں مزدوری کر لی۔ اب کبھی کبھار مقصوری کا جنون سر پر سوار ہوتا ہے تو پہروں برش ہاتھ میں لیے کینوس کے سامنے بیٹھا رہتا ہوں۔ دماغ میں فیکٹری کے فورمین کی جھڑکیوں اور مشینوں کی گڑگڑاہٹ کے سوا اور کچھ نہیں آتا“ اس کے لہجے میں شکست کے ریزے تھے۔

”بادشاہ ہو جانے بھی دو“ میں نے اس کا پسندیدہ نکیہ کلام دہرایا۔ اس کے سنجیدہ چہرے پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ آج صبح لنڈن میں آوارہ گردی کے دوران میں مجھے اول کے قریب رہائش کے لیے ایک صاف ستھرا کمرہ مل گیا تھا۔ میں نے فلیٹ پر پہنچ کر چغتائی سے ذکر کیا۔

”میں صبح وہاں شفٹ کر جاؤں گا۔ مہمان نوازی کا بہت بہت شکریہ“

”بادشاہ ہو جانے دو“ اس نے کنبلوں کی تہ میں گھستے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔

”لیکن میں تو پیشگی کرایہ بھی ادا کر چکا ہوں۔“

”کہہ جو دیا جانے دو“ اس نے ہنس کر کہا اور کروٹ بدل کر سو گیا۔

”سادھ اینڈ آن سی“ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے سمندر کے کنارے واقع ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو لنڈن سے تیس میل کے فاصلے پر ہے۔ جب میں پہلی مرتبہ انگلستان آیا تو زیادہ عرصہ اسی ساحلی قصبے میں گزرا۔ آج میرا ارادہ اسی قصبے کو جانے کا تھا۔ ماضی میں گزرے ہوئے ایک حسین دور کی نشانیوں کی تلاش اور حال سے تقابل....

سادھ اینڈ کے لیے بجلی کی تیز گاڑی لنڈن کے لور پول سٹیشن سے چلی۔ راستے میں چھوٹے چھوٹے قصبے آتے۔ میں کھڑکی سے سر نکال کر سٹیشن کا نام پڑھتا تو ذہن میں یادیں زنجیر ہلا دیتیں۔ اس قصبے سے پرے ایک قدیم قلعہ کے کھنڈروں میں ہم پلنک منانے آیا کرتے تھے۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹی سی ندی تھی جہاں ہم مچھلیاں پکڑنے آتے تھے ایک سٹیشن پر گاڑی دیر تک رکی رہی۔ تمام مسافر اتر گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد گاڑی آ گیا۔ ”کیا یہیں بیٹھے رہنے

گا۔ سادھ اینڈ آخری سٹیشن ہے۔“

”سادھ اینڈ؟“ میں نے حیرت زدہ ہو کر باہر دیکھا۔

سٹیشن سے پرے درجنوں جدید اور بلند عمارتیں کھڑی تھیں۔ مجھے آج سے آٹھ برس پیشتر کا یہی سٹیشن یاد آ گیا، گاڑی رکتی تو ہرے بھرے درختوں کی باس اور سمندر کی سیلی خوشبو کے تھپڑے آتے، میں سٹیشن سے باہر آیا تو ہر چیز بدل چکی تھی۔ ہائی سٹریٹ میں ٹریفک بند کر کے پوری سڑک کو پارک میں بدل دیا گیا تھا۔ ”سورنو“ کا رومانی قبوہ خانہ اب ایک گندا اور پرجھوم ہوٹل تھا جہاں ابلے ہوئے آلو اور مچھلی بک رہی تھی۔ میں ماضی کو کریدنا ایک کونے میں جا بیٹھا اور کافی کا آرڈر دیا۔ اسی دروازے سے میں اور سکھدپ قبوہ خانے میں داخل ہوتے تو وہاں بیٹھے لوگ دم سادھ لیتے۔ سکھدپ کی پگڑی پر آدیزاں رنگدار شیشے کا ٹکڑا ہیرے کی طرح چمک رہا ہوتا۔ جنینس کے سنہری بال اُس تاریک کونے میں چمک رہے ہوتے۔ جب کبھی جیب خالی ہوتی تو ہم قبوہ خانے کی ادھیز عمر مگر ہنس کھو میز کی تعریفیں کرنا شروع کر دیتے ”جون! آج تو تم پچاس سے ایک سال بھی اوپر کی نہیں لگ رہیں۔“ اور وہ ہمیں کافی کے ساتھ چپکے سے درجنوں سینڈوچ بھی دے جاتی جن کا اندراج بل میں معجزانہ طور پر غائب ہوتا۔ میں سمندر کے کنارے گھومتا رہا لیکن کوئی آشنا صورت نظر نہ آئی۔ اس ساحل پر میرے لیے چلنا دشوار ہوتا تھا۔ ہر قدم پر کسی واقف کار سے میل ہو جاتا۔ کتابوں کے شال سے بوڑھا فریک ہمیشہ نعرہ لگاتا، ”مستنصر پیارے تین ہفتوں سے اخبار کے پیسے نہیں آئے۔“ دنیا امید پر قائم ہے۔“ میں مسکرا کر کہتا اور آگے بڑھ جاتا۔ چھوٹی پہاڑیوں پر پھیلے ہوئے باغوں کے تمام مالی میرے واقف تھے۔ وہ مجھے آکس برگ اور بلیک پرنس گلاب کی کوخیز کلیاں دکھاتے، اور آج میں اپنے ہی وطن میں اجنبی تھا۔ کالج کے ایک استاد کے گھر گیا تو معلوم ہوا کہ مدت ہوئی وہ مر چکا ہے اس کی ننھی مٹی لڑکی پنی جیسے میں ”سورنو“ میں آکس کریم کھلایا کرتا تھا اب دو بچوں کی ماں ہے اور سوئٹر لینڈ میں رہتی ہے۔ اس کی بیوی ایک اداس اور تاریک گھر میں زندگی کے آخری لمحے گزار رہی ہے۔ اس گھر میں جہاں کرسس کی شام کو سارا کالج مدعو ہوتا اور یوں لگتا جیسے یہ ہنگامہ رہتی دنیا تک جاری رہے گا۔ اپنی پرانی لینڈ لینڈی کا گھر۔ تلاش کرنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا وہاں اب ایک جدید سکاٹی سکرپر کھڑا ہے۔ ”کیا صرف آٹھ سال کے عرصہ میں اتنے انقلاب رونما ہو سکتے ہیں۔“ میں نے اداس ہو کر سوچا مجھے احساس ہوا کہ

ماضی کی مسرتیں تلاش کرنا کتنی بڑی حماقت ہے۔ میں دوپہر سے پہلے واپس لنڈن لوٹ آیا۔

لور پول سٹریٹ سے زیر زمین گاڑی میں ایک مرتبہ پھر لنڈن کے مرکز پکاڈلی سرکس میں چلا آیا جہاں ایروڈ کے مجسمے کے گرد میز ہیوں پر بے شمار چمی بڑا جمان تھے۔ یہ جگہ سستانے کے لیے بہترین تھی چنانچہ میں بھی ان کے درمیان بیٹھ گیا اور اپنے چاروں طرف گھومتی ہوئی لنڈن کی ٹریفک کے شور کو نظر انداز کرتے ہوئے کہنی پر سر رکھ کر دہیں سو گیا۔ جانے میں کتنی دیر سوتا رہا کہ یکایک کسی نے میرا نام پکارا اور کندھا پکڑ کر زور زور سے جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

”السلام علیکم“ میرے سامنے میرا دوست صدیق کھڑا تھا جسے میں چند ماہ پیشتر لاہور میں صبح سالم چھوڑ آیا تھا۔

”صدیق چوہدری؟“ میں نے حیرت زدہ ہو کر ایسے پوچھا جیسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ ہو۔

”یا سلام کا جواب تو دو“ اس نے کندھے سے پکڑ کر ایک مرتبہ پھر جھنجھوڑا۔

”علیکم السلام“ لیکن تم یہاں کیسے؟“ صدیق اور لنڈن کے پکاڈلی سرکس میں، مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔

”تمہیں تو کہتے رہتے تھے کہ ساری عمر لوہے کی کریاں بنانے کو پڑی ہے۔ دنیا دیکھو چنانچہ میں نے تمہاری روانگی سے چند دن بعد ناصر کو غیرت دلائی کہ فرنیچر تو بنانا ہی رہے گا۔ مظہر کو لعن طعن کی کہ تمہارا ہوٹل بھی چلتا رہے گا۔ وہ مستنصر تن تھا سفر کے لیے پیدل ہی نکل کھڑا ہوا ہے اور ظالمو ہمارے پاس تو ایک پرانی فوکس واگن بھی ہے۔ دنیا دیکھو!“

”ناصر اور مظہر بھی لنڈن میں ہیں!“ میں نے ایک مرتبہ پھر حیرت زدہ ہو کر منہ کھول دیا۔ ”دراصل“ صدیق میرے ساتھ میز ہیوں پر بیٹھ کر کہنے لگا، ”ہم تینوں اپنی بیگمات اور والدین کو صرف اتنا بتا کر آئے تھے کہ کابل تک جا رہے ہیں دو چار روز میں لوٹ آئیں گے۔ پھر انہیں یکدم ہمارے لنڈن سے پوسٹ کئے ہوئے کارڈ وصول ہوئے تو خطوں اور تاروں کا تانتا بندھ گیا۔ مظہر کی بیگم نے چونکہ خطرناک قسم کی دھمکی دی تھی کہ.....“

”کہ میں چلی پٹیلے“ میں نے لہک کر کہا۔

”پٹیلے؟“ صدیق نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے میں گھاس کھا گیا ہوں ”خیر مظہر تو اسی روز بذریعہ ہوائی جہاز پاکستان لوٹ گیا۔ مجھے اور ناصر کو چونکہ صرف عامیانہ قسم کی دھمکیوں کا نشانہ بنایا گیا تھا اس لیے ہم یہیں ٹپک گئے۔ کل صبح واپسی ہے ہمارے ساتھ ہی چلو۔“ میں نے اسے بتایا کہ ابھی مجھے انگلستان کا جھیلوں کا ضلع دیکھنا ہے اور اس کے بعد فرانس اور ہسپانیہ کے سفر کے بعد ہی واپسی ہوگی اس لیے مجبوری ہے۔

”تم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ مجھے تمہاری پکاڈلی سرکس میں موجودگی کے بارے میں کیسے علم ہو گیا؟“

”ہاں یہ بات بھی ہے“ میں نے سر کھجا کر کہا۔

”مجھے معلوم تھا کہ تم آج کل لنڈن میں ہو گے لیکن مشکل یہ تھی کہ تمہیں تلاش کہاں کیا جائے“ اس نے میری طرف دیکھ کر شرارت سے کہا ”ناصر سے ذکر کیا تو کہنے لگا۔ مستنصر؟ بس کہیں پیوں میں بیٹھا دھوپ سینک رہا ہو گا چنانچہ میں سیدھا یہاں آ گیا اور تم واقعی دھوپ سینک رہے تھے۔“

”اب دھوپ کہاں! شام ہو رہی ہے“ میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی ”آؤ کہیں بیٹھ کر باتیں کریں۔“

ہم وہاں سے اٹھ کر لیسٹر سکور کے ایک قبوہ خانے میں چلے گئے۔ ایک تاریک کونے میں ایک گرانڈیل حبشی ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے سر پر فلیٹ ہیٹ جمائے ترنگ میں گارہا تھا۔ اس کے پہلو میں حبشیوں کی ایک پوری پلٹن ڈھول بتاتے بجانے میں مصروف تھی۔ ہم نے کاؤنٹر سے کافی اور سینڈوچ خریدے اور ایک کونے میں جا بیٹھے۔ ”آخری گاڑی آ گئی لیکن۔“ حبشی گلا پھاڑ کر چیختا اور پھر ”میرا محبوب نہ آیا، نہ آیا“ کی گردان شروع کر دیتا۔ ساتھ ہی دھما دھم ڈھول پٹنا شروع ہو جاتا۔

”گڈی آ گئی نیشن تے“ کے ماہیے سے متاثر ہو کر لکھا ہے ”میں نے صدیق کے کان میں چیخ کر کہا۔ اس نے مسکرا کر سر ہلادیا لیکن مجھے معلوم تھا کہ موسیقی کے شور کی وجہ سے بات اس کے پٹے نہیں پڑی۔ دو تین گانوں کے بعد جب ہمارے کانوں کے پردے بغیر تھاپ کے دھپ

دھپ کرنے لگے تو ہم اٹھ کر باہر آ گئے۔ سڑتھم جانے والی آخری بس چونکہ پورے گیارہ بجے چلتی تھی اس لیے میں نے صدیق سے دو چار ماہ کے لیے اجازت چاہی اور اسے خدا حافظ کہہ کر تیز تیز چلتا ہوا ٹرافک سکوڑ کے بس سٹاپ پر آ گیا۔ چند منٹ بعد ایک بس رکی اور میں اس میں سوار ہو گیا۔ بس چلی تو کنڈکٹر نے بتایا کہ یہ بس سڑتھم نہیں جائے گی البتہ وہ مجھے اوّل کے سٹاپ پر اتار دے گا جہاں سے مجھے سڑتھم کے لیے ایک اور بس مل جائے گی۔ چنانچہ میں نے اوّل تک کا ٹکٹ نکٹا لیا اور سگریٹ سلگا کر نشست پر دراز ہو گیا۔ میرے آگے دو نشستیں چھوڑ کر ایک سیاہ بالوں والی لڑکی کھڑکی کے شیشے سے ناک چپکائے باہر دیکھنے میں مصروف تھی۔ اس کے لمبے اور خوبصورت بال بچھلی نشست تک آ رہے تھے۔ کنڈکٹر اس کے پاس گیا تو اس نے اپنے ننھے منے بٹے سے ایک شلنگ کا سکہ نکالا اور پھر ایک ہاتھ سے ماتھے پر بٹھرے ہوئے بالوں کو سنوارتے ہوئے ٹکٹ خرید لیا۔ بقیہ رقم اور ٹکٹ بٹے میں ڈال کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کھلتے ہوئے گندی رنگ کے کیٹوس پر دو کالی بھور آنکھیں تیلیوں کی مانند پھڑک رہی تھیں، اس کی نظریں لمحہ بھر کے لیے مجھ پر پڑھیں اور پھر وہ حسب معمول کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ بس کسی لیمپ پوسٹ کے پاس سے گزرتی تو روشنی ہمارے چہروں پر پڑتی کچھ دیر تو میں اس کی قومیت کے بارے میں غور کرتا رہا اور پھر اسی کی طرح کھڑکی کے شیشے سے ناک چپکا کر باہر دیکھنے لگا۔ اوّل کا سٹاپ آیا تو میں اتر گیا اور کنڈکٹر کی بتائی ہوئی سمت میں چلنا شروع کر دیا جہاں سے مجھے سڑتھم کے لیے بس ملنے کی امید تھی۔ ایک ویران چوراہے پر میں صبح راستے کا تعین نہ کر سکا اور وہیں کھڑا ہو گیا تاکہ کسی راہ گیر سے بس سٹاپ کے بارے میں دریافت کر سکوں۔

”اگر تم سڑتھم جانے والی بس کے سٹاپ پر جانا چاہتے ہو تو میرے ساتھ چلے آؤ“ میرے عقب میں سے ایک آواز ابھری اور ساتھ ہی وہ کالے بالوں والی لڑکی میرے قریب سے گزر کر سڑک کے پار چلی گئی۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر اس نے مڑ کر دیکھا تو میں وہیں کھڑا تھا۔ ”آخری بس چلنے میں صرف ایک منٹ باقی ہے“ اس نے قدرے درشتگی سے کہا۔ اور فٹ پاتھ پر چل دی ”آہم“ میں نے گلا صاف کیا اور تیزی سے سڑک پار کر کے اسے ایک موڑ پر جالیا۔

”راہنمائی کا شکریہ“ میں اپنی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا۔

”کوئی بات نہیں“ اس نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا ”ذرا تیز چلو“ میں نے کن

اکیوں سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ پستہ قد ہونے کے باوجود بچہ پرکشش تھی۔ کھلے ہوئے لائے بال جو کمر سے نیچے تک آئے ہوئے تھے... تیز چلنے کے باعث اس کی متناسب کولہوں پر سے پھسلتے اور پھر دھنی ہوئی روئی کی مانند ہوا میں اڑنے لگتے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں بس اسی خوف کی جھلکیاں تھیں کہ کہیں آخری بس نہ نکل جائے۔ وہ یورپی طرز کا لباس پہنے ہوئی تھی۔ بڑے کاروں والا پھولدار بلاؤز اور شوخ سرخ رنگ کا منی سکرٹ۔

ہم ابھی سٹاپ سے کچھ فاصلے پر ہی تھے کہ موڑ پر سے ایک سرخ ڈبل ڈیکر نمودار ہوئی اور ہم دونوں بھاگتے ہوئے اس میں سوار ہو گئے۔ نشست پر بیٹھے ہی اس نے اطمینان کا سانس لیا ”شکر ہے آخری بس مل گئی ورنہ اس راستے پر تو روزانہ کوئی نہ کوئی ہندوستانی یا پاکستانی پٹ جاتا ہے۔ میرے پاس تو ٹیکسی کے لیے بھی پیسے نہ تھے“ اس نے اپنے بٹے سے ایک مختصر سا رومال نکالا اور ماتھے پر تھپک کر کھڑکی کے شیشے سے ناک چپکا کر باہر دیکھنے لگی۔ اس کے بالوں سے چنبیلی کی خوشبو آ رہی تھی۔ گرم مشرق کی بھینی بھینی خوشبو۔ میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا اور اس عجیب و غریب ایشیائی لڑکی کے بارے میں سوچنے لگا جو لباس اور گفتار کے معاملے میں پوری طرح انگریز تہذیب میں رنگی جانے کے باوجود اس بات سے خوفزدہ تھی کہ کہیں گھر کے راستے میں انگریز غنڈے اس کی پٹائی نہ کر دیں۔ سرخ منی سکرٹ پھولدار بلاؤز اور انگریزی زبان پر مکمل عبور اس کے کسی کام نہیں آ سکے گا۔ وہ صرف ایک رنگدار ایشیائی لڑکی ہوگی۔ کالی لڑکی۔

”آپ کس ملک سے تعلق رکھتی ہیں؟“ میں نے ڈرتے پوچھا۔

”میں ہندوستانی نژاد مشرقی افریقن ہوں“ اس نے کھڑکی سے نظر ہٹائے بغیر

جواب دیا۔

”اور آپ کا نام؟“ میں نے شجرہ نصب مکمل کرنے کی کوشش کی۔

”رملہ“ اس کی نگاہیں کھڑکی سے ہٹ کر مجھ پر جم گئیں۔ میں پہلی مرتبہ اس کا چہرہ اتنے

قریب سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا گندی رنگ کا گول چہرہ فضا میں معدوم ہو رہا

ہے اور اس خلا میں صرف بڑی بڑی کالی بھور آنکھیں تیر رہی ہیں۔ میں بوکھلا گیا۔

”خوبصورت نام ہے“ میں نے خوشدلی سے کہا ”پرسوں صبح ٹرافک سکوڑ میں آپ

کے ہم مذہب انگریزوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ ہری رام۔ ہری کرشنا وغیرہ۔“

”کیا کہتے ہو؟“ اس کی آنکھیں حیرت سے اور پھیل گئیں۔

”ٹھیک کہتا ہوں“ میں نے تنگ میں آ کر کہا ”بس اب تو لنڈن میں ہی پوجا کر لیا کیجیے گا۔ ادھر بگ بین کا گھر بیل بجا ادھر آپ کے ہندو مندر میں ٹن ٹن شروع ہو گئی۔ آپ ہندو ہیں نا؟“

”میرا پورا نام رملابراہیم ہے“ اس نے تنگ کر کہا ”اور میں مسلمان ہوں“ یہ کہہ کر اس نے کھڑکی کی طرف منہ پھیر لیا۔

”لیکن آپ کا نام.....“ میں نے سر کھاتے ہوئے بڑی شرمندگی سے کہا۔

”ہمارے ہاں ایسے ہی نام ہوتے ہیں“ اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

سڑتھم کا بس شاپ آیا تو ہم اتر گئے۔ میں اس کا شکر یہ ادا کر کے جانے لگا تو کہنے لگی میرے گھر کے راستے میں ایک شراب خانہ آتا ہے جہاں کئی شرابی لوٹے اسی تاک میں رہتے ہیں کہ کوئی رنگدانس کا آدی قابو آ جائے تو اسے تنگ کریں۔ اگر تم تھوڑی دور تک میرے ساتھ چلو تو میں بیحد شکر گزار ہوں گی۔“

راستے میں اس نے بتایا کہ وہ لنڈن میں ملبوسات کی تلاش کا کورس کرنے آئی ہے اور چند سہیلیوں کے ہمراہ ایک فلیٹ میں رہتی ہے۔ آج شام اسے ایک فیشن شو سے واپسی پر دیر ہو گئی تھی ورنہ وہ رات کے اس پہرا کیلی واپس آنے کا خطرہ مول نہیں لیتی۔ بس شاپ سے اس کا گھر زیادہ دور نہ تھا۔ اس کے گھر کے سامنے چھوٹے باغیچے کا آہنی دروازہ کھولا اور پھر بڑی آہستگی سے پیچھے مڑ کر کہنے لگی ”تم نے اپنا تعارف تو کروایا ہی نہیں۔“

میں نے اپنے بارے میں بتایا تو شرارت آمیز لہجے میں بولی ”نام تو مسلمانوں جیسا ہے لیکن شکل سے بالکل ہندو لگتے ہو“ گویا بدلا چکا یا جا رہا تھا۔

رملاب کے خوبصورت مشرقی چہرے نے میرے دل میں اداسی بھر دی تھی۔ وہ میرے سامنے کھڑی تھی اور لیپ پوسٹ کی ہلکی روشنی میں اس کی سیاہ آنکھیں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ تتلیاں! میں ان کے پیچھے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ مجھے ایک دم وطن کی یاد ستانے لگی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وطن سے قربت کا یہ احساس ابھی اور اسی وقت ختم ہو جائے ”اگر کل شام تمہیں فرصت ہو تو.....“

”بالکل فرصت ہے۔ میں سوان اینڈ ایڈگر سٹور کے کونے پر تمہارا انتظار کروں گی۔“

اس سے قبل کہ میں کچھ اور کہتا وہ گھر کا دروازہ کھول کر اندر جا چکی تھی فضا میں ابھی تک چنبیلی کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔

دوسری صبح میری آنکھ کھلی تو سامنے چغتائی بیٹھا ایک اُسترا تیز کر رہا تھا اور اس کے پاس میز پر قینچیوں، نگھیوں اور بال کاٹنے والی مشینوں کی قطاریں سجی تھیں۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ میں نے کمبل کو اچھی طرح سر کے گرد لپٹتے ہوئے پوچھا۔ آج مطلع ابراؤد تھا اور قدرے ٹھنڈک تھی۔

”حجامت بنے گی“ اس نے اُسترے کی دھار پر کھتے ہوئے جواب دیا۔

”کس کی بھائی؟“ میں نے جمائی لیتے ہوئے پوچھا۔

”تمہاری اور کس کی“ اس نے ہنس کر کہا ”بادشاہو یہ پتیوں ایسے لمبے بال ہم پاکستانیوں پر نہیں سجتے۔“

میں نے اُسے بتایا کہ میرے بالوں کی لمبائی میں فیشن سے زیادہ کنجوسی کو دخل تھا۔ آج ہفتہ تھا اور چغتائی کو فیکٹری سے چھٹی چنانچہ بسم اللہ میری حجامت سے ہوئی۔ چغتائی اپنے بالوں کے معاملے میں بے حد محتاط ہے۔ اپنی تنخواہ کا بیشتر حصہ مختلف قسم کے شیپو، تیل اور کنگھے خریدنے میں صرف کرتا ہے۔ صرف ہیمز ڈریسر سے ہفتہ وار حجامت پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ اُسترے قینچیاں گھر پر موجود ہیں اور روزانہ کام پر جانے سے پہلے ایک مختصر سی حجامت خود بنا لیتا ہے۔ بہر حال اس کا ذخیرے فارغ ہو کر ہم نے کپڑے بدلے اور پھر بس کے ذریعے ٹرافلکرسکوڑ میں آ گئے۔

آج ہمارا ارادہ نیشنل گیلری آف آرٹس دیکھنے کا تھا۔ گیلری میں داخلے سے قبل چغتائی کا چھاتا اور میری برساتی کاؤنٹر پر رکھوا لئے گئے۔ ماضی میں ایسا بھی ہوا کہ فن کے قدردان اپنے اندر چھپے ہوئے رشک اور حسد کے جذبے کے تحت کسی شاہکار تصویر کو چھاتے کی آہنی نوک سے پھاڑ ڈالتے یا پھر تصویر اتار کر اپنی برساتی میں چھپائی اور چھپت ہو گئے۔ اس فن پرستی کی روک تھام کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ چغتائی جیسے مجھے ہوئے مصور کی رفاقت میں نیشنل گیلری میں آویزاں مشہور مصوروں کی تصاویر کے کئی نئے پہلو سامنے آئے۔ اُسے کانٹیشنل اور نرر بے حد پسند

تھے جن کی قدرتی مناظر کی تصاویر کے سامنے کھڑے ہو کر وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا یہاں تک کہ مجھے اُس کی توجہ گیلری میں لگی ہوئی دوسری شاہکار تصویروں کی طرف مبذول کرانی پڑتی جن کے خالق ریمر انت ڈیگاس، زوہن اور مائیکل انجلو ایسے شہرہ آفاق مصور تھے۔ گیلری کے درجنوں ہال کمروں کو سرسری طور پر دیکھنے کے بعد جب ہم باہر آئے تو ابھی صرف دو بجے تھے۔ چغتائی نے تجویز پیش کی کہ اردو فلم دیکھی جائے چنانچہ ہم ”ساؤتھ ہال“ جانے والی بس پر سوار ہو گئے۔

ساؤتھ ہال پر لنڈن کے کسی علاقے کی بجائے ایک سکھ ریاست کا گمان ہوتا ہے، ہر طرف خالصوں کا راج ہے۔ تقریباً تمام مکان، سینما، سنور اور شراب خانے سکھوں کی ملکیت ہیں۔ ساٹھ برس لگ بھگ پہلے کی بات ہے کہ ایک انگریز افسر ہندوستان سے واپسی پر اپنے سکھ اُردی کو بھی ساتھ لے آیا اور اسے ساؤتھ ہال میں واقع ایک ریو فیکٹری میں ملازمت دلوا دی۔ اس سکھ اُردی نے پہلے اپنے خاندان اور پھر تمام گاؤں والوں کو یہاں بلوایا۔ آج اس ریو فیکٹری کا نام و نشان نہیں ملتا البتہ واگرو کا خالصہ بہتات میں ملتا ہے۔ حالات یہ ہیں کہ اگر اس علاقے میں کوئی انگریز نظر آ جائے تو شام کے کھانے پر بچوں کو بتایا جاتا ہے کہ دیکھا اسے انگریز کہتے ہیں۔ ہم ایک شراب خانے کے پاس سے گزرے تو باہر کھڑی لمبی تزنگی سکھ عورت نے ہمیں خالص پنجابی لہجے میں پکار کر کہا ”وے منڈیو! تھوڑی جی شراب تے پیادیو“ اُس نے بھڑکیلے رنگ کی ایک ساڑھی پہن رکھی تھی اور اس کی چال ڈھال سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کس قماش کی عورت ہے۔

سینما گھر کے اندر بے پناہ رش تھا۔ سکھوں کے علاوہ پاکستانی حضرات بھی بہت بڑی تعداد میں موجود تھے۔ ہمیں ایک ساتھ دو نشستیں نہ مل سکیں چنانچہ چغتائی اگلی رومیں جا کر بیٹھ گیا اور میں گیلری میں سکھوں کے ایک جلوس کے درمیان براجمان ہو گیا۔ ماحول سرا سر دیسی تھا۔ سگریٹوں کے علاوہ پان بھی فروخت ہو رہے تھے۔ پاکستانی کوکا کولا کی بوتلیں تھامے تھے اور سکھ بیئر کے ٹین غٹا غٹ پی رہے تھے۔ فلم کے دوران میں جب بھی کوئی ہیجان خیز قصہ آتا تو پبلک خوب شور مچاتی۔ ایک مرتبہ جب ہیرو نے ہیروئن کے ساتھ فرستی کرنے کی کوشش کی تو چند سکھ اٹھ کر نشستوں کے درمیان والے راستے میں ناچنے لگے۔ انہیں بڑی مشکل سے بٹھایا گیا۔ انٹرول

کے بعد آپریٹر کی غلطی سے فلم کی ریلیس آگے پیچھے ہو گئیں اور تمام منظر اٹلے چلنے شروع ہو گئے۔ چغتائی نے اگلی روم سے پیچھے مڑ کر مجھے پکارا ”مستنصر بادشاہ!“

”ہاں بھی چغتائی بادشاہ!“ میں نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لگاتے ہوئے پوچھا۔

”یہ کسی سکھوے نے ریلیس اٹلی چلا دی ہیں میں آکھیا۔“

”آہو“ میں نے خوش ہو کر زور زور سے سر ہلایا اور پھر فوراً ہی اپنی نشست میں دبک گیا۔ میرے چاروں طرف بیٹھے سکھ مجھے بری طرح گھور رہے تھے اور پھر یہ سینما بھی کسی سردار جی کی ملکیت تھا۔

فلم کے خاتمے پر باہر نکلے تو شام ہو چکی تھی۔ میں نے گھڑی پر وقت دیکھا تو سات بجنے کو تھے۔ میرا خیال تھا کہ اب چغتائی سے اجازت لے کر فوراً پکا ڈی سکرس کی طرف چلا جاؤں جہاں سوان اینڈ ایگر سنور کے کونے پر زلمیر انتظار کر رہی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا چغتائی میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا بادشاہو! بہت سیر ہو چکی۔ اب فلیٹ پر چل کر وطن کی باتیں کرتے ہیں اور اپنی موسیقی سنتے ہیں۔ میں ٹھٹک گیا۔ انکار کرنا چاہا مگر نہ کر سکا۔ آخر زلمی کون ہوتی ہے؟ لنڈن کی سیاہ رات میں دو پھڑکتی ہوئی تیلیوں کی شبیہ۔ ادھر چغتائی نے ایک اجنبی ہوتے ہوئے بھی میرے ساتھ بھائیوں ایسا سلوک کیا ہے۔ میں اس کی یہ خواہش رد کرنے کا حوصلہ کہاں سے لاتا جب کہ اس کی بے پناہ شفقت اور خلوص میرے راستے میں دیوار بن کر کھڑے ہو گئے تھے۔ تیلیاں بھی فضا میں معدوم ہو گئیں۔

اس شب ہم دیر تک اپنے پیارے دیس کی باتیں کرتے رہے۔ غم دوراں کے قصے چھڑے تو نصف شب ہو گئی محبت کی محرومیوں کے تذکرے ہوئے تو صبح ہونے کو آئی۔ تمام شب پاکستانی موسیقی کے ہلکے پھلکے سروں نے ہمارا ساتھ دیا۔ جب میں اپنے بستر پر لیٹا تو لنڈن کے عظیم شہر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں استاد برکت علی خاں کی لوج دار آواز گونج رہی تھی۔

کبھی ہم میں تم میں قرار تھا

تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

تمام شب میرے دل کے عمیق کونوں میں جو اداسی کروٹیں بدل رہی تھی مومن کی خوبصورت غزل نے اُسے اور بھی گہرا کر دیا۔ دل میں ایک درپچہ کھلا اور اک من موہنی صورت نے

جھانکا۔ پھر اُس سے پرے در پیچے کھلتے گئے اور ہر ایک میں رملات تصویر بنی بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں گمبیر اُدا سی تھی اور وہ مجھ سے مخاطب تھی ”مجھے معلوم ہے تمہیں یورپی لباس پسند نہیں اسی لیے میں نے آج صرف تمہارے لیے مشرقی لباس پہنا تھا۔ میرے کانوں میں چاندی کے جھمکے تھے جن پر پکاڈلی سرکس کی رنگ برنگی روشنیاں منعکس ہو رہی تھیں۔ میرے بالوں میں چینیلی کی خوشبو تھی۔ میری آنکھوں میں تمہارے انتظار کی شمعیں روشن تھیں۔ آج مجھے اکیلی گھر واپس آتے ہوئے بہت ہی ڈر لگا تھا۔ میں بالکل تنہا تھی۔ میں نے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی چاندی کے جھمکے اُتار کر پھینک دیئے ہیں۔“

جھیل اور جزیرہ

لنڈن میں قیام کے اگلے چند روز معمولی خرید و فروخت اور اُنڈلس کے سفر کی تیاری میں گزرے۔ پیسوں کی کمی کے باوجود اپنی پیاری بہنوں کے لیے خوب صورت سویٹر خریدے۔ لنڈن سے اُن کے لیے کوئی تحفہ نہ لے جا کر میں ساری زندگی جملے ہوئے ٹوسٹ اور کدو بیکن جیسی سبزیاں کھانے کا خطرہ مول نہ لے سکتا تھا۔ دنیا کے سب سے قدیم سفری ادارے تھامس ٹک کی وساطت سے لنڈن سے سان سباستیان (ہسپانیہ) براستہ پیرس کا ٹکٹ خریدا جس پر پندرہ پاؤنڈ اٹھ گئے۔ میرا ارادہ تھا کہ یہاں سے برمنگھم جاؤں جہاں عرصہ دراز سے میرے رشتے کے چچا مقیم ہیں۔ اور پھر وہاں سے انگلستان کے لیک ڈسٹرکٹ (Lake District) یعنی جھیلوں کے ضلع کی طرف نکل جاؤں۔ لیک ڈسٹرکٹ سے واپس لنڈن اور سیدھا پیرس۔ چغتائی نے مشورہ دیا کہ مجھے یہ سفر بذریعہ بس طے کرنا چاہئے۔ اس طرح انگلستان کے دیہی مناظر سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے۔ وہ مجھے بس سٹیشن تک چھوڑنے آیا۔ میں نے اُس کی بے مثال مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو بڑے پیار سے کہنے لگا۔ ”بادشاہو! جانے دو۔“

برمنگھم کے راستے میں انگلستان کا مشہور قصبہ کوونٹری پڑتا ہے جسے دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمنوں نے ہوائی بم باری سے مکمل طور پر تباہ کر دیا تھا۔ کوونٹری کا مشہور کلیسا بھی اس تباہی کا شکار ہوا۔ اس کی جلی ہوئی صلیب اور منبر آج بھی اُسی حالت میں پڑے ہیں۔ انہی کھنڈروں کے پہلو میں جرمن نوجوانوں کی مدد سے پہلے سے کہیں زیادہ عالی شان کلیسا تعمیر کیا

گیا ہے۔ یہ جرمن نوجوان اپنے بزرگوں کی کرتوتوں پر پشیمان تھے۔ چنانچہ تلافی کے طور پر اس کلیسا کی از سر نو تعمیر میں ہاتھ بٹایا۔

برمنگھم پہنچا تو چچا بشیر بے حد خوش اخلاقی اور شفقت سے پیش آئے۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر جب فوج میں کٹوتی ہوئی تو وہ بھی اس زد میں آ گئے اور سیدھے برمنگھم سدھارے جہاں وہ آج کل ملکہ معظمہ کا ڈاک کا محکمہ نہایت خوش اسلوبی سے چلا رہے ہیں۔ اُن کے گھر کا ماحول خالصتاً پاکستانی ہے۔ انہوں نے اپنی اکلوتی بیٹی خالدہ کو گھر پر ہی زیور تعلیم سے آراستہ کیا۔ میں نے اپنے قیام کے دوران اُس نیک بی بی کو باورچی خانے سے باہر قدم رکھتے نہیں دیکھا۔ برمنگھم کی مسجد میں اُن کے دونوں لڑکے مدر اور مبصر اتنی خوش الحانی سے قرأت کرتے ہیں کہ انگریز بھی دنگ رہ جاتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ شام کی چائے کے بعد چچا پوچھیں گے کہ برخوردار آج کتنے بجے واپس جا رہے ہو؟ مگر معلوم ہوا کہ انگلستان میں طویل قیام نے اُن کی پاکستانی شفقت اور مہمان نوازی پر ڈاکے نہیں ڈالے۔ چنانچہ زبردستی تین روز تک ٹھہرائے رکھا۔ خوب خاطر مدارات کی بلکہ چلتے وقت ایک اوٹی سوٹ کا کپڑا بھی تحفے میں دیا۔

میں صبح آٹھ بجے سے مانچسٹر شہر کے نواح میں راہڈیل روڈ پر لفٹ کے انتظار میں پاؤں سپارے لیٹا تھا۔ برمنگھم سے بذریعہ ٹرین مانچسٹر آیا اور اسٹیشن سے بس پر سوار ہو کر راہڈیل روڈ پر آ گیا جو لنکاسٹر کو جاتی تھی۔ لنکاسٹر سے پرے ایک ڈسٹرکٹ تھا جس کے بارے میں انگریزوں کو زعم ہے کہ وہ سوئزر لینڈ اور اطالیہ کی ہمسری کرتا ہے۔ میں نے آج ایک مرتبہ پھر بیچ ہانگنگ کو ذریعہ سفر بنانے کی حماقت کی تھی۔ دوپہر ہونے کو آئی۔ ہزاروں کاریں گزریں لیکن کوئی کار ایسی نہ آئی جس پر ہمارے نام کی مہر ہوتی۔ چنانچہ جب متواتر چار گھنٹے اینشن کھڑے رہنے کے باوجود قسمت نے یاوری نہ کی تو میں سامان کندھے سے اتار کر سڑک کے کنارے گھاس پر لیٹ کر سستانے لگا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد کالے رنگ کی ایک دقیانوسی کار دھچکے کھاتی ہوئی میرے پاس آڑکی۔ بوڑھے انگریز ڈرائیور نے پائپ منہ سے نکالا اور بڑے غور سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے بھی خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی، کیونکہ اس ہچکولے کھاتی ڈھینچوں ڈھینچوں کرتی کار میں اگر لفٹ کی پیشکش ہو جاتی تو ہڈیاں تروانے کے علاوہ شاید میں اگلی سردیوں

تک ہی ایک ڈسٹرکٹ پہنچ جاتا۔

”بیٹا اگر یہاں سونے کے ارادے سے لیٹے ہو پھر تو ٹھیک ہے، اور اگر لفٹ چاہیے تو میں لنکاسٹر تک جا رہا ہوں۔“ بوڑھے نے اپنا بوسیدہ مفکر کانوں کے گرد پلٹیتے ہوئے کہا۔

”یہاں لیٹے رہنے سے فائدہ؟“ میں نے سوچا۔ ”کم از کم یہ کھٹار حرکت میں تو ہے۔“ چنانچہ میں نے چہرے پر ایک مصنوعی مسکراہٹ سجا کر بوڑھے کا شکریہ ادا کیا اور سامان اٹھا کر کار میں بیٹھ گیا۔ اب شاید میرے تن و توش کا قصور تھا یا کار کا ارادہ پہلے سے ہی مراقبے میں جانے کا تھا۔ میرے بیٹھے ہی پھٹ پھٹا آ پھٹ کی آواز آئی اور کار بند ہو گئی۔ ”ایک سیکنڈ لگے گا۔“

بوڑھے نے منہ سے پائپ نکال کر چنگی بجائی اور کار سے باہر نکل کر پچھلی نشست پر رکھی ہوئی چابی اٹھا کر فوراً کار کے تختوں میں گھسیڑ دی۔ چابی کے استعمال نے نسوار کا کام دیا اور کار کا انجن دوچار پھس پھس جھینکیں مارنے کے بعد ایک مرتبہ پھر پھٹ پھٹ کی آوازیں نکالنے لگا۔ ”اب یہ ایک پرندے کی مانند اڑے گی۔“ بوڑھے نے کار میں بیٹھے ہوئے خوشدلی سے کہا۔ سفر جاری ہوا اور دس منٹ بعد یہ پرندہ پھر پدمسمیت کر زمین بوس ہو گیا۔ ”ایک سیکنڈ....“ بوڑھے نے پھر چنگی بجائی اور کار سے باہر نکل گیا۔ بہر حال پورے سفر کے دوران میں بوڑھا چنگیاں بجاتا رہا اور پرندہ چھدکتا رہا۔ یہاں تک کہ لنکاسٹر کا شہر آ گیا۔ اُس نے مجھے شہر سے چند میل باہر اتار دیا اور خود دائیں ہاتھ مڑ کر ”آئرش سمندر“ کے کسی ساحلی قصبے کی طرف چلا گیا۔

شام ہو چکی تھی۔ میں نے سوچا کہ اب مزید ہائیکنگ کی بجائے شب ب سری کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کر کے خیمہ نصب کر لیا جائے۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی دُور دُور تک کوئی آبادی نہ تھی۔ تاحد نگاہ ہرے بھرے کھیت اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ میں سڑک سے نیچے اتر کر پہلو میں جاتی ہوئی ایک پگڈنڈی پر ہولیا، جو تھوڑی دُور جا کر لکڑی کے ایک پھانک کے پاس ختم ہو گئی۔ پھانک کے دوسری جانب ایک وسیع میدان نظر آ رہا تھا جس کے درمیان میں ایک گدلا جو بڑھتا تھا۔ جو ہڑ کے کنارے بطوں کا ایک غول کچڑ میں سے کیڑے مکوڑے چگنے میں مصروف تھا۔ میں نے اپنا سامان پھانک کے اوپر سے پھینکا اور سال خوردہ لکڑی کے ایک تختے پر پیر جما کر دوسری طرف پھلانگ گیا۔ جو ہڑ کے کنارے ایک ہموار جگہ پر میں نے اپنا سامان

رکھا۔ خیمے کا کپڑا زمین پر پھیلا یا اور کونوں میں میخیں ٹھونکنے لگا۔ خیمہ گاڑنے کے پہلے مرحلے سے فارغ ہو کر میں ابھی خیمے کے درمیان میں نصب کیے جانے والے ڈنڈے جوڑ رہا تھا کہ میرے کانوں میں جنہنہانے اور بھونکنے کی ملی جلی آوازیں آئیں۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو جو ہڑ سے پرے کچی گڈنڈی پر ایک گھڑسوار آ رہا تھا۔ اُس کے پیچھے چند قدم کے فاصلے پر ساٹ نسل کا ایک ٹیریز کتا دم بلاتا اور بھونکتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہلکی شفق کے پس منظر میں گھڑسوار اور اُس کا کتا مصور کانشیل کی دیہی مناظر کی کسی شاہکار تصویر کا ایک متحرک جز ہوں۔ جو ہڑ کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر سوار نے گھوڑا روک لیا۔ وہ ایک نوجوان اور نہایت صحت مند لڑکی تھی جس کے چہرے کی شگفتگی اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ وہ شہر کے ہنگاموں سے دور کھلی فضا میں زندگی بسر کرنے کی عادی ہے۔ اُس کا چہرہ میک اپ کی غیر موجودگی میں بھی دلکش نظر آ رہا تھا۔ گھڑسوار کی چست لباس اُسے بے حد سج رہا تھا۔ وہ کچھ دیر وہیں گھوڑے پر بیٹھی رہی جیسے وہ اس بات کا تعین نہ کر پائی ہو کہ اُس گدلے جو ہڑ کے کنارے اس شام میری موجودگی کا کیا مقصد ہو سکتا ہے اور پھر اُس نے یکجہٹ گھوڑے کو ایڑ لگائی اور جو ہڑ کا چکر کاٹ کر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اُس کا پستہ قد ٹیریز کتا مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر رُک کر قدرے بے دلی سے بیخ کن کرنے لگا۔

”وہسکی!“ لڑکی نے زور سے پکارا اور کتا خاموش ہو کر دم بلاتا اپنی مالکن کے پاس چلا گیا۔ لڑکی نے میرے سامان اور خیمے پر ایک سرسری نظر ڈالی اور میری طرف دیکھے بغیر کہنے لگی۔ ”یہ جو ہڑ اور اس کے گرد و نواح کا تمام علاقہ ہماری ذاتی ملکیت ہے اور تم بغیر اجازت اندر داخل ہو کر قانون شکنی کے مرتکب ہو رہے ہو۔ شاید تم وہ پھانک پھلانگ کر اندر داخل ہوئے ہو جو ناپسندیدہ اشخاص کو باہر رکھنے کے لیے لگایا گیا ہے۔“ اور ساتھ ہی اُس نے چابک سے سفید پھانک کی طرف اشارہ کیا۔ لکڑی کی ایک باڑھ دُور دُور تک کھیت کے گرد ایک خاص علاقے کی نشاندہی کر رہی تھی۔ لڑکی کا اعتراض درست تھا۔ میں نے چپ چاپ اپنا سامان سمیٹ کر تھیلے میں رکھنا شروع کر دیا۔ ”ٹھیک ہے انگریز کا گھراس کا ذاتی قلعہ ہوتا ہوگا۔“ میں نے بے حد تلخ ہو کر کہا۔ ”لیکن اگر ایک رات کے لیے میں اس ویران کھیت میں خیمہ نصب کر لیتا تو اُن کی ذاتی زندگی کس حد تک متاثر ہو سکتی تھی؟“

لڑکی خاموشی سے مجھے خیمہ لپیٹتے اور سامان باندھتے دیکھتی رہی۔ جب میں نے اس کام سے فارغ ہو کر تھیلہ کاندھے پر رکھا تو وہ گھوڑے سے اتر کر میرے پاس آ گئی اور بڑی نرمی سے کہنے لگی۔ ”اگر تم پسند کرو تو یہاں سے کچھ فاصلے پر واقع ہماری دیہی اقامت گاہ میں شب بسر کر سکتے ہو۔“ میں نے سر اٹھا کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

”بہت بہت شکریہ۔“ میں نے قدرے تاہل کے بعد دعوت قبول کر لی۔ اس کے

سوا چارہ بھی کیا تھا۔

لڑکی نے رکاب میں پاؤں ڈالا اور بڑی پھرتی سے گھوڑے پر سوار ہو کر اُس کا رخ واپس کچی گڈنڈی کی طرف موڑ دیا۔ ”میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔“

”میں بھی بیٹھ جاؤں؟“ میں نے راستے کی طوالت کے پیش نظر تجویز پیش کی۔

”کہاں؟“ اُس نے گردن کو بل دے کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔

”گھوڑے پر!“

”گھوڑے پر؟“ اُس کے لہجے میں شدید حیرت تھی۔ ”یہ عام سواری کا گھوڑا نہیں بلکہ

اعلیٰ نسل کا دوڑ میں حصہ لینے والا جانور ہے۔ بہر حال میں شہنشاہ سامان آگے رکھ لیتی ہوں۔“

اپنے وزنی سامان سے نجات حاصل کر کے میں تیزی سے گھڑسوار لڑکی کے پیچھے پیچھے

چلنے لگا۔ ٹیریز کتا وہسکی گھوڑے کی ست رفتاری سے فائدہ اٹھا کر آگے آگے بھاگا جا رہا تھا۔

ہمارے گرد میلیں تک کسی آبادی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ شب کے سرمئی اندھیرے میں سبز کھیت

اور درخت سیاہی مائل ہو چکے تھے اور ان کے درمیان کچی گڈنڈی ایک مانگ کی مانند اس سیاہی کو

حیرتی دُور تک چلی گئی تھی۔ تقریباً دو میل چلنے کے بعد درختوں کا ایک گھنا جھنڈ آیا جس کے آخر میں

ایک قدیم دیہی اقامت گاہ کی پر شکوہ عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ اقامت گاہ کے گرد ایک وسیع

میدان پھیلا ہوا تھا جس کے چاروں طرف ایک بلند حفاظتی دیوار تھی۔ درمیان میں لوہے کا ایک

بلند پھانک تھا۔ لڑکی گھوڑے سے اتری جیب میں سے چابیوں کا ایک گھنا نکال کر ایک وزنی چابی

پھانک کے قفل میں گھمائی اور اُسے کھول کر گھوڑے کی باگیں ہاتھ میں تھامے میرے آگے آگے

چلنے لگی۔ گھوڑے سے اترتے وقت سامان کا تھیلہ اُس نے مجھے تھما دیا تھا۔ ٹیریز کتا اب اس

کوشش میں تھا کہ میرے ساتھ دوستانہ تعلقات کا آغاز کر دے اور وہ بار بار اپنی نم آلود تھوپی میرے پاؤں میں رگڑتا اور دم ہلاتا جا رہا تھا۔ اقامت گاہ کی چھت کے اوپر ایک چمنی سے سفید دھوئیں کی ہلکی سی لکیر دکھائی دے رہی تھی جس کے نیچے شاید بادورچی خانہ تھا۔ صدر دروازے پر پہنچ کر لڑکی نے گھوڑے کو ایک تھکی دی اور اُسے وہیں چھوڑ کر دیوار میں نصب گھنٹی کا بٹن دبایا۔ دروازہ ایک بوڑھے انگریز نے کھولا۔ وہ آئرش ٹوئڈ کے اونٹنی کوٹ اور سیلیٹی رنگ کی پتلون میں نہایت وجیہ اور مدبر لگ رہا تھا۔

”آئرن ڈارلنگ تم پورے پینتیس منٹ دیر سے واپس لوٹی ہو، کہیں گھوڑا تو نہیں بدک گیا تھا؟“

”نہیں ڈیڈی۔ گھوڑا تو سو پر تھا۔“ لڑکی نے بوڑھے کے سرخ گالوں پر ایک مختصر سا بوسہ دیتے ہوئے پیار سے کہا۔ اس دوران میں بوڑھے کی نگاہ مجھ پر پڑی اور اُس نے سوالیہ نگاہوں سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔

”ڈیڈی یہ سیاح ہیں اور آپ کی پیاری بطنوں والے جوہڑ کے کنارے خیمہ نصب کرنا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں شب ب سری کے لیے اپنے ہاں مدعو کر لیا ہے۔ بالائی منزل کے تمام کمرے تو خالی ہی پڑے ہیں نا؟“

”تم نے بڑا اچھا کیا آئرن۔ جوانی میں مجھے بھی سیاحت کا خبط تھا۔“ بوڑھے نے شفقت سے لڑکی کا کندھا تھپکا اور پھر مجھ سے سامان لے کر ہال کے ایک کونے میں رکھ دیا جہاں کیچڑ سے بھرے ہوئے بوٹ اور اور کوٹ رکھے تھے۔ باپ بیٹی نے مجھے رات کے کھانے کی دعوت دی جو میں نے قبول کر لی۔ گائے کے گوشت اور یارک شائر پڈنگ کے لذیذ ڈز کے بعد کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے بوڑھے نے مجھے اپنے بارے میں بتایا۔ وہ ساتھ ساتھ باپ کے کش بھی لگا رہا تھا۔ یہ عالیشان گھر کئی پشتوں سے اُس کی خاندانی ملکیت چلا آ رہا تھا۔ نوکری کے زمانے میں تو اس کے کمرے گرد سے اٹے رہے اور دروازوں پر بھاری قفل پڑے رہے مگر شاہی بحریر میں ایک اعلیٰ عہدے سے ریٹائر ہو کر اُس نے اپنی بیٹی آئرن کے ہمراہ باقی ماندہ زندگی ہمیں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ اتنی بڑی عمارت میں اُن دونوں کے علاوہ صرف ایک مالی اور اصطبل کا رکھوالا رہتا تھا۔ اُس کا مشغلہ اعلیٰ نسل کے گھوڑے پالنا اور اُس گدلے جوہڑ میں خود بخود پلنے والی

بطنوں کی رکھوالی کرنا تھا۔ اُس نے اپنے پائپ کا تمباکو ایک چمٹی سے جماتے ہوئے بتایا کہ ہر اتوار وہاں سے چند کوس کے فاصلے پر ایک دیہی گھڑ دوڑ کے میدان میں اُس کے گھوڑے بھی مقابلے میں حصہ لیتے ہیں اور ہمیشہ امتیازی حیثیت حاصل کرتے ہیں۔ ہال میں جا بجا اعلیٰ نسل کے گھوڑوں کی تصاویر آویزاں تھیں جو بوڑھے کے اس شوق کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔ اُس کی بیٹی آئرن ڈز سے قفل گھڑ سواری کا مردانہ لباس تبدیل کر کے سیاہ رنگ کا ایک اونی لباس پہن آئی تھی اور یقیناً پہلے سے کہیں زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔

بوڑھا خاصی دیر تک باتیں کرتا رہا اور بالآخر وہیں صوفے پر بیٹھا اونگھنے لگا۔ آئرن نے آہستہ سے اس کا بچھا ہوا پائپ انگلیوں سے نکال کر رکھ دان میں رکھ دیا۔

”اس سے پہلے کہ تم بھی اونگھنے لگو چلو میں تمہیں تمہارے کمرے تک چھوڑ آتی ہوں۔“ اُس نے ہنس کر کہا۔

ہم ہال کے درمیان میں سے جاتی ہوئی سیڑھیوں کو طے کر کے دوسری منزل پر آ گئے۔ آئرن نے بینڈ بیگ سے چابیوں کا وہی گچھا نکالا اور پہلے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ ”شب بخیر۔“ اس نے گردن میں ہلکا سا خم دے کر کہا ”اور سہانے خواب“ اور دروازہ بند کر کے چلی گئی۔ وکٹورین طرز کے قدیم فرنیچر سے آراستہ کمرہ بے حد آرام دہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے پلنگ پر بیٹھ کر ایک سگریٹ پیا اور پھر اپنا سامان کھول کر کپڑے بدلنے کی تیاری کرنے لگا۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو باہر آئرن کھڑی تھی۔

”تم دو چار روز ہمارے ہاں کیوں نہیں ٹھہر جاتے۔ اتوار کو گھڑ دوڑ بھی ہے۔ میں تو اس ویران گھر، سستان کھیتوں اور ڈیڈی کی بطنوں سے تنگ آ گئی ہوں۔“ اُس کی دعوت میں خلوص کے علاوہ کوئی اور جذبہ بھی پنہاں تھا۔

”بہت بہت شکریہ۔“ میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”در اصل میں نے لیک ڈسٹرکٹ دیکھنے کے بعد فرانس اور ہسپانیہ بھی جانا ہے اور میں ترکی میں برف باری سے قبل ہی وطن لوٹ جانا چاہتا ہوں۔ اگر میرے پاس وقت ہوتا تو....“

”خیر کوئی بات نہیں....“ اُس نے جلدی سے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ تمہارے آرام میں مغل ہوئی۔“ اور تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی گئی۔ میں تھوڑی دیر وہاں کھڑا آئرن کے

بارے میں سوچتا رہا اور پھر دروازہ بند کر کے اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

رات کے پچھلے پہر یکدم میرے دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ گھڑی پر نظر ڈالی تو چار بج رہے تھے۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور دروازہ کھول دیا۔ باہر گھنی سرخ داڑھی اور لمبے بالوں والا ایک نوجوان کھڑا تھا۔

”میں اصطبل کا رکھوالا اونیل ہوں۔ پچھلی شب مس آئرین نے مجھے ہدایت کی تھی کہ آج صبح جب میں معمول کے مطابق گھر کا سودا سلف لانے لگا سڑ جاؤں تو آپ کو ایک ڈسٹرکٹ جانے والی شاہراہ پر چھوڑ آؤں۔“ اُس نے بھاری آئرش لہجے میں کہا۔

میں نے جلدی سے اپنا سامان اکٹھا کیا، کاغذ کے ایک پرزے پر آئرین کے نام شکریے کے دو حرف لکھے اور نیچے آکر ٹریکٹر کے پیچھے لگی ہوئی ٹرائی پر بیٹھ گیا۔ اونیل نے ڈرائیور کی نشست پر بیٹھ کر صبح کی سردی کے اثرات زائل کرنے کے لیے دونوں ہاتھ آپس میں رگڑے اور ٹریکٹر کا انجن سٹارٹ کر دیا۔ اگرچہ ابھی موسم گرم تھا، مگر صبح کی ہوا میں کٹ کھانے والی سردی کی لہریں تھیں۔ میں نے بڑی مشکل سے سامان کھولا اور اپنی ہراتی پوتین پہن لی جو کافی عرصے سے بیکار پڑی تھی۔ ارد گرد کے کھیتوں اور درختوں پر دھند کی تہیں جمی تھیں۔ تھوڑی دیر میں ہم بڑی سڑک پر پہنچ چکے تھے جہاں اونیل نے مجھے عین اسی جگہ اتار دیا، جہاں سے میں کل شام گد لے جو ہڑ والے کھیت میں اتر تھا۔ سڑک بالکل تاریک تھی اور ٹریفک نہ ہونے کے برابر۔ پچھلی شب کی بے خوابی کی وجہ سے مجھ پر ابھی تک نیند کا غلبہ تھا، چنانچہ میں نے سامان سڑک کے کنارے رکھا اور پوتین کو اپنے گرد لپیٹ کر وہیں سو گیا۔

صبح کا اُجالا ہوا تو میں نے قسمت آزمائی شروع کر دی۔ تقریباً دو گھنٹے بعد ایک موٹر سائیکل سوار نے مجھ پر کرم کیا اور لفٹ کی پیشکش کی۔ میں ابھی اپنے آپ کو پچھلی نشست پر جمانے کی کوشش کر رہا تھا کہ موٹر سائیکل ایک دھچکے کے ساتھ سڑک پر نہایت تیز رفتاری سے دوڑنے لگی۔

میری پشت پر سامان کا وزن مجھے پیچھے کھینچ رہا تھا اور میں دونوں ہاتھوں سے سوار کی کمر مضبوطی سے تھامے اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ خواہ مخواہ یہ مصیبت مول لے لی۔ بہر حال کم از کم

تیز رفتاری کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ہم جلد ہی اُس مقام پر پہنچ گئے جہاں سے ایک ڈسٹرکٹ کی پہلی جھیل ونڈر میر کا آغاز ہوتا ہے۔

جھیل ونڈر میر کی پہلی جھلک بے حد مایوس کن تھی۔ کوتاہ قد اور کچی سرسبز پہاڑیوں کے درمیان میلوں پھیلا ہوا گد لے پانی کا ایک قطعہ جو پچھلی شب والے جوہر سے کسی طور کم نہ تھا۔ بلکہ اُسی قسم کی بطنیں بھی یہاں موجود تھیں۔ کنارے پر آکس کریم اور مناظر کے کارڈ فروخت کرنے والوں کے بھدے کھوکھوں نے رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔ یہاں چونکہ ٹریفک بے حد کم تھی، اس لیے میں ہائیکنگ کا خیال ترک کر کے ایک مقامی بس پر سوار ہو کر ایمیل سائیڈ کے خوبصورت قصبے تک چلا گیا۔ لنڈن سے چلتے وقت چغتائی نے مشورہ دیا تھا کہ ایمیل سائیڈ سے جھیل کے آخری سرے پر واقع قصبے گراس میر تک نہایت پر فضا راستہ جاتا ہے اس لیے یہ ٹکڑا پیدل طے کرنا۔ چغتائی نے شاید سناٹی بات کہہ دی تھی۔ یہ علاقہ یقیناً بے حد حسین ہوگا۔ لوگ جو کہتے ہیں بلکہ میں نے پڑھ رکھا ہے کہ ایک پاکستانی سیاح خاتون کا یہاں سانس بند ہونے کو آیا۔ علاوہ ازیں تیس سیروزنی تھیلا کندھے پر اٹھا کر پریڈ کرنے سے شاید میری خوب صورتی کی حس بھی دب کر رہ گئی تھی۔ مجھے وادی نیلیم کی جڑواں جھیلیں، وادی کاغان کی سیف الملوک، اطالیہ کی لاگاموری اور سوئٹزرلینڈ کی لاک لامن یاد آ گئیں۔ میں نے لاک لامن کے کنارے جنیوا سے ماٹرے شہر تک پیدل سفر کیا ہے۔ اس وقت بھی میرے کندھوں پر اتنا ہی بوجھ تھا لیکن اُس سفر کی یاد کا ہر لمحہ نیلگوں پانیوں، انگور کی بیلوں، خودرو پھولوں اور نباتاتی انباروں کی مہک سے وابستہ ہے اور پھر کالج کے زمانے میں وادی نیلیم کی کوہ پیما کی دوران میں اُن جڑواں جھیلوں کی سحر انگیز خوب صورتی، درمیان میں تیرتے ہوئے برفانی تودے۔ ہلکے نیلے پہاڑوں میں سے جھیل میں گرتے ہوئے نقرتی آبشار، کناروں پر میلوں تک پھیلے ہوئے سرخ گل لالہ کے قالین.... ان خوب صورتیوں کا تصور زندگی کے تاریک ترین لمحوں میں بھی شفق رنگ بھر دیتا ہے۔ میں انہی خیالوں میں غلطاں چلا جا رہا تھا کہ کسی نے مجھے ”ہے ہے“ کہہ کر پکارا۔ سڑک کے بائیں ہاتھ پر ایک کامیج کے باغیچے میں بیٹھی ہوئی اُدھیز عمری اماں مجھے ہاتھ کے اشارے سے بلا رہی تھیں۔ میں اُن کے پاس گیا تو کہنے لگیں۔ ”تمہارے پاس جوان لڑکیوں کی ریشمی جرابیں ہی ہیں یا ہم درمیانی عمر کی عورتوں کے لیے اونی موزے بھی بیچتے ہو؟“

”ریشمی جرابیں؟“ میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”تم پھیری لگا کر جرابیں یا بنیائیں بیچنے والے پاکستانی نہیں ہو؟“ بڑھیا نے اپنا پو پلا

منہ ہلایا۔

”مائی میں تو ایک سیاح ہوں۔ بھولے سے ادھر آ نکلا ہوں۔ آئندہ ایسی غلطی نہ

ہوگی۔“ میں نے جل کر کہا۔

”غلطی مجھ سے ہوگئی ہے۔“ بی اماں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”در اصل اس علاقے

میں بے شمار پاکستانی اس قسم کا کاروبار گھوم پھر کر کرتے ہیں۔ میں سمجھی تم کا ندھے پر جرابیں اور

بنیائیں اٹھائے بیچ رہے ہو۔“ میں بڑی اماں کو کرسی پر سر ہلاتے چھوڑ کر واپس سڑک پر آ گیا اور اپنا

سفر جاری رکھا۔

پچھلے پہر جب میں چلتے چلتے تھک کر چور ہو گیا تو ایک موڑ کے دوسری طرف جھیل کے

سرے پر سرسبز و شاداب پہاڑوں میں گھرا ہوا گراس میر کا قصبہ دکھائی دیا۔ دیدہ زیب گھر اور قدیم

کلیسا کی پتھریلی عمارت کا عکس پہلو میں لیٹی ہوئی جھیل کے خاموش پانی میں جھلک رہا تھا۔ میں نے

دائیں جانب نگاہ ڈالی تو جھیل کے وسط میں بلند و بالا درختوں اور بیلوں سے اٹا ہوا ایک ننھا سا

جزیرہ تیر رہا تھا۔ جزیرے سے پرے دوسرے کنارے پر چند خیمے دکھائی دے رہے تھے جو گراس

میر کی ”کیمپنگ“ تھی۔ چونکہ جہاں میں کھڑا تھا وہاں سے اُس کیمپنگ تک پہنچنے کے لیے کسی کشتی

وغیرہ کا انتظام نہ تھا اس لیے پہلے مجھے جھیل کی نل پر گراس میر تک جانا پڑا اور پھر وہاں سے ساحلی

سڑک پر چلتا ہوا کیمپنگ تک پہنچ گیا۔ کیمپنگ کے مالک سے روزانہ ضروریات کی سہولتوں کے

بارے میں استفسار کیا تو کہنے لگا۔ ”ہم نے اس کیمپنگ کو قدرتی حسن کے پہلو بہ پہلو جگہ دی ہے

اور یہاں زندگی بھی قدرتی اصولوں کے تابع ہونی چاہئے۔ خوراک صرف قصبے کے ستور سے ملے

گی۔ نہانے کے لیے جھیل و نڈر میر کا نیلا پانی جو ہے اور باقی ضروریات سڑک کے پار گھنے درختوں

میں پوری کی جاسکتی ہیں۔“ مجھ میں اب اتنا دم خم نہیں تھا کہ صرف کھانے کی خاطر گراس میر کے

قصبے کا قصد کرتا۔ اس لیے جھیل کنارے خیمہ نصب کیا۔ چند بسکٹ کھا کر جھیل کا پانی پیا اور صبر شکر

کر کے سو رہا۔

دوسری صبح میں دیر تک سوتا رہا۔ جب اپنے خیمے سے باہر نکلا تو موسم بے حد خوش گوار تھا۔

تیز دھوپ میں جھیل کی سطح اس قدر چمک رہی تھی کہ نظر بھر کر دیکھنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ سب سے پہلے

میں نے ”قدرتی اصولوں“ کی پیروی کرتے ہوئے گھنے درختوں کی سیر کی اور پھر جھیل کے پانی سے

منہ ہاتھ دھو کر گراس میر کے قصبے کی طرف چل دیا جو وہاں سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھا۔

ایک ڈسٹرکٹ میں گراس میر رومانوی تحریک کے روح رواں شاعر ورڈزورتھ کی نسبت

پہچانا جاتا ہے۔ قصبے کے آغا میں DOVE COTTAGE کی دیدہ زیب عمارت قدیم

برطانوی طرز تعمیر کا ایک دلکش نمونہ ہے۔ اسی گھر میں ورڈزورتھ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزارا۔

ڈوکا منج سے چل کر قصبے میں داخل ہوں تو بائیں ہاتھ پر ایک بھدے اور قدیم کلیسا کے دیران

قبرستان میں اپنے خاندان اور دوسرے افراد کے پہلو بہ پہلو ورڈزورتھ ابدی نیند سو رہا ہے۔ اُس

کی قبر پر سنگ مرمر کا سادہ سا کتبہ اُس کی شاعری کی روح سے ہم آہنگ ہے۔ بچپن میں

ورڈزورتھ کی نظم ”ڈیفیوڈ“ پڑھی تو اس کے خوب صورت شعروں نے میرے ذہن پر فطرت کے

حسن اور اس کی رعنائیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ میرے سامنے گراس میر اور قصبے کے گرد و اح کی

رنگین شبیہیں ابھرتیں اور جھیل کے کنارے تاحد نظر ڈیفیوڈ کے پھول ناچنے لگتے۔ ایک مقامی

گائیڈ نے اُس مقام تک میری راہبری کی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ورڈزورتھ نے وہاں

فطرت کی نی رنگیوں میں ڈوب کر ڈیفیوڈ کی لازوال نظم تخلیق کی۔ میرے سامنے ایک بے حد سیاہ

قسم کا منظر تھا۔ گدے لے پانی کے ساتھ لہلہاتے پھولوں کی بجائے بدنما گھاس اور سرکنڈے اُگے

ہوئے تھے۔

گراس میر ایک ایسا قصبہ ہے جس کے گھر، کلیسا، شراب خانے اور چاروں طرف پھیلے

ہوئے قدرتی مناظر خوب صورتی اور عظمت کا ایک حسین خواب دیکھ کر ابھی تک بیدار نہیں ہوئے۔

کوچہ و بازار میں گھومنے تو تنہائی اور اداسی کا احساس ہوتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم وقت و

زماں کی قیود سے آزاد ہو کر صدیوں قبل اُن زمانوں میں چلے گئے ہیں جب مناظر فطرت کا شیدائی

ورڈزورتھ اپنا پورا دن کسی حسین وادی میں یا جھیل کے کنارے کسی خاموش کنج میں گزار کر گھر واپس

جاتے ہوئے انہی گلیوں میں سے گزرتا تھا۔ وہ گرد و پیش کے ماحول سے بے خبر سر جھکائے زیر لب

اپنی تازہ نظم کے اشعار گنگنا رہا ہوتا تھا۔

گراس میر میں سارا دن گھومنے کے بعد جب میں شام کو واپس کیمپنگ کی طرف روانہ ہوا تو جھیل کے ساتھ جاتی ہوئی سڑک تاریک اور سنسان تھی۔ اس خاموشی میں صرف جھیل کے سرکنڈوں میں بسیرا کرنے والے مینڈکوں اور جھینگروں کے ٹرانے کی آوازیں بکھر رہی تھیں۔ کبھی کبھار ساتھ والے جنگل میں سے کسی اُلوی ہو ہوا حوال کو اور بھی دہشت ناک بنادیتی۔

صبح ہوئی تو میں نے ایک مرتبہ پھر گراس میر جانے کی بجائے جھیل کے درمیان تیرتے پر اسرار جزیرے میں جانے کا فیصلہ کیا۔ میرے خیمے سے کچھ دُور گھاٹ پر چند کشتیاں کھڑی تھیں جنہیں کیمپنگ کا مالک کرائے پر دیتا تھا۔ میں نے ایک مضبوط اور نہایت چھوٹی کشتی آدھے دن کے لیے کرائے پر حاصل کر لی۔ جھیل کی سطح پر سکون تھی اس لیے کشتی کھینے میں چنداں دقت نہ ہوئی اور میں جلد ہی جزیرے کے پاس پہنچ گیا۔ جزیرے کے گرد پورا چکر کاٹنے پر بھی کوئی ایسی جگہ نہ ملی جہاں میں آسانی سے کشتی کھڑی کر کے ساحل تک پہنچ جاتا۔ چنانچہ میں کشتی سے پانی میں اتر گیا اور اُسے ساتھ بندھے رہنے کی مدد سے کھینچتا ہوا کنارے تک لے گیا۔ اس خیال سے کہ کہیں میری غیر موجودگی میں جھیل کی ہلکی لہریں کشتی کو بہانہ لے جائیں میں نے اُسے خشک ریت پر گھسیٹ لیا اور جزیرے کی سیر کو نکل گیا۔ جزیرہ بالکل بے آباد اور سنسان تھا۔ بلند اور تیار درختوں کے سائے میں کانٹے دار جھاڑیوں اور جنگلی گھاس کی بہتات تھی۔ ایک درخت کے تنے پر دو نام کھدے ہوئے تھے۔ اُن دونوں کو بھی شاید میری طرح اس جزیرے کا سحر یہاں کھینچ لایا تھا۔ ایک جگہ گھنے درختوں کی چھاؤں میں سرسبز گھاس اور خورد و جنگلی پھول تھے۔ میں اپنی برساتی بچھا کر لیٹ گیا۔ درختوں کے پتوں میں سے ہوا تالیاں بجاتی ہوئی گزرتی اور پھر ساتھ ہی جھیل کی لہروں کا ہلکا سا ارتعاش سنائی دیتا۔ دفعۃً مجھے احساس ہوا کہ اس علاقے کی خوب صورتی کے بارے میں میرا پہلا تاثر کس قدر مہمل تھا۔ یہاں فطرت کی رعنائیاں آپ کو پلک جھپکتے مسخر نہیں کر لیتیں بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ سادگی اور سکون دل میں اترنے لگتا ہے۔ ایک خوب صورت نظم کی طرح جسے صرف بار بار پڑھنے سے ہی اُس کی باریکیاں آپ پر عیاں ہوتی ہیں اور پھر آدی ہمیشہ کے لیے اُس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ کل دو پہر میں وہ سپاٹ منظر دیکھ کر کتنا مایوس ہوا تھا جہاں بیٹھ کر ”ڈیفوڈل“ لکھی گئی تھی لیکن ہو سکتا ہے کہ وہاں صرف موسم بہار میں ہی پھول کھلتے ہوں یا پھر وہاں ہمیشہ سے ہی بدنما گھاس اور سرکنڈے تھے جنہیں ورڈز ورتھ کی رومانوی جس نے لاکھوں جھومتے

ہوئے ڈیفوڈل کے پھولوں کی شکل میں دیکھا۔ قصور جگہ کا نہیں نظر کا ہوتا ہے۔ بلبل جہاں جاتی ہے اُس کی نظریں سرسبزی اور شادابی ڈھونڈتی ہیں اور یوم کو ہمیشہ دیرانوں کی تلاش ہوتی ہے۔

سورج اب میرے سر پر چمک رہا تھا۔ میں نے برساتی سمیٹی اور تیزی سے چلتا ہوا ساحل پر آ گیا۔ میری کشتی غائب تھی۔ پہلے خیال آیا کہ شاید غلط مقام پر آ نکلا ہوں، لیکن جزیرے کا پورا چکر لگانے پر بھی کشتی کا کوئی سراغ نہ ملا تو صورت حال کی نزاکت کا شدت سے احساس ہوا۔ میں اتنا اچھا تیراک نہ تھا کہ قوت بازو کے بل پر ہی واپس کیمپنگ تک پہنچ جاتا اور کسی دوسرے شخص کا اس جزیرے پر آنے کا امکان بھی کم تھا۔ میں انہی خیالوں میں مگن واپس اُسی جگہ پر آیا تو یہ دیکھ کر میری جان میں جان آئی کہ میری کشتی ساحل سے تقریباً بیس فٹ کے فاصلے پر خورد و گھاس میں اُلکی ہوئی ہے۔ میں کمر تک گہرے پانی میں چلتا ہوا کشتی تک پہنچا اور بڑی مشکل سے اس میں سوار ہو گیا۔ چپو کی مدد سے کشتی کو گھاس میں سے نکالا اور پھر رُخ کیمپنگ کی جانب موڑ دیا۔ واپسی پر کیمپنگ کے مالک نے بتایا کہ اگر میں تھوڑی دیر میں نہ لوٹتا تو وہ خود میری تلاش میں آنے والا تھا۔

اگرچہ لیک ڈسٹرکٹ میں ونڈر میر کے علاوہ اُلز وائر اور ڈرونٹ وائر کی خوب صورت جھیلیں بھی تھیں مگر میرے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ اس سے آگے بھی جاتا چنانچہ میں نے دوسری صبح واپس لنڈن جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے گھاٹ پر کشتیوں کے مالک سے درخواست کی کہ وہ مجھے میرے سامان سمیت جھیل کے دوسرے کنارے اُس مقام پر چھوڑ آئے جہاں سے مجھے چند روز پہلے کیمپنگ اور تیرتے ہوئے جزیرے کی پہلی جھلک دکھائی دی تھی۔ کشتی آہستہ آہستہ کیمپنگ سے دُور ہوتی گئی۔ بائیں ہاتھ پر وہی جزیرہ گزر گیا۔ دائیں ہاتھ پر جہاں جھیل ختم ہوئی تھی گراس میر نظر آ رہا تھا۔ شاعر فطرت ورڈز ورتھ کا مسکن اور مدفن۔ ہم دوسرے کنارے پر پہنچے تو گھڑیاں بجنا شروع ہو گیا جو ایک آہنی بھینسے کی مانند قصبے کے کلیسا کے مینار پر منہ کھولے جھوم رہا تھا۔ ٹن ٹن ٹن۔ اُس کی گھیر آواز جھیل کے پرسکون پانی پر سفر کرتی مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ آج اتوار تھی۔ مجھے آئین کا خیال آ گیا جو ایک دیران گھر سنسان کھیتوں اور ڈیڈی کی بطنوں سے تنگ آ گئی تھی۔ وہ آج اپنے بوڑھے ڈیڈی کے ہمراہ لنکا سٹر کے قریب گھر دوڑ دیکھنے گئی ہوگی۔

میں ایک مقامی بس کے ذریعے جھیل ونڈر میر سے لنکاسٹر تک آیا اور پھر ایکسپریس گاڑی پر سوار ہو کر لنڈن پہنچ گیا جہاں نیم تاریک وکٹوریہ سٹیشن پر پیرس جانے والی گاڑی تیار کھڑی تھی۔

”یہ گاڑی ڈیڑھ بجے ڈوور کی بندرگاہ تک پہنچے گی۔ وہاں سے صبح دو بجے سٹیئر چلے گا اور رودبار انگلستان عبور کر کے چھ بجے کے قریب آپ لوگ فرانس کی بندرگاہ ڈنکرک پر پہنچ جائیں گے اور پھر فرانسیسی گاڑی آپ کو ڈائریکٹ پیرس لے جائے گی۔“ گاڑی نے میرا ٹکٹ چیک کرتے ہوئے بتایا۔

اپنا بیج وینس

ہمارا سٹیئر رات کی تاریکی میں رودبار انگلستان کی سرد اور بھری ہوئی موجوں کو چیرتا فرانس کی بندرگاہ ڈنکرک کی جانب رواں تھا۔ انگلستان کے ساحل پر ڈوور (DOVER) کی مشہور زمانہ سفید چٹانیں جواب اندھیرے میں ٹیلیا لگ رہی تھیں آہستہ آہستہ ہم سے دور ہوتی جا رہی تھیں۔ چٹانوں کے پہلو میں شہر کا قدیم قلعہ برقی روشنیوں سے منور تھا۔ لہروں کے شور اور گھپ اندھیرے میں قلعے کے سنگلاخ درود یوار سے پھوٹی ہوئی ہلکی روشنی میں ایک مہیب قسم کی خوبصورتی تھی۔ میں جو اکثر کسی بھی شہر یا ملک سے جدا ہوتے وقت ضرورت سے زیادہ جذباتی ہو جایا کرتا ہوں انگلستان کے ساحل پر ڈوور کے طلسمی قلعے اور سفید چٹانوں کو نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھ کر قطعی طور پر غیر متاثر رہا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ہسپانیہ اور میرے درمیان فاصلے کم ہو رہے تھے۔ میرا ارادہ تھا کہ میں پیرس میں شب بسر کر کے دوسرے روز سان سباستیان (ہسپانیہ) کے لیے روانہ ہو جاؤں۔ ڈوور کا قلعہ اور اس کی روشنیاں اب صرف ایک روشن گولے کی صورت میں نظر آ رہی تھیں۔ سفید چٹانیں مکمل طور پر تاریکی میں ڈوب چکی تھیں۔ میں نے مخالف سمت میں فرانس کی جانب دیکھا۔ وہاں صرف تاریکی تھی۔ ڈنکرک کا شہر کوسوں دور تھا۔ میں نے اپنے گرد و پیش نگاہ دوڑائی تو عرشہ ویران پڑا تھا۔ تمام مسافرات کی خنکی اور سمندر کی نم آلود تیز و تند ہواؤں سے بچاؤ کی خاطر سٹیئر کی ٹخلی منزل میں واقع قہوہ خانے میں جا چکے تھے۔ میں نے اپنا سفری تھیلہ کا ندھے پر رکھا اور سیڑھیاں اتر کر قہوہ خانے میں آ گیا، جو کچھ بھرا ہوا تھا۔ یہاں پر لہروں کے شور کی بجائے انسانی آوازوں کا شور تھا۔ چند لوگ کافی پی رہے تھے اور کچھ مے نوشی

میں مشغول تھے۔ اکثریت کرسیوں اور میزوں پر ٹانگیں پھیلائے اوگھنے اور سونے کے درمیان مراحل میں تھی۔ دروازے کے ساتھ ٹیک لگائے سیاہ سوٹ اور باؤلر ہیٹ میں ملبوس ایک بوڑھا انگریز ہاتھ میں چھاتا لیے بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ اُسے شاید فرش پر کوٹ بچھا کر لیٹے ہوئے ایک جوان انگریز جوڑے کی ”حرکات“ دیکھنے سے سکتہ ہو گیا تھا، جو پیرس پہنچنے کا انتظار کیے بغیر دوبارہ انگلستان کے پانیوں پر رواں سینئر میں ہی فرانسیسی اخلاقی تہذیب کا پہلا سبق رٹنے میں ہمہ تن مصروف تھا۔ ایک جانب چند نو جوان انگریز موسیقار اپنے قد آور سازوں سے ٹیک لگائے اوگھ رہے تھے۔ وہ شاید جس شہرت کے متمنی تھے انہیں لنڈن میں نڈل سکی تو اب پیرس کا رخ کر رہے تھے۔ پیرس جہاں ہر فنکار کی قدر کی جاتی ہے چاہے وہ موسیقار ہو یا مصور۔ میں بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے میز کرسیوں اور انسانی جسموں میں سے راستہ بناتا قبوہ خانے کے کاؤنٹر تک پہنچا اور ویٹر سے کافی کا ایک کپ طلب کیا۔

”کافی؟“ کاؤنٹر کے ساتھ اونچی کرسی پر براجمان ایک پستہ قد سکاٹ نے اپنی مخمور اور تھیرزدہ آنکھیں مجھ پر جمادیں۔ ”شراب پیو لڑکے۔ شراب۔ سینئر پرنٹس فری ہے اور آدھی قیمت پر بکتی ہے۔“ اس نے لرزتے ہاتھوں سے کاؤنٹر پر رکھا شراب کا گلاس اٹھایا اور منہ سے لگا کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ ویٹر نے جو شاید تمام شب یہی فرض سرانجام دیتا رہا تھا، فوراً الماری میں سے بوتل نکالی اور گلاس پھر سے لبالب بھر دیا۔

”میں تو ہر ہفتے فرانس کا ایک چکر لگاتا ہوں۔“ سکاٹ نے گلاس کے کناروں سے بہتی ہوئی جھاگ انگلی سے اٹکھی کی اور انگلی منہ میں ڈال کر چٹخارے لیتے ہوئے کہنے لگا ”رات کا سینئر صبح تک ڈنکرٹ پہنچا دیتا ہے۔ سارا دن شہر میں آوارہ گردی کرنے کے بعد اُسی شام واپسی۔ سینئر کا دو طرفہ کرایہ سستی شراب پی کر ہی پورا کر لیتا ہوں۔“

”آپ نے یہ لڑکیوں کا لباس منی سکرٹ کیوں پہن رکھا ہے؟“ میں نے اس کے چار خانوں والے رنگدار اوئی کپڑے کے سکرٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ سکرٹ پر جیب کی بجائے ایک چرمی بوٹہ لٹک رہا تھا۔

”لڑکیوں کا لباس؟“ اس نے حیران ہو کر کہا اور جلدی سے شراب کی چسکی لے کر بولا۔ ”یہ تو سکاٹ لینڈ کے جری مردوں کا روایتی لباس کھٹ (KILT) ہے۔ ہاں البتہ تیز ہوا میں

اس کا سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔“ اور پھر اپنا بدبودار منہ میرے قریب لا کر بڑے رازدارانہ لہجے میں کہنے لگا ”بڑے فائدے کی چیز ہے۔ فرانس کی عورتیں تو فدا ہو جاتی ہیں بس!“

پستہ قد سکاٹ جس کی ذی ہوشی کی عراب ایک دو گلاس ہی باقی تھی اس قابل نہ تھا کہ بقیہ سفر اس کی رفاقت میں خوشگوار طریقے سے کٹ سکے۔ میں نے کافی کی قیمت ادا کی اور کپ اٹھا کر پیچھے مڑا۔ مجھے کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں میں سکون سے کافی پی سکوں اور ہو سکے تو بقیہ سفر کے دوران میں اوگھتا بھی رہوں۔ مگر قبوہ خانے کی تمام میز پر تھیں اور فرش پر لوگ بچھے تھے۔ ”کیوں نہ واپس عرشے پر ہی چلا جائے۔“ میں نے سوچا اور برساتی کا کالر گلے کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر قبوہ خانے سے باہر آ گیا۔ عرشہ اب بھی ویران پڑا تھا۔ سینئر کے جنگلے کے اوپر بندھے ہوئے رستے پر دو بلب جھول رہے تھے، جن کی مدہم روشنی عرشے کے بھیکے ہوئے تختوں پر چمک رہی تھی۔ کیمین کے ساتھ آرام کرسیوں کی ایک قطار تھی۔ میں نے جیب سے رومال نکال کر ایک کرسی پر بچھایا اور بیٹھ کر کافی پینے لگا۔ میرے ساتھ والی کرسی پر کوئی مسافر سرخ اوئی کوٹ اوڑھے بڑے اطمینان سے ٹانگیں پسارے سو رہا تھا۔ رودبار انگلستان کی موجیں سینئر سے ٹکراتیں اور ایک ہلکی پھوار میرے چہرے کو تر کر جاتی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر رستوں سے جھولتے ہوئے قہقروں سے پرے دیکھنے کی کوشش کی، لیکن وہاں صرف لہروں کا شور اور مکمل تاریکی تھی۔ ایک دم سینئر کا گھٹکھٹایا ہوا بھونپوزور سے بجا۔

”اوہ! کتنی سردی ہے۔“ یہ سریلی اور ٹھٹھرتی ہوئی آواز ساتھ والی کرسی پر پڑے سرخ کوٹ میں سے آ رہی تھی۔

”ہو۔ ہو۔ کوٹ اب باقاعدہ حرکت میں تھا۔“

”جواب تو دینا چاہئے۔“ میں نے کافی کا کپ فرش پر رکھتے ہوئے سوچا۔ ”آپ کو کس بھلے مانس نے عرشے پر سونے کا مشورہ دیا تھا؟“ میں نے منہ کوٹ کے اُس بٹن کے قریب لے جا کر کہا جس کے آس پاس سریلی آواز کے کان ہونے چاہئیں تھے۔

”اوہ“ کوٹ ایک دم اُچھل پڑا۔ کالر کے سرے پر دو خوفزدہ آنکھیں جھانک رہی تھیں۔

”تم کون ہو؟“

یہ سوال ایسے ہی پوچھا گیا تھا جیسے ہمارے ہاں عامل و معمول کے مکالموں میں ”تم

کون؟“ پوچھا جاتا ہے۔

”مسافر“ میں نے معمول کی بحر میں جواب دیا۔ مدہم روشنی میں میں صرف اتنا دیکھ سکا کہ عامل لڑکی ہے۔ بال لڑکوں کی طرز پر چھوٹے چھوٹے کئے ہوئے ہیں۔ خوبصورت بھی ہے۔
 ”فرانس جارہے ہو؟“ اس نے جمائی لیتے ہوئے پوچھا۔ چہرے پر ہلکا سا بھولین تھا۔
 ”ظاہر ہے“ میں نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ ”اس سینٹر پر سوار تمام مسافر فرانس ہی تو جارہے ہیں۔“

اس نے میری طرف قہر بھری نظروں سے دیکھا اور ایک لمبی ”اونہہ“ کر کے پھر سرخ کوٹ سر پر اوڑھ کر خاموشی سے لیٹ گئی۔ میں نے فرش پر پڑا ہوا کپ اٹھایا اور کافی کا ایک گھونٹ بھرا بالکل بخ ہو چکی تھی۔ میں نے منہ بنا لیا۔ سرخ کوٹ اب بالکل بے حس و حرکت پڑا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ اس کوٹ کے ساتھ میرا رویہ انتہائی غیر معقول اور غیر شریفانہ تھا۔ بھلا مزے سے سوتی ہوئی ایک خوبصورت لڑکی کے کان میں اس طرح تان لگا دینا کہاں کی شرافت ہے۔
 ”معذرت کرنی چاہئے۔“ میں نے فیصلہ کیا۔

”ہیلو!“ میں نے آہستہ سے کوٹ کے کالر سے مخاطب ہو کر کہا۔ کوٹ ساکن پڑا رہا۔
 ”میں نے کہا ہیلو!“ اب کی بار میں نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ کوٹ ایک دم ہڑبوا کر اٹھ بیٹھا۔ ”اوہ کیا مصیبت ہے سونے بھی دو گے یا نہیں؟“ وہ نہایت برہم نظر آ رہی تھی۔
 ”میں دراصل یہ کہنا چاہتا تھا“ میں نے سرگوشی کی ”کہ مجھے افسوس ہے میں نے آپ کو خواہ مخواہ ڈرا دیا۔“

”ایک بار نہیں بلکہ دو مرتبہ“ اس نے دونوں مٹھیاں بھیج کر ننھے بچوں کی مانند اپنی خواب آلود آنکھیں ملیں۔

”آپ فرانس جارہی ہیں؟“ میرے منہ سے بے اختیار وہی فقرہ نکل گیا جس پر پہلے ہنگامہ ہو چکا تھا۔

”ظاہر ہے.... اس سینٹر پر سوار تمام مسافر....“ اس نے انگلیاں نیچا کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا اور مسکرانے لگی۔ اب میرے پاس کوئی سرخ کوٹ نہ تھا ورنہ میں بھی ایک لمبی ”اونہہ“ کر کے اسے اوڑھ کر وہیں کرسی پر لیٹ جاتا۔

”میں صرف معذرت کرنا چاہتا تھا۔ اب آپ سو سکتی ہیں میں خل نہیں ہوں گا۔“ میں نے خفت مٹانے کی ناکام کوشش کی اور جیب میں سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔
 ”ایک گھنٹہ تک ہمیں فرانس کا ساحل دکھائی دینے لگے گا۔“ اس نے ایک اچنتی ہوئی نگاہ اپنی چوکر جناتی ڈائل والی گھڑی پر ڈالی۔ ”اب سو کر کیا کروں گی؟“ میں خاموشی سے سگریٹ پیتا رہا۔

”کیا تم پہلی مرتبہ فرانس جارہے ہو؟“ اس نے گردن کو خفیف سا بل دے کر میری جانب دیکھا اور پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر بڑی معصومیت سے کہنے لگی ”میں تو ہر سال جاتی ہوں۔ دراصل میرا باپ انگریز ہے اور ماں فرانسیسی تھی۔“
 ”تھی؟“ میں پوچھ بیٹھا۔

”ہاں مرچکی ہے۔“ اس نے سر ہلا کر جواب دیا۔ اس کے لہجے میں تأسف کا شائبہ تک نہ تھا۔ ”تب میں بہت چھوٹی تھی۔ مجھے تو اُس کی شکل بھی یاد نہیں۔ ڈیڈی ڈیئر ہر سال مجھے گرمیوں میں خالہ کے ہاں پیرس بھیج دیتے ہیں جہاں میں کرسمس تک رہتی ہوں۔ پیرس میں لنڈن کی نسبت سردی کا موسم قدرے گوارا ہوتا ہے نا؟ مجھے سردی بالکل پسند نہیں۔“

”کہتے ہیں ہر تہذیب یافتہ انسان کے دو ملک ہوتے ہیں۔ ایک اس کا اپنا اور دوسرا فرانس۔ آپ پر یہ روایت سو فیصد صادق آتی ہے۔“ میں اب اس کی معصوم باتوں میں دلچسپی لے رہا تھا۔

”فرانس کی بجائے پیرس کہنا چاہئے۔ پیرس بے حد حسین ہے خاص طور پر دریائے سین کے رومانوی کنارے جہاں میں ہمیشہ شام ڈھلے سیر کو نکل جاتی ہوں اور رات گئے تک اکیلی گھومتی رہتی ہوں۔“

مجھے حیرت ہوئی کہ پیرس جیسے شہر میں اتنی حسین لڑکی کو لوگ اکیلی کیسے گھومنے دیتے ہیں۔

صبح کا ذب کے آثار نمایاں ہو رہے تھے اور جنگلے کے اوپر سے سے لٹکتے ہوئے ققنوں کی روشنی اب ماند پڑتی جا رہی تھی۔ ہمارے گرد پھیلا ہوا سمندر جورات ایک مہیب عفریت کی مانند چنگھاڑ رہا تھا اب ایک وسیع سرمئی صحرا کی طرح خاموش اور پرسکون لیٹا ہوا تھا۔ دُور افق پر ایک ہلکی

سی لکیر ابھری۔

”فرانس“ اس نے لکیر کی جانب اشارہ کیا اور پھر دوسری طرف منہ پھیر کر کہنے لگی ”ویسے مجھے پاسکل کہتے ہیں۔“

میں نے اپنا تعارف کروایا۔

”تم کتنے خوش قسمت ہو جو آزادی سے گھوم پھر سکتے ہو۔ کاش میں بھی تمہاری طرح پاسپورٹ جیب میں ڈال سامان کا ندھے پر رکھ مزے سے دنیا کی سیاحت پر جاسکوں۔“ اس نے آزر دہ ہو کر کہا ”میرے لیے تو یہ دیوانے کا خواب ہے۔“ وہ بے حد اُداس نظر آ رہی تھی۔

میں نے پہلی مرتبہ اس کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں گہرے نیلے رنگ کی تھیں اور ناک قدرے اوپر کواٹھی ہوئی۔ سرخ و سفید گول چہرے پر چھوٹے کٹے ہوئے بال بے حد بھلے لگ رہے تھے۔ میں نے سوچا اگر اسے مردانہ کپڑے پہنا دیئے جائیں تو وہ ایک نہایت حسین و جمیل عورت لگے گی۔ ہم وہاں بیٹھے خاصی دیر باتیں کرتے رہے۔ وہ مجھے پیرس کے بارے میں بتاتی رہی اور میں اُسے افغانستان کی کاروان سرائوں میں کبھی جانے والی قدیم لوک حکایتیں سناتا رہا یہاں تک کہ ڈکٹر کاشہر دکھائی دینے لگا۔ اکثر مسافر قہوہ خانے سے نکل کر اوپر عرشے پر آچکے تھے اور ہمارے ساتھ والی تمام کرسیاں پُر ہو چکی تھیں۔ بندرگاہ میں داخلے پر سٹیمر بھونپوز زور سے بجنے لگا اور مسافر اپنا سامان سنبھال کر اترنے کی تیاری کرنے لگے۔ میں نے جیب سے کنگھی نکال کر اپنے بال سنوارے اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ تمام شب کی بیٹھک نے پورے جسم کو اکڑا کے رکھ دیا تھا۔ پاسکل ابھی تک کرسی پر بیٹھی تھی اور سرخ کوٹ اس کی گود میں پڑا تھا۔

”کیا یہیں بیٹھے رہنے کا ارادہ ہے؟“ میں نے اپنا سفری تھیلا کا ندھے پر رکھا اور ایک ہاتھ میں پاسکل کا سوٹ کیس اٹھالیا۔

”تم گاڑی میں جا کر بیٹھو میں آ جاؤں گی۔“ اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔

”محترمہ پہلے آپ“ میں نے شوری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جھک کر کہا۔

پاسکل نے سرخ کوٹ اٹھایا اور بالکل ناک کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں اسی طرح جھکا ہوا اُس کے راستے سے پیچھے ہٹ گیا۔ وہ ایک لمحہ کے لیے جھکی اور پھر بندرگاہ کو اترتی ہوئی سٹیڑھی کی طرف رخ کر کے چلنا شروع کر دیا۔ میں سیدھا کھڑا ہو کر اس

کے پیچھے چلے کو تھا مگر چل نہ سکا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا سانس رُک گیا ہو۔ میرے قدم عرشے کی گیلی لکڑی پر میخوں سے ٹھونک دیئے گئے ہوں۔ میں جو کچھ دیکھ رہا تھا وہ قدرت کا ایک بھونڈا مذاق تھا۔ خالق اپنے تخلیقی عمل میں کہیں چُوک گیا تھا۔ وہ چل نہیں رہی تھی بلکہ چلنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ لڑکھڑاتی ٹھوکریں کھاتی ہوئی پاسکل۔ بے بسی اور غصے کے جذبات سے میرا دماغ دیکھنے لگا۔ میں نے اپنے سینے میں اس بے بس لڑکی کے لیے بے پناہ ہمدردی اور رحم کی ایک لہر دوڑتی ہوئی محسوس کی۔ میں وہیں بے حس و حرکت کھڑا اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک ہاتھ اپنی ران پر سختی سے جمائے بڑے تکلیف دہ انداز میں لنگڑاتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ سٹیڑھی کے قریب پہنچ کر اُس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

”کیا یہیں کھڑے رہنے کا ارادہ ہے؟“ اس کے نازک لبوں پر حزن آمیز تبسم کھیل رہا تھا۔ میں نے بے یقینی کے عالم میں ایک مرتبہ سر کو جھٹکا اور پھر تیزی سے چلتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔

”مجھے معلوم ہے“ اس نے کہنا شروع کیا۔ ”تمہارے دل میں اس وقت میرے لیے رحم اور ہمدردی کے جذبات موجزن ہوں گے۔“

”نہیں ایسا تو نہیں“ میں نے جلدی سے کہا۔

”مجھے جھوٹ پسند نہیں۔ سب لوگ مجھ پر ترس کھاتے ہیں۔ میں ہمیشہ سے رحم کے جذبات کی بھکاری بن جاتی ہوں۔ تم دوسروں سے مختلف نہیں ہو۔“

میں خاموش کھڑا اس کے اُداس چہرے کو دیکھتا رہا۔

”ڈیڈی نے میری سولہویں سالگرہ پر مجھے ایک سپورٹس کار تحفے میں دی تھی اور سترہویں سالگرہ منانے سے پہلے اُسی کار کے ایک حادثے نے میری یہ حالت کر دی۔“

”مجھے بے حد افسوس ہے“ میں اور کچھ نہ کہہ سکا۔ انگریزی زبان میں افسوس کے جذبات کا اظہار کس قدر مشکل ہوتا ہے مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا۔

”کوئی بات نہیں“ اس نے تلخی سے کہا۔ ”میں اب عادی ہو چکی ہوں۔“

”کیا تم دونوں کا واپس انگلستان جانے کا ارادہ ہے۔“ بندرگاہ پر کھڑے سٹیمر کے سنورڈ نے بے صبری سے ہم دونوں سے مخاطب ہو کر پکارا ”باقی تمام مسافر اُتر چکے ہیں۔“

”میں نے سرخ کوٹ اُس کے ہاتھ سے لے لیا اور ہم آہستہ آہستہ بیڑھیوں سے نیچے اُترنے لگے۔ کٹم ہاؤس کے پہلو میں پیرس جانے والی گاڑی تیار کھڑی تھی۔ ہم دونوں ایک ہی ڈبے میں سوار ہو گئے۔

سفر کے دوران میں وہ خاموشی سے کھڑکی سے باہر تکتی رہی۔ مجھے معلوم تھا کہ ہر سال انہی راہوں سے گزرنے والی پاسکل کو ڈبے سے باہر گزرتے ہوئے فرانس کے دیہی مناظر سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ سرسبز کھیتوں اور چراگا ہوں کے دامن میں پھیلی ہوئی دھند کو اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ دیکھ چکی تھی۔ اُس کی نیلی آنکھیں جنہیں دیکھ کر مجھے ایران کا نیلگوں آسمان یاد آ گیا تھا کسی اور جہان میں تھیں۔ اُس کے حسن میں حزن و ملال کے روگ کو میں جان گیا تھا۔ مجھے اب معلوم ہوا کہ وہ اتنی قبول صورت ہوتے ہوئے بھی پیرس کی پرفوں شامیں دریائے سین کے کنارے اکیلے کیوں گزرتی ہے۔ جہاں گردی اُس کے لیے دیوانے کا خواب کیوں ہے۔ وہ اپنا جی تھی۔ پچھلے پانچ ماہ کی سیاحت کے دوران میں مجھے کہیں بھی کسی ایسی لڑکی سے سابقہ نہ پڑا تھا جسے ایک مرتبہ پھر ملنے کی ہوک میرے دل سے اتنی شدت سے اُٹھی ہو۔ میں چاہتا تھا کہ پاسکل کی اداس نیلی آنکھیں پھر سے مسکرانے لگیں۔

”پاسکل“ میں نے کھڑکی کا شیشہ بجا کر اُسے متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

”ہوں۔“ اُس کی آنکھیں نیلگوں قینچوں کی مانند بے جان تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی بھیانک خواب سے بیدار ہو رہی ہو۔

”تم اگر پسند کرو تو پیرس پہنچنے پر میں تمہیں گھر تک چھوڑ آؤں؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پیشکش کی۔

”اس کی ضرورت نہیں“ وہ بدستور باہر دیکھتی رہی۔ ”میری خالہ مجھے سٹیشن پر لینے آ رہی ہیں۔“

”پاسکل“ میں نے ایک مرتبہ پھر کھڑکی کا شیشہ کھٹکھٹایا۔ ”کیا تم اس سفر کے خاتمے پر آج شام مجھے مل سکتی ہو؟“

”وہ کس لیے؟“ اُس نے پلٹ کر میری طرف اس طرح دیکھا جیسے میں نے کوئی اُنہونی بات کہہ دی ہو۔

”میں چاہتا ہوں کہ تم ہر شام دریائے سین کے کنارے اکیلی نہ گھومو۔ میں تمہارا ساتھ دینا چاہتا ہوں۔“

وہ ایک دم ہنسنے لگی مگر اُس کی ہنسی مجھے بے حد ڈراؤنی لگی رہی تھی۔ ”میں جانتی ہوں میرا چہرہ بے حد دلکش ہے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اس چہرے کا حسن کسی نیم تاریک قبوہ خانے کے کونے میں پڑی ہوئی کرسی پر صرف بیٹھے رہنے کی حد تک ہی محدود ہے۔ اُٹھ کر چلنے کی تکلیف وہ کوشش اسی دلکش چہرے کو انتہائی بد صورت بنا دیتی ہے اور انسان ساری زندگی ایک کونے میں بیٹھے تو گزرا نہیں سکتا۔“

”ان باتوں کا زندگی کے حقائق سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔“ میں نے جذباتی ہو کر کہا۔

”اور یہ حقیقت ہے کہ میری دلی خواہش ہے کہ ہم دونوں پیرس میں ضرور ملیں۔“

”سوچ لو“ اس نے میز پر کہنیاں رکھ کر اپنا گول چہرہ ہتھیلیوں پر جما دیا۔ ”میں جب تمہارے ساتھ چلوں گی تو بوڑھی عورتیں آپس میں کھسک پھسکریں گی۔ لڑکیاں کہیں گی ایسے قبول صورت مشرقی نوجوان کو پورے پیرس میں ایک اپناج لڑکی ہی پسند آئی اور فرانسیزی مرد جن کے لیے عورت کی خوبصورتی کے پیانے کو لبوں سے اوپر نہیں جاتے، تمہاری عقل پر ماتم کریں گے۔ تضحیک ہوگی تمہاری؟“

”تم مجھے ان سطحی دلائل سے قائل نہیں کر سکتیں۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”ہاں! اگر تم ویسے ذاتی طور پر مجھے ملنا پسند نہ کرو تو اور بات ہے۔“

”بالکل نہیں۔“ اس کے لہجے کی بے اختیاری میرے لیے حیران کن تھی۔ ”میرا مطلب ہے میں تمہیں ملنا چاہتی ہوں۔ ضرور....“ اس نے چھوٹے بچوں کی طرح بار بار اس طرح سر کو جنبش دی جیسے وہ اپنے جذبات کو پوری طرح بیان کرنے سے قاصر ہو۔

”ہماری گاڑی دو بجے پیرس پہنچے گی۔“ میں نے گھڑی پر نظر ڈال کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اور میں آج شب پورے سات بجے دریائے سین کے کنارے آ نقل ٹاور کے تلے تمہارا انتظار کروں گا۔“

وہ بدستور سر ہلارہی تھی اور اُس کا چہرہ مسرت سے دھک رہا تھا۔

ہماری گاڑی وقت مقررہ سے دس منٹ قبل ہی پیرس کے ”سینٹ لازار“ سٹیشن پر پہنچ

گئی۔ ہم دونوں پلیٹ فارم پر اترے تو سامنے پاسکل کی قدرے فربہ مگر بے حد خوش شکل خالہ کھڑی تھیں جو اُسے دیکھتے ہی ”پاسکل مواشیری“ کہہ کر لپٹ گئیں۔ میں نے اپنا سامان کا ندھے پر اٹھایا اور سٹیشن سے باہر معلومات کے دفتر سے ”کیمپنگ“ کا پتہ دریافت کر کے ”نیولی“ جانے والی ٹرام پر سوار ہو گیا۔ کنڈیکٹر نے مجھے نیولی پل کے پاس اُتار دیا۔ میں نے دفتر معلومات کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے دریائے سین کے اونچے کنارے کے ساتھ ساتھ فٹ پاتھ پر چلنا شروع کر دیا۔ یہ ”بوائے ڈی بولون“ تھا جس کا شمار شہر کے خوبصورت ترین علاقوں میں ہوتا ہے۔ پیرس کی یہ نواحی بستی دریائے سین کے خاموش پانیوں کے ساتھ ساتھ میلوں تک چلی جاتی ہے۔ نیچے دریا کی جانب جھانکے تو کناروں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے رہائشی مکان نظر آتے ہیں جن کے مالک ہفتہ وار تعطیل کے دوران میں پیرس کے ہنگاموں سے دور سکون کی تلاش میں یہاں آتے ہیں۔ چند جگہوں پر خوش نظر باغیچوں کے بالمقابل پانی میں ہاؤس بوٹ تیر رہے تھے۔ میں نے سفید رنگ کے ایک آہنی پھانک سے نیچے جھانکا تو ہاؤس بوٹ کے دروازے پر کھڑا ایک خونخوار قسم کا کتا غرا کر میری طرف لپکا۔ میں فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ چونکہ ان ہاؤس بوٹوں کے مالک یہاں عارضی طور پر رہائش پذیر ہوتے ہیں اس لیے اُن کی غیر موجودگی میں رکھوالی کے لیے کتے باغ میں کھلے چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ مکانوں اور ہاؤس بوٹوں کا سلسلہ ختم ہوا تو دریا کے کنارے ایک وسیع اور سرسبز سیرگاہ دکھائی دی۔ شاہ بلوط اور بید کے درختوں کی چھاؤں میں چند بوڑھے پھل کے شکار میں مشغول تھے۔ میں نے سوچا کہ پیرس میں قیام کے دوران میں کچھ وقت نکال کر میں بھی اس پرسکون فضا میں چند لمحے گزاروں گا۔ یہ تمام علاقہ میرے دائیں ہاتھ پر تھا۔ بائیں بازو میں پیرس کے متمول لوگوں کے سفید براق مکانوں کی قطاریں تھیں جو فرانسیسی طرز تعمیر کے نازک اور خوبصورت نمونے تھے۔ کیمپنگ تک پہنچا تو تھکن سے نڈھال ہو چکا تھا۔ کیمپنگ کیا تھی دریا کے کنارے پورا شہر آباد تھا پیر مارکیٹ رستوران اور درجنوں کشادہ سڑکیں۔ لیکن بد قسمتی سے اس شہر میں میرے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ دفتر سے معلوم ہوا کہ اس سال سیاحوں کی بہتات کی وجہ سے رہائش کا مسئلہ بے حد پیچیدہ ہو گیا ہے۔ اکثر سیاح ہوٹلوں میں جگہ نہ ملنے پر کیمپنگ کا رخ کرتے ہیں اور فی الحال میرے چھوٹے سے خیمے کے لیے بھی جگہ نایاب تھی۔ عام حالات میں شاید یہ خبر اتنی حوصلہ شکن ثابت نہ ہوتی اور میں کسی پارک میں شب بسر کر لیتا، مگر مجھے تو آج شام پاسکل کو ملنا

تھا اور پانچ بجنے والے تھے۔ میں نے سامان اٹھایا اور جھل قدموں سے چلتا ہوا واپس نیولی کے پل تک آ گیا اور ٹرام میں سوار ہو کر شہر کے مرکز میں ایک ایسی جگہ اتر گیا جہاں کیمپنگ سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق درجنوں ہوٹل والے میری راہ تک رہے تھے۔ تنگ گلیوں اور بازاروں میں کئی ”پانسیاں“ یعنی پرائیویٹ خاندانی ہوٹلوں کے دروازے کھٹکھٹائے مگر ہر جگہ ”کیمپٹ“ یعنی کوئی جگہ نہیں کا نکا سا جواب ملا۔ سیاہ لباس میں ملبوس ایک ضعیف عورت جس نے مجھے کئی ہوٹلوں کے اندر جاتے اور اُسی لمحہ باہر نکلتے دیکھا تھا میرے پاس آئی اور اپنا سفید بگلا سر ہلا کر بولی ”ہوٹل موسیو؟“ موسیو نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔ بڑھیا کے ہاتھوں میں ایک آہنی پنجرہ لٹک رہا تھا جس میں ایک گنجا سادہ صورت طوطا مجھے دیکھتے ہی ٹپٹپٹ کرنے لگا۔ اُس نے پنجرے کا دروازہ کھول کر طوطے کو ایک چپت رسید کی اور پھر مجھے سر کے اشارے سے پیچھے آنے کا کہہ کر میرے آگے آگے چلنے لگی۔ خاصی دور چلنے کے بعد ایک گلی کے موڑ پر ایک پرانی وضع کے مکان کے اندر داخل ہوئی جس کے باہر ”ہوٹل رچمنڈ“ کا بورڈ آویزاں تھا۔ اس نے ڈیسک پر کھڑی مالکن سے فرانسیسی میں کچھ کہا اور پھر طوطے کا پنجرہ ایک کونے میں رکھ کر وہیں سے ایک لمبا برش اٹھا کر فرش صاف کرنے لگی۔ وہ اس ہوٹل میں خادمہ تھی۔ مالکن نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھے کرائے کی تفصیل بتائی۔ کمرے کا کرایہ بیس فرانک اور غسل کے لیے پانچ فرانک زائد۔ ہوٹل باہر سے اگرچہ بے حد شکستہ اور گندا لگ رہا تھا مگر اندر ماحول ایک صاف ستھرے درمیانے درجے کے گھر کا تھا۔ میں نے رجسٹر پر نام درج کیا۔ پاسپورٹ جمع کروایا اور چابی لے کر دوسری منزل پر واقع کمرے میں آ گیا۔ وقت دیکھا تو سات بجنے کو تھے۔ غسل کا تردد کیے بغیر میں نے کمرے میں لگے پانی کے ٹل سے منہ پر چند چھینٹے مارے اور جلدی سے کپڑے بدل کر باہر چوک میں آ گیا جہاں زیر زمین ریلوے کا سٹیشن تھا۔ لاتعداد سیڑھیاں اُترنے کے بعد ایک طویل زمینی راستہ آیا جسے طے کر کے جب میں پلیٹ فارم کے پھانک پر پہنچا تو ٹکٹ چیکر نے ٹکٹ طلب کیا۔ میرا خیال تھا کہ ٹکٹوں کی کھڑکی وہیں کہیں پلیٹ فارم پر ہوگی، مگر چیکر نے بتایا کہ سٹیشن میں داخل ہوتے وقت سیڑھیوں کے ساتھ ملتے ہیں۔ چنانچہ جب میں وہاں سے ٹکٹ حاصل کر کے دوبارہ واپس آیا تو اس بھگم بھاگ میں بیس منٹ اور ضائع ہو چکے تھے۔ پھر ستم یہ ہوا کہ غلط گاڑی پر سوار ہو گیا اور جانے کہاں کہاں بھٹکتا رہا۔ بہر حال ایک فرانسیسی طالبہ کام آئی اور اس نے مجھے آٹھل ٹاور کے

سٹیشن پر پہنچایا۔ میں سٹیشن سے باہر نکلا تو میری گھڑی پر آٹھ بج چکے تھے۔ سامنے دریائے سین کے کنارے زنگ آلود آتقل ناور ایک جتنا کی پرند کی مانند زمین میں پنچے گاڑے آسمان کی وسعتوں میں سردیے ہوئے تھا۔ ناور کے نیچے سیاحوں کے ٹھٹھ لگے تھے۔ فوٹو گرافر۔ آکس کریم اور تصویری کارڈ بیچنے والے۔ قہوہ خانے غرض کہ خوب رونق تھی۔ میں نے اس ہجوم میں ایک ایک چہرے کو یاس و امید کی نظروں سے دیکھا مگر پاسکل وہاں نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ پورے سات بجے وہاں آئی ہوگی اور مجھے وہاں نہ پا کر مایوس لوٹ گئی ہوگی۔ شاید وہ سمجھتی ہو کہ میری دلچسپی وقتی طور پر تھی اور بعد میں صورتحال کا احساس کرتے ہوئے میں نے اُسے ملنے کا ارادہ ترک کر دیا ہو۔ اس خیال نے مجھے بے حد غمگین کر دیا۔ مجھے اب پیرس میں اپنی پہلی شام سے بالکل دلچسپی نہ رہی تھی۔ میں واپس ہوٹل آ گیا اور بستر کے نرم گدوں میں منہ چھپا کے چپکے سے سو رہا۔

پیرس کا شمار یورپ کے قدیم ترین شہروں میں ہوتا ہے۔ ازمنہ قدیم میں جب یہ علاقہ صرف دلدلوں اور چند جزیروں پر مشتمل تھا سیلٹ نسل کے لوگ یہاں آ کر آباد ہو گئے۔ تاریخی کتب میں پیرس کا اولین حوالہ جولیس سیزر کے زمانے سے ملتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہاں پارسی نامی قبیلہ آباد ہے۔ پیرس پارسی قبیلے کا شہر۔ وحشی ہنوں کا سردار 307ء میں اس شہر پر حملہ آور ہوا لیکن اہل شہر کے عقیدے کے مطابق (Saint Geneveive) سنت جینے وپوکی کرامتیں اور ٹوٹکے اُس کی راہ میں آئے اور وہ ناکام واپس لوٹ گیا۔ اس خدمت کے صلے میں اب بھی جینے وپوکی پیرس کا (Patron Saint) یعنی محافظ سنت مانا جاتا ہے۔ پھر شارلیمان کا دور آیا جو خلیفہ ہارون الرشید کا ہم عصر تھا اور جو ہسپانیہ فتح کرنے کے شوق میں برف پوش پیرانیز کے پار جا کر مسلمانوں کے ہاتھوں اپنی فوج کی گت بنوا بیٹھا اور ٹھٹھا اٹھٹھا واپس فرانس آ گیا۔ اس کے بعد کی تاریخ میرے ذہن میں گڈمڈ ہو جاتی ہے۔ لوئی نام کے درجنوں حضرات جن کے سیریل نمبر ہمیشہ ذہن سے اُتر جاتے ہیں اور پھر آخر میں نیولین کا دور دور۔ اُس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

دوسری صبح میں دیر تک سوتا رہا۔ تیار ہو کر نیچے ڈیسک پر آیا تو وہاں ہوٹل کی درمیانی عمر

کی خوش شکل مالکہ رجسٹر پر جھکی خانہ پری میں مصروف تھی۔ میں نے اپنے کمرے کی چابی اُس کے حوالے کی اور باہر آ گیا۔ میرے ذہن میں آج کے لیے کوئی واضح پروگرام موجود نہ تھا۔

پیرس اور میں ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہ تھے، مگر ہمارے درمیان دوستی کی بنیادیں کبھی بھی گہری نہ ہو سکیں۔ میں کبھی اُن لاتعداد تاریخ دانوں، ادیبوں اور فنون لطیفہ کے شیدائیوں سے اتفاق نہیں کر سکا جن کی رائے میں دنیا میں اگر کوئی شہر ہے تو ہمیں است۔ مجھے ہمیشہ یہاں آ کر گھٹن اور تنہائی کا احساس ہوا۔ سیاحوں کی بھرمار۔ مقامی باشندوں کی سردمہری اور حدود جہ مہنگائی ایسے عناصر ہیں جو مجھ جیسے آزادی پسند سیاح کی رُوح کا گلا گھونٹ کے رکھ دیتے ہیں۔ گرمیوں میں پیرس کے باشندوں کی اکثریت ساحلی مقامات کی طرف کوچ کر جاتی ہے اور شہر میں صرف نکلے آوارہ گرد قلاش مصور۔ غیر ملکی سیاح اور پاگل کتے رہ جاتے ہیں۔ جو حضرات ساحلی مقامات پر جانے کی توفیق نہیں رکھتے اُن کا سلوک سیاحوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے جیسے وہ اُن کی آمد سے نکلے ہوئے ہوں اور یہی بڑی بات ہے کہ وہ سیاحوں کو اپنا خوبصورت شہر دیکھنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ پہلی مرتبہ پیرس آیا تو موسم سرد۔ نم آلود اور افسردہ تھا۔ میں کئی روز اس کی گلیوں اور بازاروں میں گھومتا رہا لیکن کسی فرانسیسی نے مجھ سے بات تک کرنی گوارا نہ کی۔ اوّل تو انگریزی سمجھتے ہی نہیں اور بفرض محال دو لفظ آتے بھی ہوں تو منہ پر نہیں لاتے۔ بہر حال میں نے مشہور عمارتیں اور عجائب گھر دیکھ کر سوئٹزرلینڈ کی راہ لی۔ دوسری مرتبہ مصوری کا جنون سیدھا مومارت کے علاقے میں لے گیا جہاں چند روز ایک گندے فلیٹ میں اُلٹے سیدھے نقوش کھینچے۔ قہوہ خانوں میں ٹھسے ہوئے فاقہ کش مصوروں کو ڈبل روٹیاں خرید کر دیں اور پھر اپنے جرمن دوست فالکر کے کہنے پر بوریا بستر سمیٹ کر واپس لنڈن چلا گیا۔ تیسری مرتبہ جنوبی فرانس کی سیاحت پر نکلا تو ایک شب پیرس میں بھی بسر کرنی پڑی اور اب کے بھی یہ شہر خواہ خواہ ہسپانیہ کی راہ میں آ گیا تھا۔ میں نے سوچا آج میں یہاں بالکل آوارہ اور بغیر کسی مقصد کے گھوموں گا شاید اسی طریق میں اس شہر کی رُوح کو پالوں۔ آخر اس شہر میں جس کی تعریف و توصیف میں جتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور کسی شہر کے بارے میں نہیں لکھی گئیں کچھ تو ہوگا۔

میں ہوٹل کی گلی سے نکل کر بائیں ہاتھ پر پیرس کی اور اغلباً دنیا کی خوبصورت ترین سڑک (اس میں لاہور کی مال روڈ شامل نہیں) شانزے لیزے پر آ گیا۔ شہر کے مرکز میں نیولین کی فتوحات

کی یاد میں تعمیر کردہ ”فتح کی محراب“ کھڑی ہے جس کے عین نیچے ایک غیر معروف سپاہی کی قبر پر ابھی شعلہ روشن ہے۔ یہ سپاہی اُن تمام فرانسیسیوں کی نمائندگی کرتا ہے جنہوں نے ملک و ملت کے لیے جانیں نثار کیں۔ اس محراب سے بارہ خوبصورت اور کشادہ سڑکیں نکل کر پیرس کے سینے پر بچھ جاتی ہیں۔ ان سڑکوں میں سے ایک کا نام شانزے لیزے ہے۔ یہ سڑک ایک میل سے زیادہ لمبی ہے اور کاکورد کے مشہور چوک پر ختم ہوتی ہے جہاں انقلاب فرانس کے دوران میں گلوٹین گاڑھ کرتین ہزار لوگوں کے سر قلم کر دیئے گئے۔ ان میں لوئی (سیریل نمبر سولہ) ماری انتونیتا، دانش اور کوردے بھی شامل تھے۔ آج اس خونیں چوک کے بیچ شاہکار مجسموں سے مزین اُن گنت فوارے اُبل رہے ہیں۔

”شانز“ جیسا کہ اس سڑک کو اہل پیرس پیار سے پکارتے ہیں 1616ء میں ماری ڈی میڈیکا کے نقشے کے مطابق تعمیر ہوئی۔ سڑک کے دونوں طرف پیدل چلنے والوں کے لیے ایک وسیع فٹ پاتھ ہے جس کے ساتھ درجنوں قہوہ خانے۔ زنانہ ملبوسات کی فیشن ایبل دکانیں۔ دفاتر اور بینک وغیرہ واقع ہیں۔ جہاں لنڈن کے بڑے ستوروں میں شوکیس کو دنیا جہاں کی الابلے ٹھونس کر تیز روشنیوں سے چمکادیا جاتا ہے وہاں پیرس کی ایک معمولی دکان کا شوکیس چاہے اُس میں صرف ایک ٹائی جی ہو اور روشنی کے لیے ایک موم بتی جل رہی ہو نفاست پسندی اور خوبصورتی کا شاہکار ہوتا ہے۔ ”شانز“ پر خاصی دیر گھومنے کے بعد میں مومارت کے علاقے میں چلا گیا اور جاپانی پچپانی گلیوں میں گھومتا رہا۔ پچھلے پہر کلیساں سیکرے کر کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک مصور بڑے ادب سے میرے پاس آیا اور ایک تصویر پیش کر دی۔ مجھے خبر نہ تھی کہ پچھلے پندرہ منٹ سے وہ ایک طرف بیٹھ کر میری ہی تصویر بنا رہا تھا۔ میں نے بہت بہت شکریہ ادا کر کے تصویر قبول کر لی مگر معلوم ہوا صرف یہی کافی نہ تھا بلکہ میں فراتک بھی ساتھ ہونے چاہئیں۔ بہر حال سودا دس میں طے ہو گیا۔ تصویر بغل میں داب کر میں نے سوچا کہ مصوروں کی کثرت کی وجہ سے یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں اس لیے کیوں نہ ایک دو گھنٹے لوڈر کے مشہور عجائب گھر میں گزارے جائیں۔ میلو جزیرے سے دریافت شدہ وینس اور وکٹڈ وکٹری کے مجسمے ہر بار فن کا ایک نیا پہلو لے کر آپ کے سامنے جلوہ گر ہوتے ہیں۔

زیر زمین ریلوے جب لوڈر کے سٹیشن پر رُکی تو میں حیران رہ گیا۔ فرانسیسیوں کی ساری حسن پرستی اس سٹیشن پر صرف ہو گئی تھی۔ پہلے تو خیال آیا کہ ڈرائیور نے گاڑی صرف میری سہولت کی خاطر سٹیشن کی بجائے سیدھی لوڈر کے عجائب گھر کے کسی عالی شان ہال میں جا ٹھہرائی

ہے۔ پلیٹ فارم ہلکی اور نرم روشنی میں ڈوبا ہوا تھا۔ دیواروں کو تراش کر اُن میں جا بجا اطالوی اور یونانی مجسمے سجائے گئے تھے۔ چھت سے بیش قیمت فانوس لٹک رہے تھے۔ یہ سٹیشن ماسکو کے زیر زمین ریلوے سٹیشنوں کے ہم پلہ تھا۔ میں ایک یونانی مجسمے کے خدو خال کا جائزہ لے رہا تھا کہ میرے پیچھے کھڑے ہوئے ایک مسافر نے مجھے کندھے سے پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو کوئی پاکستانی حضرت جن کی صورت سے میں نا آشنا تھا کھڑے مسکرا رہے تھے۔ ”آپ کا نام مستصر ہی ہے نا؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ یا وحشت یہ حضرت کون ہیں۔

”آپ کسی زمانے میں نیشنل کالج آف آرٹس بڑی باقاعدگی سے آیا کرتے تھے۔“

مجھے یاد آ گیا کہ میں وہاں اپنے ایک دوست تنویر کے پاس اپنے گھر کا نقشہ بنوانے کی غرض سے جایا کرتا تھا۔ تنویر کو انہی دنوں لاہور چڑیا گھر کی نئی عمارت بنانے کا کام بھی ملا ہوا تھا۔ چنانچہ میرے گھر کا جو نقشہ مکمل ہوا اس میں باورچی خانے کی بجائے ریجپوں کے کمرے کا نقشہ بن گیا اور ہمارا باورچی خانہ چڑیا گھر کے نقشے میں منتقل ہو گیا۔ بہر حال نیشنل کالج اور ان حضرت کے درمیان رشتے کی گتھی نہ سلجھ سکی۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو پہچان نہیں پایا۔“ میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔

”میرا نام کہاری ہے۔“ اُن صاحب نے انکساری سے جواب دیا۔ ”ایک روز تنویر کے

کمرے میں جدید مصوری پر آپ سے بڑی گرم گرم بحث ہوئی تھی۔“

”آہا کہاری صاحب!“ میں نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ ملا یا۔ ویسے ان کی زبان

پر ہی اعتبار کیا پہچان میں اب بھی نہیں پایا تھا۔ اپنے بارے میں انہوں نے بتایا کہ پچھلے ایک برس سے پاکستان کے ایک صنعتی ادارے کے وظیفے پر پیرس میں مقیم ہیں اور یہاں پر پاکستانی مصوروں کی تصاویر کی نمائش ترتیب دیتے ہیں۔ میرے بارے میں پوچھنے لگے تو میں نے بتایا کہ فی الحال تو لوڈر کا عجائب گھر دیکھنے کی نیت سے چلا تھا۔ کہنے لگے لوڈر جانے کے لیے صبح کا وقت موزوں ہوتا ہے اس وقت تو سیاحوں کی بھرمار سے صرف تصویروں کے فریم اور مجسموں کی ٹانگیں ہی نظر آئیں گی۔ خیر وہ بڑی چاہت سے مجھے بلے وارڈ پک پس میں واقع اپنے دفتر میں لے گئے جس کے باہر (Curosites De L' Artisanat Du Pakistan) کا بورڈ لگا تھا یعنی پاکستانی

فنکاروں کے بنائے ہوئے فن پارے۔ کہاری صاحب نے مجھے اپنی بنائی ہوئی تصاویر اور مٹی کی منقش اشیائیں دکھائیں جنہیں اہل پیرس نے بے حد سراہا تھا۔ شام کے کھانے کے بعد وہ مجھے واپس ہوٹل چھوڑ گئے اور میں لوور دیکھے بغیر ہی سو گیا۔

دوسرے روز میں کہاری صاحب کے مشورے کے مطابق لوور عجائب گھر دیکھنے کے لیے صبح سویرے تیار ہو کر نیچے ڈیک پر آ گیا۔ ہوٹل کی مالکہ کو کمرے کی چابی تھمائی تو اُس نے بڑی معنی خیز مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا۔

”تم اس ہوٹل کے سب سے عجیب مکیں ہو۔“ اس نے جوانی کے زمانے کی ایک بھولی بصری ادا کو تازہ کرنے کی کوشش میں لب سیکڑ کر کہا۔

”پاکستانی ہونے کی وجہ سے؟“ میں نے ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے پوچھا۔
”نہیں موسیو مستنصر“ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ ”تم دو روز سے یہاں مقیم ہو۔ کل صبح شہر کی سیر کو نکل گئے اور سر شام آ کر سو رہے۔ آج بھی اتنی سویرے تیار ہو کر باہر جا رہے ہو۔“
”اس میں کون سی عجیب بات ہے؟“

”تم پیرس میں ہونو جوان“ اس نے دونوں آنکھیں میچ کر چنچل بننے کی ناکام کوشش کی۔ ”تمہیں چاہئے کہ صرف سر شام باہر نکلو۔ تمام شب کسی شوخ جگہ بسر کرو اور صبح سویرے ایک چھوٹی سی موٹی سی عورت بغل میں دا بے واپس ہوٹل لوٹو۔“

چھوٹی سی موٹی سی عورت کی اصطلاح غالباً فرانسیسی سے مستعار لی گئی تھی۔ ”میں ایسی رومانی مہم جوئی کے لیے موزوں نہیں ہوں“ میں نے جان چھڑانے کی غرض سے ہنس کر کہا اور ہوٹل سے باہر آ گیا۔

آج آسمان پر گھنے بادل چھائے ہوئے تھے اور کسی وقت بھی بارش ہو سکتی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ سارا دن لوور کے عجائب گھر میں رکھے ہزاروں نادر مجسموں اور شاہکار تصویروں کے درمیان گزار دوں، لیکن جب تو لیزر کے باغات کے پہلو میں واقع لوور کی عظیم الشان عمارت کے دروازے پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ منگل کے روز عجائب گھر بند ہوتا ہے۔

”واقعی انگریز فرانسیسیوں کے بارے میں درست کہتے ہیں“ میں نے مایوس ہو کر سوچا ان

مینیڈکوں کی ہر بات اُلٹی ہوتی ہے۔ انکی ڈبل روٹی واہیات حد تک لمبی ہوتی ہے۔ ملاقات ہونے پر آپ کو نہایت بے شرمی سے گالوں پر چومتے ہیں (جنگ کے دوران میں جب فرانسیسی صدر نے چرچل کے گالوں پر چٹا چٹا چٹا بو سے رسید کیے تو انگریزوں کے چہرے کئی روز تک سرخ رہے)۔ ”جنس“ کا ذکر کرتے وقت ذرہ بھر نہیں شرماتے اور پھر کم بخت گھوڑے بھی کھاتے ہیں اور اب میرے تجربے کے مطابق اپنے عجائب گھر اتوار کی بجائے منگل کے روز بند کرتے ہیں۔ ”اب کیا کرنا چاہئے؟“ میں نے یونانی ستونوں کے لمبے برآمدے میں کھڑے ہو کر سوچا۔ بوند باندی شروع ہو چکی تھی اور تو لیزر کے باغات ہلکی پھوار میں بھیگ رہے تھے۔ ”دریائے سین کے کسی خوبصورت پل کے نیچے بیٹھ کر بارش کا نظارہ کیا جائے۔“

میں وہاں سے نکل کر کانکورڈ کے چوک میں آ گیا جہاں برہنہ عورتوں کے مجسموں کے سروں پر آویزاں پانی کے تھالوں میں سے فوارے ابل رہے تھے۔ چوک کے دوسری جانب سکندر سوئم کا مشہور پل تھا۔ میں سڑک سے دریا کے کنارے تک جاتی ہوئی سیڑھیوں پر اتر گیا۔ معلوم ہوا کہ پل کے نیچے بیٹھ کر بارش سے لطف اندوز ہونے کا لا جواب خیال مجھ سے پہلے اور لوگوں کے ذہن میں بھی آچکا تھا جواب یہاں براجمان تھے۔ مچھلی کے شکار پر آئے ہوئے بوڑھے۔ ٹکے آوارہ گرد۔ چند غیر ملکی سیاح اور پیرس کا ٹریڈ مارک یعنی ایک دوسرے کی بانہوں میں لپٹے دنیا وافیہا سے بے خبر نوجوان جوڑے۔ میں اس ہجوم پر ایک نظر ڈال کر پھر واپس سڑک پر آ گیا۔ دریا کے پار نیولین کا مزار انولید دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے سوچا کیوں نہ ایک مرتبہ پھر زیارت کر لی جائے کم از کم اُن بوسیدہ جھنڈوں کی تعداد ہی گن لی جائے جو مزار سے متصل ہال کی دیواروں سے لٹک رہے ہیں۔ یہ جھنڈے اُن یورپی ملکوں کے ہیں جنہیں نیولین نے مختلف جنگوں میں مات دی تھی۔ کہتے ہیں نیولین کو اس قسم کے جھنڈے جمع کرنے کا بڑا شوق تھا چنانچہ یہی شوق اُسے کشاں کشاں ماسکو بھی لے گیا۔ واپسی پر وہ ایک دوروی جھنڈے تو لے آیا مگر ہال میں آویزاں جھنڈوں سے ڈگنے روسیوں کے ہاتھوں گنوا بیٹھا۔

میں سکندر سوئم کے پل پر آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ میرے دائیں ہاتھ پر کلیسائے سیکرے کر کے سفید مشرقی گنبد نظر آ رہے تھے۔ میں پیرس کے آسمان پر بکھرے ہوئے کالے بادلوں میں سے چھتی ہوئی پھوار میں بھیگتا۔ پیرس اور پیرس والوں کو صلواتیں سناتا چلا جا رہا تھا کہ کانکورڈ چوک

میں سے ایک رفتار نیلی کار نکلی۔ فواروں سے ٹکراتے ٹکراتے بچی اور پھر میرے پاس آن رُکی۔ ڈرائیور نے کار کی کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا اور ہکلاتے ہوئے پوچھا ”پارلے.... ڈو.... فرانے موسیو؟“ غالباً وہ مجھے اُن بے شمار الجرائزیوں میں سے سمجھ رہا تھا جو اس شہر میں آباد ہیں اور فرانسیسی میں گفتگو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”معاف کیجیے گا میں فرانسیسی سے نا بلد ہوں“ میں نے انگریزی میں جواب دیا۔ ”اوہ بوائے“ ڈرائیور کا لہجہ امریکی تھا ”خدا کا شکر ہے تم انگریزی بول سکتے ہو۔ میں پچھلے ایک گھنٹے سے کسی ایسے ہی شخص کی تلاش میں تھا۔ کیا تم مجھے لوور عجائب گھر کا راستہ بتا سکتے ہو؟ وہ مونالیزا والا؟“ اس نے باچھیں کھلا کر مونالیزا کی مشہور زمانہ مسکراہٹ کی نقل اُتارتے ہوئے پوچھا۔

”لوور میں آج ہفتہ وار تعطیل ہے میں ادھر سے ہی آ رہا ہوں۔“ میں نے برساتی کا کالر اوپر کرتے ہوئے جواب دیا۔ پھر ارب قدرے تیز ہو چلی تھی۔

”اوہ ڈیم“ اس نے مایوسی کے عالم میں اپنی ران پر ایک گھونسا رسید کیا اور زیر لب بڑبڑانے لگا۔ میں وہاں کھڑے کھڑے بھیگنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے آگے چل دیا۔

”ہے“ امریکی نے پیچھے سے پکارا ”اگر تمہیں فرصت ہے تو میرے ساتھ کار میں بیٹھ جاؤ اور نیپولین کے مقبرے تک میری رہنمائی کرو۔ میں شکر گزار ہوں گا۔“

مجھے فرصت ہی فرصت تھی چنانچہ میں نے فوراً اس کی دعوت قبول کر لی۔ کم از کم بارش سے تو بچاؤ ہوگا۔ امریکی کا نام نارمن تھا اور مغربی جرمنی میں متعین امریکی فوج میں لفٹیننٹ کی حیثیت سے دو سال ڈیوٹی پوری کر کے وطن واپس جانے سے قبل یورپ کی سیر پر کمر بستہ تھا۔ اکثر امریکیوں کی طرح وہ بھی سات روز میں سات یورپی دارالحکومت دیکھنے کی نیت سے نکلتا تھا۔

”دائیں ہاتھ پر نیپولین کے مقبرے کو سڑک جاتی ہے“ میں نے انولید کے گنبد کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے کار فوراً روک لی۔ مقبرے کی طرف غور سے دیکھا اور پھر جیب میں سے ایک ڈائری نکالی جس کے ایک صفحے پر کچھ اس قسم کی عبارت تھی:

”شریر پیرس“

1- آئفل ٹاور، 2- نیپولین کا مقبرہ، 3- نیویارک کے مجسمہ آزادی کا اصلی ماڈل

4- امریکن ایکسپریس سے ڈاک کی وصولی، 5- دریائے سین، 6- کلیسائے نوٹر ڈیم، 7- مالن رُوح کا ٹائٹ کلب، 8- شانزے لیزے کے قبوہ خانے میں کافی پینا اور فرانسیسیوں کو دیکھنا۔

نوٹ: اگر ہو سکے تو کسی فرانسیسی میڈموذیل کے ساتھ انکھیلیاں۔

اسی قسم کی فہرستیں ڈائری کے دوسرے صفحات پر تھیں جن میں لنڈن۔ روم۔ برلن وغیرہ

شامل تھے۔

”بس دیکھ لیا“ اس نے نیپولین کے مقبرے کے آگے بھی ایک لکیر کھینچ دی اور کار

سٹارٹ کر لی۔

”دریائے سین بائیں ہاتھ پر بہہ رہا ہے اس کے درشن بھی کر لیجئے“ میں نے طنزیہ لہجے

میں کہا۔

اُس نے دریا کے گدلے پانی پر ایک نظر ڈالی ”آہ رومانوی دریائے سین“ اور ایک

ٹھنڈی آہ بھر کے فوراً سٹم نمبر پانچ پر بھی لکیر کھینچ دی۔ بس اب نمبر ایک اور آٹھ باقی ہیں اور پیرس

مکمل ہو جائے گا۔

ہم اُسی سڑک کے آخر میں جب آئفل ٹاور کے پاس پہنچے تو نارمن نے اُس کی تاریخ فر فر

سنادی۔ انجینئر آئفل کا کمال۔ اٹھتر لاکھ طلائی فرانک کی لاگت سے تعمیر کردہ نوسو چوراسی فٹ اونچا

وغیرہ وغیرہ۔ میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا تو دُھند اور بادلوں نے ٹاور کا مکمل گھیراؤ کر رکھا تھا اور پہلی

منزل سے اوپر کا حصہ روپوش تھا۔

”میں لفٹ کے ذریعے ٹاور کی آخری منزل پر جا کر پیرس کا نظارہ کروں گا۔“ نارمن

نے کار کا دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔

”لیکن بارش اور دُھند کی وجہ سے تمہیں وہاں کچھ بھی تو دکھائی نہ دے گا“ میں نے

کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے آواز دی۔

”کیا تم چاہتے ہو کہ میں امریکہ واپس جا کر دوستوں کے سامنے اس بات پر شرمندہ

ہوں کہ پیرس جا کر آئفل ٹاور کی آخری منزل سے شہر کا نظارہ بھی نہیں کیا۔“ اس نے ٹکٹ کی

کھڑکی کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

میں کار کے شیشے اوپر چڑھا کر وہیں بیٹھا رہا۔ پانچ منٹ بعد وہ واپس آ گیا اور جیب

سے ڈائری نکال کر آفلٹ ناور کے آگے لکیر کھینچ دی۔ ”اب رہ گیا شانزے لیزے میں کافی پینا اور....“ اس نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہا ”کسی فرانسیسی لڑکی کے ساتھ ہولالا۔“

چنانچہ ہم وہاں سے فوراً شانزے پر پہنچے جہاں قبوہ خانوں کے باہر تہی ہوئی قاتلوں کے تلے بے شمار لوگ بیٹھے بارش کے رُکنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ہم بھی ایک جگہ بیٹھ گئے اور کافی طلب کی۔ نازن نے پورے پانچ منٹ میں کافی ختم کی چند فرانسیسیوں کو گھورا اور پھر اپنی فہرست کی آخری آئٹم پوری کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ جانے سے پہلے مجھے کہنے لگا ”کیا میں تمہیں شوٹ کر سکتا ہوں؟“

”وہ کس خوشی میں؟“ میں نے قدرے گھبرا کر پوچھا۔

”میرا مطلب ہے کیا میں تمہاری تصویر کھینچ سکتا ہوں؟“ اس نے کار سے کیمرا نکالا میری تصویر کھینچی اور ڈائری نکال کر شریر پیرس کے عنوان تلے ”پاکستانی پیرس میں۔“ تصویر کھینچی ”لکھ کر کارٹسٹ کی اور پگال کی طرف چلا گیا“ جہاں امریکن ڈالر لکھیلیوں میں بڑی آسانی سے تبدیل کروائے جاسکتے ہیں۔ مجھے چونکہ اب اور کوئی کام نہ تھا اس لیے وہیں قبوہ خانے میں بیٹھا کافی پیتا رہا۔

قبوہ خانوں اور دکانوں کے شکیسوں میں سے پھوٹی ہوئی روشنی کی کرنیں شانزے کے گیلے فٹ پاتھ پر منعکس ہو رہی تھیں۔ فٹ پاتھ پر چپکے ہوئے شاہ بلوط کے سرخ پتے کسی جدید مصور کے شاہکار کی صورت میں ابھر رہے تھے۔ بارش کی وجہ سے درخت اور بھی نکھر گئے تھے۔ میں بے دھیانی میں گرم کافی کے گھونٹ بھرتے ہوئے فٹ پاتھ کی گیلی سطح پر نظریں جمائے پاسکل کے بارے میں سوچنے لگا۔ کاش میں اُس روز اس کے گھر کا پتہ پوچھ لیتا۔ کم از کم میں اسے تلاش کر کے اس روز نہ آنے کی معذرت تو کر سکتا۔ جانے وہ میرے بارے میں کیا سوچتی ہوگی؟ شاید اس وقت وہ بھی میری طرح اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھی باہر برقی بارش کو تک رہی ہوگی! میری نگاہیں فٹ پاتھ سے علیحدہ ہو کر سامنے فضا میں ایک نقطے پر مرکوز ہو گئیں۔ مختلف چہرے اس نقطے کی زد میں آتے اور ایک متحرک سائے کی طرح آگے بڑھ جاتے۔ بوڑھے فرانسیسی بیری ٹوپیاں پہنے ہوئے۔ فیشن ایبل فرانسیسی لڑکیاں جن کے رنگ برنگے چھاتے اُن کے ساتھی لڑکوں نے تمام رکھے تھے اور وہ خود بارش میں بھیگتے جا رہے تھے۔ لمبے بالوں والے ہتھی موسم کی سختیوں سے

بے پروا اپنی دھن میں مگن جھومتے ہوئے۔ غیر ملکی سیاح جو بارش سے پناہ لینے کی خاطر قبوہ خانوں میں جھانکتے اور پھر کوئی خالی جگہ نہ پا کر آگے بڑھ جاتے۔ قالین بیچنے والے الحجازی۔ نکونی واڑھیوں والے مصور۔ چہرے گزرتے گئے اور میں نظریں اُسی نقطے پر جمائے بے دھیانی میں گھورتا رہا۔ پھر ایک اور چہرہ گزرا۔ خوبصورت اور بھولا بھالا سا چہرہ۔ تراشے ہوئے چھوٹے چھوٹے بال اور پھر میری نظروں میں ایران کے سارے آسمان کی نیلا ہٹ منجھ ہو گئی ”پاسکل“ میرے دھڑکتے ہوئے دل نے دہائی دی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا اور لوگوں سے ٹکراتا۔ کرسیاں اور میزیں پھلانگتا چوڑے فٹ پاتھ پر بھاگنے لگا۔ وہ اپنی خالہ کا بازو تھامے سر جھکائے بے حد آہستہ آہستہ شانزے لیزے کے گیلے فٹ پاتھ پر چلی جا رہی تھی۔

”پاسکل“ میں نے تقریباً چیخ کر کہا۔ اُس کے لڑکھڑاتے ہوئے قدم فٹ پاتھ پر جامد ہو گئے۔ میں قریب پہنچا تو میری سانس پھولی ہوئی تھی۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں اُس روز وقت پر نہ پہنچ سکا اور تمہیں....“

”آئی ان سے ملو یہ مستنصر ہیں!“ اُس نے میری معذرت کو نظر انداز کرتے ہوئے خالہ سے تعارف کروایا۔

”ہاں“ اُس کی خالہ محترمہ نے پھنکار کر کہا اور پھر مجھے سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے گویا ہونیں ”یہی ہے نا جولنڈن سے تمہارے ساتھ آیا تھا اور پھر غائب....“

”ہاں ہاں آنٹی“ پاسکل نے بے صبری سے خالہ کی بات کاٹتے ہوئے سر ہلایا اور پھر خاموشی سے شانز پر رواں ٹریفک کو گھورنے لگی۔

چند لمحوں کے بعد خالہ صاحبہ پھر گویا ہونیں ”تم دونوں اگر یہاں کھڑے ہو کر خاموشی سے بارش میں بھیگنا چاہتے ہو تو بڑے شوق سے۔ مجھے بال بنوانے کے لیے ہیر ڈریسر کے ہاں جانا ہے۔“ اور پھر پاسکل کا ہاتھ پکڑ کر بڑی شفقت سے کہنے لگیں ”مواشیری گھر جلدی آنے کی کوشش کرنا۔“ خالہ نے ایک مرتبہ پھر میرا جائزہ لیا اور فتح کی محراب کی جانب مارچ کرتی ہوئی چلی گئیں۔

میں اُسے سہارا دے کر واپس قبوہ خانے میں لے آیا۔ پاسکل نے آج بھی وہی سرخ کوٹ پہن رکھا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر پور معذرت کی لیکن شاید وہ میری باتیں سن ہی نہیں رہی تھی۔

”لوگ پہلے پہل میرے چہرے سے وقتی طور پر متاثر ہو کر مجھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کر بیٹھتے ہیں“ وہ کہہ رہی تھی ”اور بعد میں جب انہیں اپنی حماقت کا احساس ہوتا ہے تو وہ اپنا ارادہ تبدیل کر دیتے ہیں۔ تم پہلے شخص نہیں جس نے یہ رویہ اختیار کیا ہو۔ سین کے کنارے اکیلے چلنے کی مجھے عادت ہو گئی ہے۔ اُس روز بھی میں اکیلی ہی گھومتی رہی۔“ اُس کی نظریں میز پر رکھے چمکدار مینو کارڈ پر گڑی تھیں اور مجھے خدشہ تھا کہ ابھی ابھی کارڈ پر ٹپ ٹپ اُس کے گرم آنسو گرنے لگیں گے۔

”میں نے ارادہ تبدیل نہیں کیا تھا۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔ ”پاسکل تمہارے اندر خود اذیتی کی عادت نے گھر کر لیا ہے۔ تمہیں ہر وقت اپنی جسمانی خامی کا احساس ستاتا رہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس سے قبل بھی تمہاری زندگی میں ایسے لمحے ضرور آئے ہوں گے جب تم نے سچے جذبات کو صرف ظاہراً امدادی سمجھا ہو۔ تم اب بھی ایک ایسے ہی لمحے میں سے گزر رہی ہو۔“

وہ بدستور مینو کارڈ پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔

”اور ہاں میرا خیال ہے کہ میرا چہرہ اس کارڈ سے تو بہت بہتر ہے جسے تم پچھلے دس منٹ سے محبت بھری نظروں سے دیکھ رہی ہو۔“

اس نے کارڈ سے نظریں ہٹالیں اور میری طرف دیکھا۔ اس کی بھیگی بھیگی آنکھوں کی نیلا ہٹ گہری ہو گئی تھی۔

”تم اس روز نہ آئے تو مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ اس کے بعد آج میں پہلی مرتبہ خالد کے اصرار پر اُن کے ساتھ باہر نکلی ہوں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اپنی جسمانی خامی کے بارے میں قطعاً نہیں سوچوں گی۔“

میں نے ویٹر سے بل لانے کے لیے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کرسی پر بیٹھی اپنے سرخ کوٹ کے کالر سے کھینچ رہی۔

”کیا یہیں بیٹھے رہنے کا ارادہ ہے؟“ میں نے ایک مرتبہ پھر شورلی کا بھرپور مظاہرہ کیا اور جھک کر کہا ”محترمہ پہلے آپ۔“

پیرس کی اُس بھیگی ہوئی شب کو پاسکل زندگی میں پہلی بار سین کے خوبصورت کناروں پر اکیلی نہ تھی۔ میں نے اسے سہارا دے رکھا تھا اور وہ بڑی ہمت سے لنگڑائے بغیر چلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہمارے دائیں اور بائیں شہر کے دونوں حصوں کو درجنوں مرصع و مرقع پل ایک دوسرے سے ملا رہے تھے۔ یہ پل نازک فرانسیسی طرز تعمیر کا شاہکار ہیں۔ پلوں پر روشنی کے قدیم طرز کے کھجے نصب ہیں جن کی روشنیاں نیچے سین کے گدلے پانی میں منعکس ہو رہی تھیں۔ موسیقاروں نے جہاں اپنے نغموں میں پیرس کے ماہ اپریل اور موسم خزاں کی تعریفوں کے پل باندھے ہیں وہاں دریائے سین کے ان پلوں کی مدح میں ”پیرس کے پلوں کے نیچے“ جیسی پسندیدہ دھنیں بھی تخلیق کیں، جنہیں سن کر خوبصورتی اور رومان کا ایک ہمہ گیر احساس روح میں جذب ہو جاتا ہے۔ ہم ان کے نیچے سے گزرتے تو اوپر پل پر چلنے والے لوگ پاسکل کو لنگڑاتے دیکھ کر لکھ بھر کے لیے ٹھٹک جاتے اور جب انہیں یہ احساس ہوتا کہ وہ کسی حادثے سے دوچار نہیں ہوئی، بلکہ قدرتی طور پر اپنا چہرے تو اُن کے چہرے ان تمام جذبات کا آئینہ بن جاتے جن کے اظہار کا خدشہ پاسکل نے پہلے روز کیا تھا۔ بوڑھیاں کھر پھسر کرنے لگتیں اور جوان لڑکیاں.... میں ایک ہاتھ میں پاسکل کا نیلا چھتا تھا مے اور دوسرے سے اسے سہارا دیے ایک عجیب سی مسرت محسوس کر رہا تھا جیسے ہمدردی اور پیار کے اس امتزاج کے بغیر اب تک میری زندگی نامکمل رہی ہو۔

ہر چند منٹ کے وقفے کے بعد سیاحوں سے پُر کوئی روشن کشتی سین کے پانی کو چیرتی ہوئی گزر جاتی۔ ان کی چھتیں ایسٹرنڈیم کی منہروں میں چلنے والی کشتیوں کی طرح شیشے کی بنی ہوئی تھیں اور باہر سے کشتی کا اندرونی حصہ بخوبی نظر آ رہا تھا۔ ایک کشتی گزری جسے پانی میں رواں ریسٹوران کہا جائے تو بجا ہوگا۔ کشتی کے گرد رسوں پر رنگ برنگے قلعے لٹک رہے تھے۔ لوگ شیشے کی چھت تلے بارش سے محفوظ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ویٹر خوراک کی طشتریاں ہاتھ میں لیے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے اور چند جوڑے بارش کی پروا کیے بغیر عرشے پر قفس کر رہے تھے۔

”میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی ایسے ہی کشتی نما ریسٹوران میں بیٹھ کر سین کی سیر کروں مگر....“ وہ رُک کر بولی ”میں تو قفس بھی نہیں کر سکتی۔“

”نہیں کر سکتیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ میں نے ہنس کر کہا ”قفس علامت ہے

مسرت اور خوشی کی اور یہ جذبہ بے ہنگم اچھل کود کے بغیر بھی تو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

”تمہارے پاس میرے ہر اعتراض کا جواب موجود ہے۔“ وہ بھی ہنس دی۔

دریا کے کنارے چلتے ہوئے ہم کلیسائے نوٹریڈیم کے دامن میں پہنچ گئے جسے بجلی کے تیز ققموں سے روشن کیا گیا تھا۔ یہ قطعہ زمین جو صدیوں سے خدا کی پرستش کے لیے وقف تھا 1793ء کے انقلاب کے دوران میں وقتی طور پر ”مسلک فہم“ کا معبد قرار پایا۔ مذہبی بزرگوں کے مجسمے ہٹا کر وہاں دولتیئر اور روسو جیسے انقلابیوں کے مجسمے نصب کر دیئے گئے۔ اسی کلیسا میں نیپولین کی رسم تاجپوشی ہوئی۔ میں نے پاسکل کی جانب دیکھا تو وہ کلیسا کے بلند بالا میناروں، خوبصورت کنکروں، خوفناک مجسموں اور بڑے گھڑیال میں کھوئی ہوئی تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

”تمہارے خوبصورت خیالوں کے لیے ایک پتہ کا سکھ“ میں نے لنڈن کے کاکنی مزدوروں کا ایک محاورہ استعمال کیا جس کا مطلب ہے کیا سوچ رہے ہو میں بھی تو معلوم ہو۔

”مجھے اس لمحے وہ کبڑا یاد آ رہا ہے جو کٹر ہیوگو کے ناول ”بچ بیک آف نوٹریڈیم“ کا مرکزی کردار تھا۔ وہ اسی کلیسا میں وہ سامنے والا گھڑیال بجانے پر معمور تھا۔ پھر اسے ایک خانہ بدوش لڑکی سے محبت ہو گئی لیکن اس اپانچ کو اپنی کریہہ النظری کا علم نہ تھا“ پاسکل نے یہ کہہ کر اپنی نیلی آنکھیں اُن بلند و بالا میناروں پر جمادیں جن پر چڑھ کر وہ کبڑا اپنی محبوبہ کے لیے کسی کونے میں اُگے ہوئے خود رو پھول توڑ کر لایا کرتا تھا۔

”وہ صرف ایک ناول کا کردار تھا“ میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

”آخر بد صورت لوگوں کو بھی تو محبت ایسے جذبے کی چاہت ہوتی ہے۔ اُن کا دل تو یہ بات نہیں مانتا نا کہ وہ بد صورت ہونے کی بنا پر محبت سے محروم کر دیئے جائیں۔“ پاسکل کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

”چونکہ اس وقت میرے سامنے نہایت ہی خوبصورت لوگ ہیں اس لیے میں نوٹریڈیم کے کبڑے کے بارے میں باتیں کرنے کے موڈ میں بالکل نہیں ہوں۔“ میں نے پاسکل کا بازو تھام کر کہا ”آؤ آگے چلتے ہیں۔“

”نہیں اب میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتی۔“ اس نے بچوں کی طرح سر ہلایا۔ ”میں آج تمہارے ساتھ چلتے ہوئے بہت دُور تک آ گئی ہوں اور زیادہ چلنے سے میرے ٹخنے میں

شدت کا درد اٹھتا ہے جو کئی دن تک رہتا ہے۔ میں کہیں بیٹھنا چاہتی ہوں۔“

میں نے کنارے کے ساتھ رکھے ہوئے پنج پر اپنی برساتی پھیلا دی اور ہم دونوں وہاں بیٹھ گئے۔ اس کے چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے۔

”مصیبت یہ ہے کہ میرا انگڑاپن اتنا شدید بھی نہیں کہ چلنے کے لیے بیساکھیوں کا سہارا لے لوں۔“

”پھر وہی شکایتیں“ میں نے قدرے درشت لہجے میں کہا۔

”میں شکایت تو نہیں کر رہی۔“ اس نے اپنے لب بھینچ لیے اور پھر مجھ سے کہنے لگی ”میں تو تمہیں صرف اپنی زندگی کے بارے میں بتا رہی تھی۔“

بارش بائیں ہاتھ پر چکی تھی۔ ہم رات گئے تک بیٹھ سین کے گرد لے پانیوں میں رواں روشن کشتیوں کو دیکھتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ ایسی باتیں جن کا کوئی بھی مثبت پہلو نہیں ہوتا۔ روزمرہ کی عام سی باتیں۔ لیکن یہی باتیں ایک گہری مسرت اور حقیقی خوشی کا منبع ہوتی ہیں۔ اس رات جب میں پاسکل کو گھر چھوڑ کر واپس ہوٹل جا رہا تھا تو مجھے محسوس ہوا کہ پیرس ایسا شہر ہے جہاں حقیقی جذبات سے عاری نقش دیرپا نہیں ہو پاتا اسی لیے میں آج تک اس شہر کی روح سے نا آشنا تھا۔

کمرے کے ایک کونے میں دیوار سے آئینہ لٹکائے۔ کمرے کے گرد صرف تولیہ باندھے میں شیوہ بنا رہا تھا کہ دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ میں نے سر جھکا کر تولیے سے شیوہ کا صابن پونچھا اور دروازہ کھول دیا۔ باہر ہوٹل کی مالکہ اپنے خزاں رسیدہ ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ سجائے مجھے ٹک ٹک رہی تھی۔ اُس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر میری کمرے کے گرد بندھے تولیے کی جانب دیکھا اور پھر جلدی سے کہنے لگی ”ہولالا! تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے اور نیچے تمہاری چھوٹی سی موٹی سی عورت تمہارا راہ تک رہی ہے۔“ میں نے سفید جالی دار پردہ ہٹا کر نیچے جھانکا۔ پاسکل فٹ پاتھ کے کنارے فرانسیسی کار ستران کے سب سے ننھے منے ماڈل میں منہ پھلائے بیٹھی تھی۔ ”صبح بخیر“ میں نے چیخ کر کہا۔ اُس نے بڑی آہستگی سے سر اٹھایا اور ادھر پر میری جانب دیکھنے لگی۔

”کابل الوجود لڑکے تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے۔ شرم!“ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ جان

بوجھ کر اتنے زور سے نعرہ لگایا کہ فٹ پاتھ پر چلنے والے اکثر راہ گیر منہ اٹھا اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے۔ ایک ادھیڑ عمر مائی نے مسکرا کر میری طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کیوں منھی سی جان کو ہلکان کر رہے ہو۔ نیچے دفع کیوں نہیں ہوتے۔ میں نے گہرا کر کھڑکی بند کر دی اور کپڑے بدلنے کی نیت سے تولیہ اُتارنے لگا۔ ہوٹل کی مالکہ ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔

”شکر یہ میڈم!“ میں نے جھک کر کہا۔

”شرارتی لڑکا،“ اس نے اپنی انگلی میرے چوڑے سینے پر ٹھونکتے ہوئے کہا اور ہنستی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

میں کپڑے بدل کر نیچے گلی میں آیا تو پاسکل سٹیئرنگ چھوڑ کر ساتھ والی نشست پر کھسک گئی ”کار تم چلاؤ۔“

”ہم لوگ یہ بیچ کام نہیں کیا کرتے۔ ہمارے ہاں شو فر ہوا کرتے ہیں۔“ میں نے وہیں کھڑے کھڑے بڑے ٹھٹسے سے کہا۔

”سچ؟“ اس نے فوراً میری بات کا یقین کر لیا۔

”تم ہی چلاؤ پاسکل! دراصل ہمارے پورے خاندان میں آج تک کسی کو کار خریدنے کی توفیق ہی نہیں ہوئی اس لیے مابودلت کو کار سرے سے چلانی ہی نہیں آتی۔“ میں نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا اور اُس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

پاسکل نے ہنس کر کار سٹارٹ کر دی اور ہم متعدد دگلیوں اور بازاروں سے نکل کر شانز پر آ گئے۔ وہ بڑی مشاقی سے کار چلا رہی تھی مگر بار بار اُس کی نظریں سڑک سے ہٹ کر مجھ پر مرکوز ہو جاتیں اور وہ مسکرا دیتی۔ میں اس بے جا التفات سے کچھ گھبراہٹ سی محسوس کر رہا تھا۔

”کیا دیکھ رہی ہو؟“

”یونانیوں کا دیوتا پالو یا آ رہا ہے۔“ اُس نے شوخی سے کہا۔

”جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔“ میں نے بری طرح جھینپتے ہوئے کہا۔ ”پالو درمیانے قد کا اور گندمی رنگ کا عام سا آدمی نہ تھا۔“

”وقت وقت کی بات ہے۔“ اس کی نیلی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

”یہ کار تمہاری ہے؟“ میں نے موضوع بدلنے کی خاطر کہا۔

”نہیں آنٹی کی ہے۔ میرے منحنے میں ابھی تک درد تھا اس لیے میں نے اُن سے مانگ لی۔ میں آج زیادہ چل نہیں سکتی صرف بیٹھ سکتی ہوں۔ میں نے کہا تھا میں صرف تب تک ہی حسین لگتی ہوں جب تک کسی قبوہ خانے کے کونے میں بیٹھی....“

”تم نے اب اگر اس قسم کی کوئی فضول بات کی تو....“ میں نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”میں کار سے اتر جاؤں گا۔ چلتی کار سے۔“

”دھمکیاں! ہوں؟“ اُس نے سر ہلا کر کہا۔

میں نے ہینڈل گھما کر دروازہ کھول دیا۔

”نہیں کروں گی،“ اُس کا دایاں ہاتھ ایسے اُپر اٹھا جیسے کسی نے اُسے بندوق دکھا دی ہو۔ ”وعدہ“ وہ بار بار سر ہلا کر مجھے یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔

پاسکل نے آج ہلکے گلابی رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا اور سر پر ریشم کا نیلا سکارف باندھ رکھا تھا۔ ہلکے نیلے رنگ کے میک اپ کی تہ سے اُس کی آنکھوں کی خوبصورتی اُجاگر ہو گئی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ پیرس میں آمد کے پہلے روز ”بوائے ڈی بولون“ کے علاقے سے گزرتے وقت مجھے وہاں کتنی خوبصورتی اور سکون کا احساس ہوا تھا اور میں نے وہاں ایک مرتبہ پھر واپس آنے کے بارے میں سوچا تھا۔

”کیوں نہ آج بوائے ڈی بولون میں دریائے سین کے پرسکون اور ہرے بھرے کناروں پر پکنک منائی جائے،“ میں نے تجویز پیش کی ”اور فرانسیسی بوڑھوں کی طرح مچھلیاں بھی پکڑی جائیں۔“

پاسکل نے فوراً تائید کی ”لیکن مچھلیاں پکڑنے کے لیے بنی اور کنڈیاں کہاں سے آئیں گی؟“ میں نے سر کھجا کر کہا۔

”کیسائے نوٹر ڈیم کے پہلو میں پھولوں کا بازار ہے وہاں مچھلیاں پکڑنے کا سامان بھی مل جائے گا،“ اس نے کار کا ٹکورد کے چوک سے دائیں ہاتھ پر موڑ دی۔

پھولوں کے بازار کے دونوں طرف لکڑی کے کھوکھوں میں پیرس کے گرد و نواح میں اُگائے ہوئے تازہ پھولوں کے انبار لگے تھے۔ میں نے پاسکل کے لیے زرد رنگ کے پھولوں کا ایک گلدستہ خریدا چاہا تو معلوم ہوا میں فراٹک کا ہے چنانچہ فوراً ارادہ ترک کر دیا۔ پاسکل اس

دوران میں مچھلیاں پکڑنے کے سامان کی تلاش میں تھی جو بالآخر بازار کے سرے پر ایک غلیظ کھوکھے میں اونگھتے ہوئے فرانسیسی بوڑھے سے دستیاب ہو گیا۔

”دریائے سین میں مچھلی کے شکار کے لیے کم از کم کتنا سامان درکار ہوگا؟“ میں نے بوڑھے کے آرام میں غل میں ہوتے ہوئے دریافت کیا۔

بوڑھے نے ایک جمائی لی اور اپنی پیری ٹوپی کی نوک پلک درست کر کے کہنے لگا۔ ”امریکی بنی اور کنڈی پچاس فرانک۔ مچھلیوں کو پانی سے باہر نکالنے کا جال دس فرانک۔ مچھلیاں پھانسنے کے لیے نقلی کیڑے مکوڑے بیس فرانک فی درجن۔ ایک ٹب مچھلیاں رکھنے کے لیے دس فرانک۔ کل نوے فرانک موسیو!“

”کل نوے فرانک موسیو“ میں نے بوڑھے کی نقل اتارتے ہوئے کہا ”ہم نے مچھلیاں پکڑنی ہیں، مگر کچھ نہیں۔ یہ بہت زیادہ ہے۔“

میں کھوکھے سے باہر جانے لگا تو بوڑھے نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے رازدارانہ لہجے میں پوچھا ”آپ کا ارادہ واقعی مچھلیاں پکڑنے کا ہے یا مڈموزیل کے ساتھ ایک خوشگوار دوپہر گزارنے کا؟“

”بس بین بین ہی سمجھو۔“ میں نے فرانسیسیوں کی مانند کندھے کیڑ کر جواب دیا۔ ”تو پھر میرے پاس قدرے استعمال شدہ کنڈیاں پانچ فرانک فی حساب سے بھی موجود ہیں۔ کیڑے مکوڑے مفت۔“ اس نے کونے میں پڑا ایک صندوق کھولتے ہوئے مجھے مژدہ سنایا۔

”تری بیان۔ سبحان اللہ“ میں شدہ فرانسیسی پر اتر آیا۔

بنی۔ کنڈیاں اور چند نقلی مینڈک لے کر ہم ایک قریبی قبوہ خانے میں چلے گئے اور وہاں سے پلنگ کے لیے سینڈوچ۔ تازہ پھل اور سوکھا گوشت خریدا لیا۔ کاؤنٹر کے پیچھے قبوہ خانے کا دراز قد اور بھاری سیاہ موٹھوں والا مالک نہایت غور سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ قدرے تامل کے بعد اس نے فرانسیسی میں مجھ سے کچھ دریافت کیا۔ پاسکل نے مترجم کے فرائض انجام دیئے اور بتایا کہ پوچھ رہا ہے کون سے ملک کے ہو؟ میرے منہ سے ”پاکستان“ کے الفاظ پوری طرح ادا بھی نہ ہوئے تھے کہ اس نے بڑی گرجوشی سے میرے دونوں کانڈھے پکڑ لیے ”الحمد للہ“ لہجہ خالص عربی

میں تھا اور پھر کمرے گرد بندہ سفید اپرن اُتار کر کاؤنٹر سے باہر نکل آیا اور مجھے گلے لگا کر تزاخ تزاخ میرے دونوں گالوں پر بوسے دیئے (مجھے اب معلوم ہوا کہ فرانسیسیوں نے یہ عادت کہاں سے مستعار لی تھی) ”الحمد للہ مسلمان“ وہ کہہ رہا تھا ”میں الجزائر۔ محمد بن بکر“ بکر نے مہمان نوازی کا ایسا بھرپور مظاہرہ کیا جیسے ہم پیرس کے کسی قبوہ خانے کی بجائے صحرا میں اس کے خیمے میں مہمان بن کر آ گئے ہوں۔ کافی پلائی۔ زبردستی کریم ایک کھلایا اور جاتے وقت کھانے کی ٹوکری میں ایک اور کریم ایک تھنے کے طور پر رکھ دیا۔

”اس الجزائر نے تو تمہارا استقبال ایسے کیا ہے جیسے تم آپس میں رشتہ دار ہو۔“ پاسکل نے قبوہ خانے سے نکلتے ہی حیرت سے کہا۔

”ہم مسلمان ہونے کے ناطے سے ایک ہی ڈور میں بندھے ہوئے ہیں اور آپس میں رشتہ دار ہیں۔“

پاسکل بے حد متاثر نظر آرہی تھی۔

واپس کار میں بیٹھ کر ہم شانز کے راستے فتح کی محراب تک آ گئے جس کے بڑے گول چکر کے گرد ہزاروں کاریں چیونٹیوں کی مانند رنگ رہی تھیں۔ بوئے ڈی بولون جانے کے لیے ہمیں دوسری طرف ایونیوفاک پر جانا تھا۔ پاسکل نے کار گول چکر میں موڑ دی۔ خاصی دیر کے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ ایونیوفاک میں مڑنے کی بجائے مزے سے محراب کے گول چکر کے گرد بے مقصد گھوم رہی ہے۔

”کیا کر رہی ہو پاسکل؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”میں آج بے حد خوش ہوں مستنصر!“ اس نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

”وہ تو ٹھیک ہے مگر ہم پچھلے پانچ منٹ سے ایک ہی دائرے میں گھوم رہے ہیں۔“

”میں اگر رقص نہیں کر سکتی تو کیا ہوا؟ کار میں بیٹھ کر ایک دائرے میں تو گھوم سکتی ہوں۔ ایک دو تین اور گھوم جاؤ۔ ایک دو تین۔۔۔“

میں نے اسے بڑی مشکل سے سمجھایا کہ تمام کاروں والے ہمیں بری طرح گھور رہے ہیں، بلکہ ابھی ابھی ٹریفک کے سپاہی نے سیٹی بھی بجائی تھی۔

”تم میں بالکل سپورٹس مین سپرٹ نہیں ہے“ اس نے ناک کیڑ کر کہا اور کار ایونیوفاک

میں موڑ دی۔

تھوڑی دیر میں ہم نیوی کے پل کے پاس پہنچ چکے تھے۔ فٹ پاتھ کے کنارے کار کھڑی کر کے ہم نے اُسی راستے پر چلنا شروع کر دیا جہاں چند روز قبل میں کیمپنگ کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ آج میں نے سامان کے وزنی تھیلے کی بجائے کاندھے پر بنسی اور کنڈیاں اٹھا رکھی تھیں اور خوراک کی ٹوکری میرے ہاتھ میں جھول رہی تھی۔ پاسکل کو ابھی میرے سہارے کی ضرورت نہیں تھی وہ آہستہ آہستہ میرے ساتھ معمولی طور پر لنگراتی ہوئی چلی آرہی تھی۔ چند فرلانگ چلنے کے بعد جب رہائشی مکانات اور ہاؤس بوٹوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تو ہم پتھروں کی بنی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے اتر کر دریا کے کنارے پر آ گئے۔ کنارے کے ساتھ دُور دور تک شاہِ بلوط اور بید کے گھنے درخت پھیلے ہوئے تھے۔ ہوا چلتی تو جنگلی بیلوں کے خوشنما پھول اور ہرے بھرے پتے دریا کی سطح پر جھک کر ڈبکی لگاتے اور پھر باہر آ جاتے جیسے کوئی راج ہنس اپنی پیاس بجھا رہا ہو۔ سورج کی تیز کرنوں میں حدت نمایاں ہو رہی تھی۔ میں نے ایک پرسکون اور سایہ دار جگہ کا انتخاب کر کے اپنی برساتی گھاس پر بچھا دی اور پاسکل کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ اُس نے ایک نازک اندام نیلے رینا کے مانند دونوں ہاتھوں سے اپنے گلابی لباس کے کونے پکڑے اور پھر میری سفید برساتی پر ایک خوبصورت راج ہنس کی مانند براجمان ہو گئی۔ میں نے بنیاں اٹھائیں اور کنارے پر چلا گیا۔ دریا کا پانی دھلی دھلائی سفید چادر کی طرح سلوٹوں سے پاک تھا جس پر دریا سے زیادہ ایک پرسکون جمیل کا گمان ہو رہا تھا۔ میرے سامنے دوسرے کنارے پر بھی چند لوگ دھوپ میں بیٹھے مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ کبھی کبھار کوئی اکھوتا کشتی ران دریا کی سطح کو چیرتا نیوی کے پل کی جانب سے نکلتا تو تلاطم برپا ہو جاتا۔ ہلکی لہریں کناروں تک پہنچتیں اور چھپاک چھپاک بیلوں کے پتوں اور پھولوں کو بو سے دیتیں۔ میں نے ایک نقلی مینڈک کنڈی کے ساتھ اٹکا یا اور اسے پانی میں ڈال کر واپس سائے میں آ گیا جہاں پاسکل برساتی پر لیئے ”پیرس ویسکی انفارمیشن“ کے صفحات پلٹ رہی تھی۔ دھوپ کی تمازت سے اُس کا چہرہ لال بھسوکا ہو رہا تھا۔

”اس میں دیکھ کر بتانا کہ کل لوور کا عجائب گھر کھلے گا یا نہیں! کبھی کوئی دوست مل جاتا ہے اور کبھی وہاں تعطیل ہو جاتی ہے۔ میں کل ہر صورت وہاں جانا چاہتا ہوں۔“

”کل بہت دُور ہے۔ اس وقت میں صرف آج کے بارے میں سوچ سکتی ہوں۔“

اُس نے رسالہ پھیل کر اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور گنگنا نے لگی۔

”ہے پاسکل بی بی“ میں نے رسالے پر اُس جگہ اُلگی بجائی جہاں اُس کی ستواں ناک ابھری ہوئی تھی۔ ”اگر مجھے صرف مچھلیوں کے شکار کا ہی شوق ہوتا تو اتنے تردد کی کیا ضرورت تھی۔ بازار سے درجن بھر خرید کر اپنے ہوٹل کے کمرے میں ٹانگ لیتا اور خوش ہو لیتا۔“

”میرے عین اوپر درختوں کے پتے بے حد چھدرے ہیں۔ سورج کی کرنیں چھن چھن کر میرے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ اس لیے میں نے رسالے سے منہ ڈھانپ لیا ہے۔ تم باتیں کرتے رہو میں سن رہی ہوں۔“ اس نے رسالے کا ایک کونا اٹھا کر میری جانب دیکھا اور پھر آنکھیں موند لیں۔

میں نے ایک نظر کنڈیوں کی طرف دیکھا جو بالکل ساکن پانی کی سطح پر تیر رہی تھیں اور وہیں نرم اور ٹھنڈی گھاس پر لیٹ گیا۔ واقعی پاسکل ٹھیک کہہ رہی تھی میرے اوپر بھی پتوں میں سے دھوپ کے دائرے جھپکتے اور آنکھوں کو چند ہیا کر غائب ہو جاتے۔ ہوا سنسناتی ہوئی درختوں میں سے گزرتی تو خوشگوار خنکی کا احساس ہوتا۔ آج کا دن کافی گرم تھا۔ دریا کی چمکیلی سطح پر سورج کی ترچھی کرنیں جذب ہو رہی تھیں اور بخارات کی ایک دُھندلی تہ پانی کے اوپر معلق تھی۔ نیند سے میری آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔ دوسرے کنارے پر درختوں میں کوئی جنگلی پرندہ چھپانے لگا۔ مجھے گرمیوں کی وہ بیتی دوپہر یاد آ گئیں جب میں اپنے گاؤں سے نکل کر راہت کی جانب جاتا ہوا راستے میں کیکر کے ایک پُر خار درخت کی چھدری چھاؤں میں دم لینے کے لیے رُکتا تھا۔ درخت پر بیٹھی ہوئی فاخہ ”کواؤ کواؤ“ کی دہائی مچا دیتی۔ فاخہ کی آواز میرے لیے ایک گرم اور بیتی دوپہر کی علامت بن گئی۔

”سو گئے ہو؟“ پاسکل نے رسالے کے کونے سے جھانکتے ہوئے پوچھا۔ اُس کی آنکھیں نیند سے سرخ ہو رہی تھیں۔

میں نے آنکھیں کھول دیں اور کروٹ بدل کر اُس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ میں اپنے آپ کو بے حد ست اور ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے وقت کے پاؤں میں زنجیر پہنادی گئی ہو۔ صرف پانی کی سطح پر تیرتی ہوئی دو کنڈیاں ہیں اور پاسکل کا گلابی لباس ہے۔ بس!

”کیا تم پاکستان میں بھی مچھلیاں پکڑنے جایا کرتے تھے؟“ پاسکل نے گندنیوں کی

طرف اشارہ کیا، جو ابھی تک بے حس و حرکت تیر رہی تھیں۔

میں نے اُسے بتایا کہ بچپن میں جب گرمیوں کی چھٹیوں میں نانی اماں کے ہاں گاؤں جاتا، تو اُن کے لاکھ منع کرنے کے باوجود میرا تمام دن مقامی جوہڑ کے کنارے بانس کے تنکے پر نظریں جمائے گزرتا۔ اُن دنوں لوہے کی ایک کُنڈی ایک آنے میں مل جاتی تھی۔ بانس جوہڑ کے کنارے سے توڑ لیتا اور ڈوری نانی اماں بٹ دیتیں۔ چلے مچھلی پکڑنے کا سامان مکمل ہو گیا۔ مچھلی پھانسنے کے لیے نفلی مینڈک اور جھینگر وغیرہ تو ملتے تھے چنانچہ میں اصلی کینچوے حاصل کرنے کے لیے فاجو جات کے آموں کے باغ کے پہلو میں بہتی ہوئی پانی کی نالی پر چلا جاتا۔ میں اپنے ننھے منے ہاتھوں سے نالی کے کنارے کی نم اور سیلی مٹی کھودتا تو چھوٹے چھوٹے کینچوے ادھر سے ریگ کر ادھر گھس جاتے۔ میں انہیں دُم سے پکڑ کر کھینچتا تو اکثر ٹوٹ جاتے۔ اس کے بعد انہیں گیلی مٹی میں ملا کر پوٹلی میں باندھ لیتا اور جوہڑ پر چلا جاتا۔ کینچوے کو کُنڈی پر کھینچ کر تھوک لگا کر جوہڑ کے گدلے کائی زدہ پانی میں ڈال دیتا اور پھر میری آنکھوں سے جھپکنے کا عمل غائب ہو جاتا۔ میں دیدے پھاڑے پوری گرم دوپہر بانس کے تنکے پر نظر جمائے اکڑوں بیٹھا رہتا اور اُس کے ڈبکی لگانے کا انتظار کرتا رہتا۔ اس سے پہلے ایک چھوٹا سا گڑھا کھود کر اُس میں پانی بھر لیتا، تاکہ شکار کی ہوئی مچھلیاں اُس میں زندہ رکھی جاسکیں۔ بہر حال وہ گڑھا اکثر خالی ہی رہتا۔ کبھی کبھار کوئی کچھو امیری بیش قیمت کُنڈی چپکے سے ہڑپ کر جاتا اور بانس سمیت جوہڑ کی کچھڑ آلود تہ میں جا بیٹھتا۔ تم نے کبھی کچھو ادیکھا ہے پاسکل؟

پاسکل کی جانب سے کوئی جواب نہ آیا۔ وہ سوچتی تھی۔

میں آہستہ سے اٹھا اور دریا کے کنارے جا کر کُنڈیوں کو پانی میں سے نکال کر اچھی طرح دیکھا۔ مچھلی نام کی کوئی چیز انہیں چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔ میں نے بے دلی سے انہیں پھر پانی میں ڈال دیا اور واپس آ کر سائے میں لیٹ گیا۔ جانے کب نیند نے مجھے اپنی خنک اور آرام دہ آغوش میں لے لیا۔

میری آنکھ کھلی تو دوپہر ڈھل چکی تھی۔ میں نے برساتی کی طرف دیکھا۔ پاسکل وہاں نہیں تھی۔ وہ دریا کے کنارے پانی میں پاؤں لٹکائے کُنڈیوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد بار بار پانی میں ڈال رہی تھی۔ مجھے اب سائے میں خنکی کا احساس ہوا اور میں کھانے کی ٹوکری اور برساتی

اٹھا کر پاسکل کے پاس چلا آیا۔

”اُس خراٹ بوڑھے نے ہمیں مچھلیاں پھانسنے کے لیے جو نفلی مینڈک دیئے تھے وہ بھی استعمال شدہ ہیں۔“ اس نے مجھے لوہے کا مینڈک دکھاتے ہوئے سر ہلا کر کہا۔ ”ان کا رنگ اتر چکا ہے اس لیے مچھلیاں فوراً جان جاتی ہیں کہ مینڈک اصلی نہیں ہیں۔“

”اصلی مینڈک تو اہل فرانس ویسے ہی شام کے کھانے پر ہڑپ کر جاتے ہیں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”اس وقت مجھے اتنی بھوک لگی ہے کہ اگر اور کچھ کھانے کو نہ ملا تو شاید میں یہ لوہے کے مینڈک ہی کھا جاؤں۔“ اُس نے پیٹ پر ہتھیلی جما کر منہ بنا لیا۔

”اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور ٹوکری سے خوراک نکال کر برساتی پر رکھ دی۔ محمد بن بکرا الجوزازی کے کیک نے بے حد مزہ دیا۔ کھانے کے بعد میں نے سگریٹ سلگالیا اور پاسکل کو اپنے سفر اُنڈلس کے بارے میں بتانے لگا۔ وہ چپ سی ہو گئی۔ اب شام ہو رہی تھی اور شاہ بلوط اور بید کے سائے لمبے ہو کر دریا کے درمیان تک چلے گئے تھے۔ دوسرے کنارے پر مچھلیوں کا شکار کرنے والے بوڑھے بھی جا چکے تھے۔ بوئے ڈی بولون پر ایک ہلکی سرمئی چادر بچھ رہی تھی۔

ہم واپس نیولی کے پل تک پہنچے تو ایونیو فاک کی تمام روشنیاں منور ہو چکی تھیں اور ٹریفک کا بے پناہ شور تھا۔ پیرس تمام دن سورج کی گرم کرنوں تلے کڑھنے کے بعد ایک مرتبہ پھر ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ میں نے خوراک کی خالی ٹوکری اٹھا رکھی تھی۔ بنسیاں اور کُنڈیاں ہم وہیں دریا کے کنارے ہی چھوڑ آئے تھے۔ بے حد آہستہ چلنے کے باوجود پاسکل تھکن سے نڈھال ہو رہی تھی۔ کار میں بیٹھ کر وہ خاصی دیر خاموشی سے مجھے تنگ رہی اور پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگی ”مستصر! تمام خوبصورت چیزوں کا انجام کیوں خوبصورت نہیں ہوتا؟“ اور کار شارٹ کر دی۔ میں بھی سوچ رہا تھا کہ وقت نہیں تھم سکا۔ سین کے پانی پر تیری بے حس و حرکت کُنڈیاں اور پاسکل کا گلابی لباس۔ اب ایک خواب کی باتیں تھیں۔ سر اب تھا اور بس!

ہوٹل پہنچ کر جب میں کار سے اترنے لگا تو پاسکل نے میرا بازو تھام لیا ”زندگی میں پہلی بار آج مجھے اُس بوجھ کا احساس تک نہیں ہوا جس کے تلے میں ہر لمحے پستی رہی ہوں۔ آج میں

بھی عام انسانوں کی طرح تھی۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میں کبھی بھی اپناج نہ تھی۔ میں تمہارا شکر یہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔“ اُس کی نیلی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

”تم آخری روز یکشت ہی شکر یہ ادا کر دینا۔“ مجھ سے اور کوئی جواب نہ بن پڑا۔

”آخری روز؟“ اس کا چہرہ اتر گیا اور اُس نے میرا بازو چھوڑ دیا۔

”تم بہت تھک چکی ہو پاسکل“ میں نے اُس کے کندھے کو چھوتے ہوئے کہا۔ ”گھر جا کر آرام کرو۔ ہم کل پھر ملیں گے اور لوڈر جائیں گے۔“ وہ خاموش رہی۔

”اور ہاں“ میں ہوٹل کے دروازے پر جا کر پلٹ آیا ”تم ہر روز مجھے ملنے آ جاتی ہو کہیں تمہاری خالہ برا تو نہیں مناتی؟“

”ہر روز اور پھر آخری روز....“ اس نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا اور پھر یک دم سر جھٹک کر بولی ”اوہ خالہ! انہیں نہیں۔ انہوں نے تو سیکرے کر کے کلیسا میں شکرانے کے طور پر درجنوں موم بتیاں جلائی ہوں گی کہ ان کی اپناج بھانجی نے بھی چلنا سیکھ لیا ہے۔“

”تو پھر کل“ میں نے ہوٹل کا دروازہ کھولا اور اندر آ گیا۔

میں نے کمرے میں آ کر کھڑکی سے نیچے جھانکا تو کارا بھی تک فٹ ہاتھ کے کنارے کھڑی تھی اور اُس میں بیٹھی ہوئی پاسکل کی نظریں میری کھڑکی پر جمی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ جھینپ سی گئی اور فوراً کارٹناٹ کر کے گلی کی کمر پر مڑ گئی۔

”آج میں بھی عام انسانوں کی طرح تھی اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں کبھی بھی اپناج نہ تھی“ کہیں تاریکی میں پاسکل کی آواز گونجی اور ایک چھناکے سے میرے خوابیدہ ذہن کے پردوں سے آنکرائی۔ پھر تاریکی چھٹنے لگی اور دُور پاسکل کا حسین چہرہ دکھائی دینے لگا جو میرے قریب تر ہوتا گیا اور پھر آہستگی سے میری بند آنکھوں میں اتر گیا۔ اُس کے نازک لبوں پر مردنی چھائی ہوئی تھی اور اُس کی گہری نیلی آنکھیں مجھ پر جمی تھیں۔ اب وہ سفید لباس میں ملبوس دونوں بازوؤں کو کمان کی صورت میں اُپر اٹھائے اور ایک ٹانگ کو ہلکا سا خم دیئے ہوئے ایک نازک اندام نیلے رینا کی مانند میرے سامنے ایک عظیم سٹیج پر بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ سنگ مرمر کے کسی مجسمے کی طرح۔ اُس کے چاروں طرف سینکڑوں خوبصورت سفید پوش رقاصائیں گھیرا ڈالے کھڑی تھیں۔

وہ سب بھی بے حس و حرکت تھیں۔ تھیٹر بالکل خالی تھا اور میں سب سے اونچی گیلری میں ایک نشست کے سرے پر بیٹھا سٹیج پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ پاسکل نے ایک جھرجھری سی لی جیسے خواب سے بیدار ہو رہی ہو اور رقص کرنا شروع کر دیا۔ اُس کا چہرہ اُپر کو اٹھا ہوا تھا اور نیلی آنکھیں مجھ پر جمی تھیں۔ دوسری رقاصائیں اُس کے گرد ایک دائرے کی صورت میں بڑی نزاکت سے پنچوں کے بل گھوم رہی تھیں۔ اُن کے سفید لبادے آہستگی سے ہوا میں اڑتے تو اُن پر راج ہنوں کی ایک جھیل کا گمان ہوتا۔

”میں آج اپناج نہیں ہوں۔ نہیں ہوں“ پاسکل کی آواز سٹیج کی عمیق گہرائیوں میں گونجی اور مجھ تک ایک فریادی صورت میں لپکی۔ وہ بار بار یہی فقرہ دہرائی تھی اور اُس کی آنکھیں مجھ پر لگی ہوئی تھیں۔ رقص تیز ہوتا گیا۔ اب پاسکل اتنی بے قراری سے رقص کر رہی تھی جیسے رک جانا اُس کے بس کی بات نہ رہی ہو۔ میرے ذہن میں چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ پاسکل تو ٹھیک طرح سے چل بھی نہیں سکتی، وہ اتنی تیزی سے ناچ کیوں رہی ہے۔ وہ گر پڑے گی۔ مجھے اُسے روکنا چاہئے۔

”پاسکل اتنی تیزی سے مت ناچو“ میں اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا اور گیلری پر جھک کر اُس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ”تمہارے ٹخنے کا درد عود کر آئے گا۔ تم مر جاؤ گی پاسکل۔“

”آج میں اپناج نہیں۔ میں ضرور ناچوں گی۔“ اس کی مدھم سی آواز آئی۔

”پاسکل پاسکل“ میں خطرناک حد تک آگے جھک پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا۔ ”خدا کے لیے ناچنا بند کر دو۔“ لیکن وہ میری آواز تو سن ہی نہیں رہی تھی۔ اب وہ تیزی سے پورے سٹیج کا چکر لگاتے ہوئے اپنے پنچوں کے بل چاروں طرف گھوم رہی تھی۔ ایک دو تین اور گھوم جاؤ۔ ایک دو تین.... اور پھر ایک دم اُس کے ہاتھ اور پاؤں ست پڑنے لگے۔ رقص کی شدت میں کمی آتی گئی۔ ایک لمحے کے لیے وہ بالکل ساکن کھڑی ہوئی اور پھر ایک جھرجھری لے کر فرش پر نڈھال ہو کر گر پڑی۔ سفید لباس میں لپٹا ہوا اُس کا جسم بالکل بے جان تھا۔ دوسری رقاصاؤں نے اُسے گھیرے میں لے لیا اور جھک کر اپنے نرم و لطیف بازو اُس کے پورے جسم پر پھیلادئے۔ راج ہنس مرچ کا تھا۔

میری آنکھ کھلی تو میں پسینے میں شرابور اپنے بستر پر پڑا تھا۔ باہر پیرس کے بازاروں اور گلیوں میں اندھی سیاہ رات اُتری ہوئی تھی۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ ”مجھے پیرس سے فوراً چلے جانا چاہئے۔“ میں نے بستر کی چادر سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے سوچا۔ مجھے معلوم تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پاسکل میری رفاقت کی عادی ہوتی جائے گی اور پھر ایک روز جدائی کا تصور اُسے پھر انہی عمیق گھائیوں میں دھکیل دے گا جہاں سے وہ گھسنتی ہوئی میرے لیے باہر نکل آئی تھی۔ میں نے اُسی وقت فیصلہ کر لیا کہ کل پیرس میں میرا آخری دن ہوگا اور میں پاسکل سے آخری مرتبہ مل کر رات کی گاڑی سے ہسپانیہ روانہ ہو جاؤں گا۔

شانزے لیزے کا کشادہ فٹ پاتھ جہاں پیرس کی زندگی کا دل دھڑکتا ہے۔ ہمیشہ کی طرح پرہجوم تھا۔ میں نے پاسکل کو سہارا دے رکھا تھا اور ہم دونوں شاہ بلوط کے درختوں کی قطار تلے آہستہ آہستہ کانکور دچوک کی جانب جا رہے تھے۔ ہم اُس قہوہ خانے کے پاس سے گزرے جس کے باہر بیٹھے ہوئے اُس روز مجھے پاسکل نظر آئی تھی۔ کانکور دچوک کے درجنوں فواروں کی پھوار سے بچتے ہم تو لیزرز کے خوشنما باغات میں داخل ہوئے۔ سامنے لوور عجائب گھر کی پرشکوہ عمارت کھڑی تھی جو اپنے وسیع دامن میں دنیا کی نادر ترین تصاویر مجتہ اور فن پارے سمیٹے ہوئے ہے۔ اگر اس عمارت کے تمام حصوں کو سرسری نظر ہی دیکھنا ہو پھر بھی کم از کم دو روز صرف ہو جائیں۔ لوور میں رکھے سینکڑوں نادر مجسموں اور ہزاروں شاہکار تصویروں کے لیے اہل فرانس کو پھولیں کا شکر گزار ہونا چاہئے جس نے مفتوح ملکوں میں جھاڑ و پھیر کر تمام نوادرات جمع کیے اور پیرس پارسل کر دیئے۔ اپنے عجائب گھروں کو بھرنے کا یہ نادر نسخہ آج کل امریکی آزما رہے ہیں۔ البتہ طریقہ استعمال قدرے مختلف ہے۔ اُن زمانوں میں لوگ بڑی شرافت سے نوادرات لوٹ کر اپنے ملک لے جاتے تھے اور اب پہلے دوسرے لوگوں کی دولت لوٹی جاتی ہے اور پھر اس سے نوادرات خرید لیے جاتے ہیں۔ حال ہی میں ایک امریکی عجائب گھر نے ہسپانوی مصور ولاسکو کی ایک عامیانه تصویر کے لیے پانچ کروڑ روپے ادا کیے ہیں۔

دروازے کے پاس پہنچ کر میں نے ٹکٹ خریدے اور ہم دونوں لوور کے اندر داخل ہو گئے۔ سیاحوں کی اکثریت یہاں صرف دنیا کی مشہور ترین تصویر لیونارڈو ڈی ونچی کی بنائی ہوئی

”مونالیزا“ کا دیدار کرنے آتی ہے۔ ہم صرف مونالیزا کے گرد و نواح میں ہی پہنچ سکے کیونکہ تصویر کے سامنے سیاحوں کے غول بصد احترام اپنے گائیڈوں کے چہروں پر نظریں جمائے تصویر کی تاریخ اور فنی خوبیوں پر لیکچر سننے میں ہمت نہ گن گن گئے۔ گائیڈ کی تیز طراز زبان لمحہ بھر کے لیے رکتی تو سیاح ایک نظر تصویر پر بھی ڈال لیتے۔ جس طرح آج تک فن کے ہزاروں قدردان اور نقاد مونالیزا کی مشہور زمانہ مسکراہٹ کا بھید نہیں پاسکے اسی طرح مجھ پر بھی اس نہایت معمولی اور گنوار عورت کی تصویر کی شہرت و عظمت کا راز نہیں کھل سکا۔ ضروری تو نہیں کہ جو عورت بھی لیوں کو قدرے سکیڑ دے اس کی مسکراہٹ کے پیچھے سر بستہ رازوں کے انبار لگے ہوں۔

میں نے پاسکل کی رائے دریافت کی تو وہ جواب میں صرف مسکرا دی۔ مونالیزا کی مسکراہٹ ماند پڑ گئی۔ جہوم قدرے کم ہوا تو ہم نے تصویر پر ایک اچھتی ہوئی نظر ڈالی اور آگے بڑھ گئے۔

عجائب گھر کے طویل و عریض ہال کے آخر میں ایک چھوٹا سا دروازہ کھلتا ہے جس کے باہر ایک سفید تختی پر ”وینس ڈی میلو“ کے الفاظ کندہ ہیں۔ یونان کے آبجین سمندر میں بکھرے ہوئے سینکڑوں جزیروں میں سے ”میلو“ نام کا جزیرہ سب سے خوبصورت ہے۔ زمانہ قدیم میں وہاں ایک ماہر مگر غریب سنگ تراش رہا کرتا تھا۔ کہتے ہیں ایک شب حسن کی دیوی وینس آسمانوں سے اتر کر اُس غریب سنگ تراش کے جھونپڑے میں جلوہ افروز ہوئی۔ ”صدیوں سے اُن گنت سنگ تراش میرے آسمانی حسن کو پتھر میں ڈھالنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔“ وینس مہبوت کھڑے سنگ تراش سے گویا تھی۔ ”وہ سب ناکام رہے کیونکہ انہوں نے مجھے صرف ایک دیوی کی نظر سے دیکھا۔ اُن کے مجسمے پاکیزگی اور روحانیت کے مظہر بن گئے مگر میرا انسانی حسن اُن کی نظروں سے اوجھل رہا۔ میں حسن کی دیوی بھی ہوں اور گوشت پوست کی ایک حسین عورت بھی۔

میرا مجسمہ تراشنے کی خاطر پاکیزگی کے پہلو بہ پہلو انسانی جذبات کی بھی ضرورت ہے اور اس خواہش کی تکمیل کے لیے پورے یونان میں میری نگاہ انتخاب تم پر پڑی ہے۔ تم ایک ایسا مجسمہ تراشو گے جس میں میں دیوی سے زیادہ ایک خوبصورت عورت کے رُوپ میں ابھروں گی۔ مجھے جی بھر کے دیکھ لو۔“ وینس نے وہ شب سنگ تراش کے جھونپڑے میں گزاری اور سورج طلوع ہوتے ہی اپنے آسمانی مسکن کو پرواز کر گئی۔ سنگ تراش نے تیشہ ہاتھ میں لیا اور حسن کی دیوی اور

اپنی محبوبہ کا مجسمہ تراشنے کی خاطر سنگ مرمر کے ایک عظیم تودے میں کھو گیا۔ ماہ و سال گزرتے گئے۔ تیشے کی ہر کاٹ ایک نئے اور دلفریب نقش کو جنم دیتی گئی اور بالآخر مجسمہ مکمل ہو گیا۔ وینس غسل کے بعد سمندر سے باہر نکلتی ہوئی۔ اُس کے ایک ہاتھ میں سیب تھا اور دوسرے سے وہ اپنے لہادے کو تھامے ہوئے تھی جو سینے سے ڈھلک کر اُس کے متناسب کولہوں پر اٹکا ہوا تھا۔ میلو کے باشندوں نے جب مجسمہ دیکھا تو پکار اٹھے ”آج سے صرف وینس ہی میلو کے جزیرے کی دیوی ہوگی۔“ ایک عظیم الشان معبد تعمیر کیا گیا اور مجسمے کی خوبصورتی کا شہرہ نیلے پانیوں کے پار شاہ یونان تک بھی جا پہنچا۔ شاہ نے میلو کے باشندوں کو پیغام بھجوایا کہ یہ مجسمہ فوراً اُس کے دربار میں بھیج دیا جائے۔ اہل میلو نے انکار کر دیا۔ ایک روز معبد کے اُونچے مینار پر تعین پہریدار نے شاہ یونان کے لاقعداد جنگی جہاز میلو کی طرف بڑھتے دیکھے اور معبد کے پروہتوں کو اس کی خبر کر دی۔ تمام پروہتوں نے اپنی دیوی کو یونانیوں سے بچانے کی خاطر ایک کٹھن فیصلہ کیا۔ مجسمے کو اس حد تک بد صورت اور نامکمل بنا دیا جائے کہ یونانی اُسے ناکارہ سمجھ کر واپس لوٹ جائیں۔ چنانچہ ایک تیز شیشے سے وینس کے خوبصورت بازو کندھوں تک کاٹ کر انہیں گہرے سمندر میں پھینک دیا گیا۔ مگر یہ ترکیب بھی کام نہ آئی۔ کٹے ہوئے بازوؤں کی وینس کی خوبصورتی اب بھی سحر انگیز تھی اور یونانی اُسے اٹھا کر اپنے ملک میں لے گئے۔ آج سے چند برس پیشتر نیویارک میں رہنے والے ایک یونانی باشندے نے دو جہاز خریدے اور کئی ماہ تک میلو کے گرد پھیلے ہوئے سمندر میں وینس کے کٹے ہوئے بازو تلاش کرتا رہا تا کہ انہیں ایک مرتبہ پھر مجسمے سے جوڑ کر وینس کو ہزاروں سال پہلے کا ملکوتی حسن عطا کر دیا جائے، مگر اُسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

میں اور پاسکل جب ”وینس ڈی میلو“ یعنی میلو جزیرے کی وینس کے کمرے میں داخل ہوئے تو یوں محسوس ہوا جیسے ہم ہزاروں سال قبل کے اُس عالی شان معبد میں پہنچ گئے ہیں جہاں قربان گاہ کے اوپر ایک ستون پر وینس کا مجسمہ نصب تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آج اُس کے خوبصورت بازو میلو جزیرے کے گرد پھیلے ہوئے نیلے پانیوں کی تہ میں کالی آلود ہو چکے ہوں گے۔ مجسمے کے سنگ مرمر کا دو دھیا رنگ دُھندلا چکا ہے اور جسم کے اکثر حصوں سے چھوٹی چھوٹی کرچیاں علیحدہ ہو کر گڑھے بن چکے تھے۔ اِس بوسیدہ حالت میں بھی وینس ایک ذی رُوح دیوی کی مانند آپ کو مسحور کر دیتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ابھی اِس اُونچے ستون سے نیچے اتر کر بڑی حیرت سے

ہمیں پوچھے گی ”میں میلو کے چمکتے ہوئے جزیرے سے اِس سرودیس میں کیسے آگئی؟ میرے بازو کہاں ہیں؟ میں اپنا ج کیسے ہو گئی؟“

”مجھے تو اِس مجسمے میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی“ پاسکل نے مجسمے کے گرد گھومتے ہوئے اسے تنقیدی نظروں سے دیکھا ”اِسے دنیا کی خوبصورت ترین عورت کہا جاتا ہے بلکہ فرانس میں اس مجسمے کے جسمانی تناسب کو معیار قرار دے کر ایک مقابلہ حسن بھی منعقد کیا جاتا ہے۔“ پاسکل نے ایک اُچھتی ہوئی نگاہ وینس کے سڈول سینے پر ڈالی اور ناک چڑھا کر کہنے لگی ”میرے خیال میں تو وینس بے حد موٹی ہے“ اس نے آخری فقرہ رشک آمیز لہجے میں اتنی معصومیت سے کہا کہ مجھے ہنسی آ گئی۔

”دراصل تم وینس کے خوبصورت جسم سے جلتی ہو۔“

”میں کیسے جل سکتی ہوں؟“ پاسکل نے زندگی ہوئی آواز میں آہستہ سے کہا اور پھر ایک دم کر کہنے لگی ”وہ بھی تو میری طرح اپنا ج ہے۔“

میں سکتے میں آ گیا۔ مجھ گمان بھی نہ تھا کہ پاسکل اس خوبصورت مجسمے میں بھی اپنی دل آزادی کا جواز ڈھونڈے گی۔

”ہاں وہ بھی اپنا ج ہے لیکن اس نے اپنے اپنا ج پن کو خود اذیتی کا ذریعہ نہیں بنالیا۔“ مجھے ایک دم غصہ آ گیا اور پھر اُسی وقت اپنی حماقت کا احساس ہو گیا۔ میں نے پاسکل کے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”وینس کو اپنے حسن پر اتنا ناز ہے کہ لوگ اُس کے کٹے ہوئے بازوؤں کو بھول چکے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ تم بھی بے حد حسین ہو۔ پاسکل تم وینس کی مانند اپنے کٹے ہوئے بازوؤں کو بھول کیوں نہیں جانتیں؟“

”میں نہیں بھول سکتی۔“ اس نے آہستہ سے کہا اور پھر لگا تار سسکیاں بھرنی شروع کر دیں۔ اس کی نیلی آنکھوں سے آنسوؤں کے فوارے چھوٹ رہے تھے اور اس کا گول چہرہ تر پتر تھا۔ ”میں نہیں بھول سکتی۔ نہیں بھول سکتی۔“ وہ بار بار کہہ رہی تھی۔ کمرے میں موجود دوسرے لوگ ہمیں عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں اسے سہارا دے کر عجائب گھر سے باہر لے آیا اور تو لیزر کے باغ میں ایسا وہ ایک پنچ پر بٹھا دیا۔ ہم شام تک وہیں بیٹھے رہے اور وہ خاموشی سے میرے شانے پر سر رکھے روتی رہی اور سسکیاں بھرتی رہی۔ میں چپ چاپ اس کے آنسوؤں سے

تر معصوم چہرے اور ہنگی ہوئی آنکھوں میں تکتا رہا اور سوچتا رہا۔ کیا وہ خود اپنے کئے ہوئے بازو نہیں بھول سکتی یا بوڑھی عورتیں جوان لڑکیاں اور مرد اسے بھلانے نہیں دیتے۔ شام ہونے کے ساتھ باغ میں نصب شدہ روشنیاں جل اٹھیں اور چہل پہل شروع ہو گئی۔

”میں کسی پُر سکون جگہ بیٹھنا چاہتی ہوں۔“ پاسکل نے بیچ سے اٹھتے ہوئے کہا۔
”پھولوں کا بازار اس وقت بند ہوگا چلو وہاں چلتے ہیں۔“
”اگر تم پسند کرو تو میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں؟“

”نہیں نہیں۔ اب میں بالکل ٹھیک ہو گئی ہوں۔“ اس کی پلکوں تلے صاف شفاف نیلی آنکھیں جھانکنے لگیں اور وہ مسکرا دی۔

ہم تو لیسرز کے باغات میں سے چلتے ہوئے پھولوں کے بازار میں آ گئے جہاں سے کل صبح ہم نے مچھلیاں پکڑنے کا سامان خریدا تھا۔ پھولوں کے کھوکھے بند ہو چکے تھے اور پورا بازار ویران پڑا تھا۔ بازار کے دونوں طرف درختوں کی قطاریں تھیں جن کے سوکھے ہوئے پتے ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ ایک کھوکھے کے باہر چند ٹوٹی ہوئی کرسیاں پڑی تھیں۔ ہم دونوں وہاں بیٹھ گئے۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ آٹھ بجنے کو تھے اور مجھے بہر صورت دس بجے تک سٹیشن پر پہنچ جانا چاہئے تھا۔

”پاسکل“ میں نے اُس کی شوڑی تلے انگلی رکھ کر اس کے خوبصورت چہرے کو اپنی جانب کیا ”مجھے تم سے ایک ضروری بات کہنا ہے۔ بشرطیکہ تم۔۔۔“
”تم جارہے ہو؟“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور میرا ہاتھ پرے کر کے سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

”لیکن تمہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا؟“ میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔
”لوگوں کے روئے نے مجھے ایک ایسی حس عطا کر دی ہے کہ جب بھی کوئی مجھے چھوڑنا چاہتا ہے میں جان جاتی ہوں۔ تم آج صبح سے ہی مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔“
”پیرس سے سان سباستیان ہسپانیہ کے لیے گاڑی ساڑھے دس بجے روانہ ہوتی ہے۔“ میں احساسِ ندامت تلے دبے جا رہا تھا۔ ”پاسکل سوچو تو سہی مجھے آخر ایک روز تو یہاں سے جانا ہی تھا۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو مگر میں یہ کیسے سوچ سکتی تھی کہ تم نے ایک روز پیرس سے چلے جانا ہے۔ تم سیاح ہو اور کسی قسم کے بندھنوں کو برداشت نہیں کر سکتے اور پھر اپنا بیچ بندھنوں کے۔ میں نے ساری عمر ایک مفرد و مجرم کی مانند لوگوں سے چھپ کر گزاری ہے۔ میرے لیے کسی پر بھروسہ کرنا ممکن نہ تھا۔ میں نے اپنی ایک علیحدہ دنیا بسالی جس میں صرف خوابوں کے لوگ بستے تھے۔ تم نے مجھے خواب کی اس دنیا سے نکال کر باہر لا کھڑا کیا۔ اور اب۔۔۔ اب میں ایک مرتبہ پھر اپنے آپ کو بے بس اور اپنا بیچ محسوس کر رہی ہوں۔ مجھے لوگوں کی نظروں سے چھپ کر رہنا ہوگا۔“ پاسکل کی آنکھیں بالکل خشک تھیں اور وہ بڑے اطمینان سے باتیں کر رہی تھی۔

”تم اب کبھی خوابوں کی اس دنیا میں واپس نہیں جاؤ گی۔“ میں نے اُس کا تنک ہاتھ تھامتے ہوئے کہا ”تم نے دیکھ لیا ہے کہ کوئی بوڑھی عورت کھسر پھسر نہیں کرتی اور کسی لڑکی نے بھی۔۔۔“

”تم نہیں دیکھ رہے تھے مستنصر! مجھے تو اُن کی نگاہوں کی سونیاں چبھ رہی تھیں اور یہ سونیاں میرا مقدر بن چکی ہیں۔ میری سونیاں نکالنے کے لیے اب کوئی شہزادہ نہیں آئے گا۔“
ایک مرتبہ پاسکل نے مجھ سے کہا تھا کہ میرے پاس اس کے ہر اعتراض کا جواب موجود ہے۔ مگر اس وقت میں لا جواب ہو چکا تھا۔

”چند ہفتوں میں موسم سرما شروع ہو جائے گا اور مجھے ہر حالت میں اس سے پہلے ترکی عبور کر کے وطن کی راہ لینی ہے ورنہ راستے میں برف گرنی شروع ہو جائے گی۔“ میں نے نظریں جھکا لیں۔ جانے کیوں مجھے اپنے روئے پر شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ میرا اپنا ذہن میری باتوں کی نفی کر رہا تھا۔

”موسم سرما شروع ہو جائے گا تو کیا ہوا آخراں کا اختتام بھی تو ہوگا اور پھر تم موسم بہار میں واپس وطن لوٹ جانا۔“ اس نے التجا کی۔
پاسکل بیچ کے پرانے روغن کوناخنوں سے کھرچتی رہی اور خاموش بیٹھی مجھے تکتی رہی جیسے میرے دل کی آواز کی منتظر ہو۔

”موسم سرما کی آمد تمہاری نسبت میرے لیے زیادہ اذیت ناک ہے۔“ مجھے خاموش پا کر اُس نے کہنا شروع کیا۔ ”خزاں کے شروع میں میرے ٹخنے کا درد اور بھی شدت اختیار

تر معصوم چہرے اور بھیگی ہوئی آنکھوں میں تکتا رہا اور سوچتا رہا۔ کیا وہ خود اپنے کئے ہوئے باز نہیں بھول سکتی یا بوڑھی عورتیں جوان لڑکیاں اور مرد اسے بھلائے نہیں دیتے۔ شام ہونے کے ساتھ باغ میں نصب شدہ روشنیاں جل اٹھیں اور چہل پہل شروع ہو گئی۔

”میں کسی پُر سکون جگہ بیٹھنا چاہتی ہوں۔“ پاسکل نے بیچ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”پھولوں کا بازار اس وقت بند ہوگا، چلو وہاں چلتے ہیں۔“

”اگر تم پسند کرو تو میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں؟“

”نہیں نہیں۔ اب میں بالکل ٹھیک ہو گئی ہوں۔“ اس کی پلکوں تلے صاف شفاف نیلی آنکھیں جھانکتے لگیں اور وہ مسکرا دی۔

ہم تو لیزر کے باغات میں سے چلتے ہوئے پھولوں کے بازار میں آ گئے، جہاں سے کل صبح ہم نے مچھلیاں پکڑنے کا سامان خریدا تھا۔ پھولوں کے کھوکھے بند ہو چکے تھے اور پورا بازار ویران پڑا تھا۔ بازار کے دونوں طرف درختوں کی قطاریں تھیں جن کے سوکھے ہوئے پتے ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ ایک کھوکھے کے باہر چند ٹوٹی ہوئی کرسیاں پڑی تھیں۔ ہم دونوں وہاں بیٹھ گئے۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ آٹھ بجنے کو تھے اور مجھے بہر صورت دس بجے تک شیش پر پہنچ جانا چاہئے تھا۔

”پاسکل“ میں نے اُس کی ٹھوڑی تلے اُلٹی رکھ کر اس کے خوبصورت چہرے کو اپنی جانب کیا ”مجھے تم سے ایک ضروری بات کہنا ہے۔ بشرطیکہ تم....“

”تم جارہے ہو؟“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور میرا ہاتھ پرے کر کے سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

”لیکن تمہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا؟“ میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”لوگوں کے رویے نے مجھے ایک ایسی حس عطا کر دی ہے کہ جب بھی کوئی مجھے چھوڑنا چاہتا ہے میں جان جاتی ہوں۔ تم آج صبح سے ہی مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔“

”پیرس سے سان سباستیان ہسپانیہ کے لیے گاڑی ساڑھے دس بجے روانہ ہوتی ہے۔“ میں احساسِ ندامت تلے دبے جا رہا تھا۔ ”پاسکل سوچو تو سہی مجھے آخر ایک روز تو یہاں سے جانا ہی تھا۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو مگر میں یہ کیسے سوچ سکتی تھی کہ تم نے ایک روز پیرس سے چلے جانا ہے۔ تم سیاح ہو اور کسی قسم کے بندھنوں کو برداشت نہیں کر سکتے اور پھر اپنا بیچ بندھنوں کے۔ میں نے ساری عمر ایک مفروضہ مجرم کی مانند لوگوں سے چھپ کر گزاری ہے۔ میرے لیے کسی پر بھروسہ کرنا ممکن نہ تھا۔ میں نے اپنی ایک علیحدہ دنیا بنالی جس میں صرف خوابوں کے لوگ بستے تھے۔ تم نے مجھے خواب کی اس دنیا سے نکال کر باہر لا کھڑا کیا۔ اور اب.... اب میں ایک مرتبہ پھر اپنے آپ کو بے بس اور اپنا بیچ محسوس کر رہی ہوں۔ مجھے لوگوں کی نظروں سے چھپ کر رہنا ہوگا۔“ پاسکل کی آنکھیں بالکل خشک تھیں اور وہ بڑے اطمینان سے باتیں کر رہی تھی۔

”تم اب کبھی خوابوں کی اس دنیا میں واپس نہیں جاؤ گی۔“ میں نے اُس کا خشک ہاتھ تھامتے ہوئے کہا ”تم نے دیکھ لیا ہے کہ کوئی بوڑھی عورت کھسر پھسر نہیں کرتی اور کسی لڑکی نے بھی....“

”تم نہیں دیکھ رہے تھے مستنصر! مجھے تو اُن کی نگاہوں کی سونیاں چھب رہی تھیں اور یہ سونیاں میرا مقدر بن چکی ہیں۔ میری سونیاں نکالنے کے لیے اب کوئی شہزادہ نہیں آئے گا۔“

ایک مرتبہ پاسکل نے مجھ سے کہا تھا کہ میرے پاس اس کے ہر اعتراض کا جواب موجود ہے۔ مگر اس وقت میں لا جواب ہو چکا تھا۔

”چند ہفتوں میں موسم سرما شروع ہو جائے گا اور مجھے ہر حالت میں اس سے پہلے ترکی عبور کر کے وطن کی راہ لینی ہے ورنہ راستے میں برف گرنی شروع ہو جائے گی۔“ میں نے نظریں جھکا لیں۔ جانے کیوں مجھے اپنے رویے پر شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ میرا اپنا ذہن میری باتوں کی نفی کر رہا تھا۔

”موسم سرما شروع ہو جائے گا تو کیا ہوا آخراں کا اختتام بھی تو ہوگا اور پھر تم موسم بہار میں واپس وطن لوٹ جانا۔“ اس نے التجا کی۔

پاسکل بیچ کے پرانے روغن کو ناخنوں سے کھرچتی رہی اور خاموش بیٹھی مجھے تکتی رہی جیسے میرے دل کی آواز کی منتظر ہو۔

”موسم سرما کی آمد تمہاری نسبت میرے لیے زیادہ اذیت ناک ہے۔“ مجھے خاموش پا کر اُس نے کہنا شروع کیا۔ ”خزاں کے شروع میں میرے ٹخنے کا درد اور بھی شدت اختیار

کر جائے گا۔ تب تو اک ذرا سی حرکت سے ہی میرے تمام بدن میں ٹیسیں اٹھنا شروع ہو جاتی ہیں اور میں اپنے کمرے میں قید ہو کر رہ جاتی ہوں۔ دریائے سین کے کنارے اکیلی بھی نہیں گھوم سکتی۔ جب خزاں کا آخر ہوگا تو میں کمرے کی کھڑکی میں بیٹھی نیچے سڑک پر شاہ بلوٹ کے سرخ پتوں کو گرتے دیکھ کر تمہیں یاد کیا کروں گی اور میرا درد قدرے کم ہو جائے گا۔“ اس نے آہستگی سے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر لمبوں سے چھوا اور بچے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں تمہیں ٹیکسی پر گھر چھوڑ آتا ہوں۔“ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

”نہیں نہیں“ اس نے بچوں کی طرح انکار میں بار بار سر ہلایا ”میں ابھی دریائے سین کے کنارے جانا چاہتی ہوں“ تاکہ مجھے ایک مرتبہ پھر اکیلی گھومنے کی عادت ہو جائے۔“ اس نے ایک لمحہ کے لیے اپنی نیلی آنکھیں مجھ پر جمادیں۔ اور پھر مڑ کر چلنا شروع کر دیا۔ وہ بری طرح لنگڑا رہی تھی۔ کھوکھوں کی خالی قطاروں کے درمیان پاسکل کا گھسٹا ہوا پاؤں سوکھے پتوں کو سمیٹتا چلا جا رہا تھا۔ بازار کے آخر میں پہنچ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رُکی اور پھر پیچھے دیکھے بغیر دائیں ہاتھ دریا کو جاتی ہوئی سڑک کی طرف مڑ گئی۔

میں ہوٹل واپس پہنچا تو میری آنکھیں جل رہی تھیں اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرا سارا جسم آگ میں جھونک دیا گیا ہو۔ میں نے اپنا سامان باندھا اور بل ادا کر کے ایک ٹیکسی کے ذریعے سٹیشن پر آ گیا جہاں پلیٹ فارم پر ہسپانیہ جانے والی گاڑی تیار کھڑی تھی۔ میں نے ڈبے میں اپنا سامان رکھا اور گاڑی کے دروازے کے ساتھ لگ کر پلیٹ فارم کے آخر میں واقع سٹیشن میں داخل ہونے والے دروازے پر نظریں جمادیں۔ پلیٹ فارم پر بیٹھا لوگ جمع تھے جن میں سے اکثر اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو الوداع کہنے آئے تھے۔ برقی روشنیوں نے پورے سٹیشن کی تاریکی کو چمکتی ہوئی صاف روشنی میں بدل دیا تھا اور یہ گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ رات کے دس بجے ہیں۔ سرزمین اُنڈلس کی جانب سفر کرتے ہوئے میرا دل خوشی سے معمور ہونا چاہئے تھا، لیکن جانے کیوں اُس ڈور میں جھول آچکا تھا جس نے مجھے اب تک مضبوطی سے غرناطہ کے ایوانوں اور قرطبہ کی محرابوں سے باندھے رکھا تھا۔ میرے ذہن میں صرف پاسکل کا بھولا بھالا اور غمگین چہرہ ابھرتا اور ڈوب جاتا جیسے وہ خیالوں میں بھی لنگڑا رہی ہو۔ انگلستان سے فرانس آتے وقت سینٹر کے

عرشے پر ٹھہرتا ہوا سرخ کوٹ۔ بوئے ڈی بولون میں سین کے کنارے ایک چمکیلا دن اور پھر وینس کا مجسمہ جس نے اُسے رُلا دیا تھا۔ میں انہی خیالوں میں مگن تھا کہ انجن نے وہسل دی اور پلیٹ فارم پر کھڑے مسافر جلدی سے گاڑی میں سوار ہو گئے۔ میری نظریں ابھی تک داخلے کے دروازے پر لگی تھیں۔ میں یہ فیصلہ نہ کر پایا کہ میں وہاں کیوں کھڑا ہوں۔ انجن نے ایک اور وہسل دی اور گاڑی کے ڈبے آہستگی سے ایک مرتبہ آپس میں بھڑک کر حرکت میں آ گئے۔ مسافروں کو الوداع کہنے والے لوگ سٹیشن سے باہر جانے والے دروازے کی طرف جا رہے تھے اور سٹیشن بتدریج خالی ہو رہا تھا۔ میں بھی اپنی نشست پر جانے کے لیے پیچھے ہٹنے کو تھا کہ سٹیشن کے آخر میں لوگوں کے ہجوم کے درمیان مجھے پاسکل کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ لوگوں کو چیرتی اور دونوں ہاتھوں سے انہیں دھکیلتی ہوئی اس انبوہ کثیر کے درمیان راستہ بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں دروازے سے نیچے اتر کر پائیدان پر کھڑا ہو گیا۔ ”پاسکل“ میں نے پوری قوت سے اُس کا نام پکارا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے رُکی اور پھر اُس کی نظریں کھڑکیوں اور دروازوں میں سے جھانکتے ہوئے چہروں پر پھسلتیں مجھ پر آ رکیں۔ اُس نے ایک بھر پور کوشش سے اپنے آپ کو اس ریلے سے آزاد کیا اور پھر خالی پلیٹ فارم پر میری طرف دوڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنی رات کوختی سے دبائے ہوئے بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی اور اُس کا دوسرا ہاتھ اُس کے لمبوں پر جما ہوا تھا۔ وہ بری طرح لنگڑا رہی تھی۔ اگرچہ گاڑی کی رفتار ابھی بے حد آہستہ تھی، مگر ہمارے درمیان فاصلہ بتدریج بڑھتا جا رہا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں اپنا سامان گاڑی میں چھوڑ کر سٹیشن پر کود پڑوں، تاکہ وہ بھاگنے کی اذیت سے بچ جائے۔ اس کا خوبصورت سرخ کوٹ گاڑی کے پیہیوں میں سے خارج ہوتی ہوئی ہوا کے زور سے فضا میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ میں نے دروازے کے ہینڈل کو مضبوطی سے پکڑا اور خطرناک حد تک آگے جھک کر اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا۔ وہ مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی، مگر پیہیوں کی مہیب گڑگڑاہٹ میں اُس کی آواز دب گئی۔ گاڑی کی رفتار اب تیز ہو چلی تھی۔ اس نے اپنی ہتھیلی لمبوں پر رکھ کر ہاتھ میری طرف بڑھایا اس کے آنسوؤں سے تر چہرے پر ایک اذیت ناک احساس کا پرتو جھلک رہا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اسے پکارا ”پاسکل خدا کے لیے دوڑنا بند کر دو“ اور اسی لمحے وہ دھڑام سے پلیٹ فارم پر گر گئی۔ اُس نے نہ تو وہاں سے اٹھنے کی کوشش کی اور نہ ہی میری جانب دیکھا۔ اس کا سرخ کوٹ اس کے گرد ہالہ بنائے ہوئے تھا جس کے

درمیان پاسکل ایک خوبصورت راج ہنس کی مانند بے حس پڑی تھی۔ گاڑی پلیٹ فارم سے نکل کر باہر آئی تو پاسکل گٹھڑی بنی ایک نئی نویلی دلہن کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کا چہرہ مدہم ہو کر سرخ کوٹ میں مدغم ہو گیا۔ پھر سرخ کوٹ رات کی تاریکی میں جذب ہو کر ایک نقطے کی صورت اختیار کر گیا اور بالآخر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

دوسری طرف پاکستان تھا

ساری رات ہماری گاڑی فرانس کے وسیع میدانوں اور جنگلوں میں دوڑتی رہی۔ میرے ڈبے میں سوار تمام مسافر گہری نیند سو رہے تھے، مگر میں بدستور اس دہنس کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اپنے معبد سے نکل کر اپنا بیج ہو گئی تھی۔ جس نے اپنے کٹے ہوئے بازوؤں کے غم میں اپنے آپ کو دنیا سے کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ میں نے اپنے گرد ڈبے کے کمینوں کا جائزہ لیا۔ ایک غلیظ ہسپانوی مزدور ایک فرانسیسی جوڑا دورا ہائیں اور ایک گٹھے ہوئے جسم کی نوجوان عورت جس کا سر نیند کی مدہوشی میں میرے شانے کے ساتھ آ لگا تھا۔

صبح سورے ہسپانیہ کا پہلا شہر سان سباستیان آیا۔ میڈرڈ کے بعد سفر اُندلس شروع ہوا۔ قرطبہ اشبیلیہ اور غناطہ۔ میرے نقشے پر کھینچی ہوئی سرخ لکیروں کا اختتام ہوا اور وطن کو واپسی کا آغاز۔ ایک مرتبہ پھر فرانس اور سوئٹزرلینڈ سے گزر ہوا اور پھر میں آسٹریا سے اور ہینٹ ایکسپریس پر سوار ہو کر میں استنبول پہنچ گیا۔ استنبول اور وطن کی راہ میں ارض روم پڑتا تھا۔ جہاں میں اس وقت شیفیتہ مدر سے کے بوسیدہ مینار تلے کھڑا اپنے اس طویل سفر کی یادوں میں کھویا ہوا تھا۔ جہاں کاکیشیا سے آنے والی تیز ہوائیں سرد تر ہو چلی تھیں۔ چند روز تک سردی اور شدید ہوجائے گی اور پھر..... پھر برف گرے گی۔ سردیاں شروع ہو جائیں گی۔ پاسکل نے مجھے کہا تھا ”سردیاں شروع ہو جائیں گی تو کیا ہوا؟ بالآخر ختم بھی تو ہو جائیں گی۔ تم موسم بہار میں واپس وطن لوٹ جانا“ کاش میں اس کا کہنا مان لیتا۔ لیکن میں تو سیاح ہوں اور سیاح کسی قسم کے بندھنوں کو برداشت نہیں کر سکتا اور پھر اپنا بیج بندھنوں کو؟

ارض روم! جہاں اکتوبر کا آخر تھا اور سٹیشن سے شہر جانے والی سڑک کے گرد شاہِ بلوط کے پتے سرخ ہو ہو کر گرنے شروع ہو گئے تھے۔ یہاں سے ہزاروں میل دور پیرس کی ایک ویران سڑک پر بھی اس وقت شاہِ بلوط کے پتے سرخ ہو کر گر رہے ہوں گے اور پانچ پاسکل اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی ان خزاں رسیدہ پتوں کو دیکھ رہی ہوگی۔ وہ کہتی تھی ناکہ ان سوکھے ہوئے پتوں کو دیکھ کر میں تمہیں یاد کر لیا کروں گی اور میرا درد قدرے کم ہو جائے گا۔

میں نے سراٹھا کر مینار کی طرف دیکھا۔ بارش تھم چکی تھی۔ میں نے سلجوق شہزادی کے مدفن کے پہلو میں کھڑے ہو کر ایک سرد اور بھیگی ہوئی دوپہراپنے پورے سفر کی یادیں سمیٹنے میں گزار دی تھی۔ اب شام ہو چکی تھی۔ سڑک پر حسب معمول چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ لیکن ایک ٹھہراؤ تھا، شور نہیں تھا۔ بھوک کی چمک اب غائب تھی۔ مریچکی تھی۔ میں پتلون کی خالی جیبوں میں ہاتھ ڈالے واپس ہوٹل کی طرف چل دیا۔ راہداری کے شروع میں ہوٹل کے بوڑھے مالک کا کمرہ تھا۔ میں سر جھکائے پاس سے گزرنے لگا تو اس نے آواز دی ”مستنصر پاشا“ میرے قدم وہیں رُک گئے۔ وہ اب ضرور کرایہ مانگے گا۔ میں ڈرتے ڈرتے کمرے میں داخل ہوا تو اس کے سامنے میز پر ایک پوٹلی پڑی تھی۔ میرے کپڑوں کی پوٹلی۔

”ابھی ابھی سٹیشن سے کسٹم کا ایک سپاہی دے گیا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ یہ کپڑے صبح کی گاڑی پر ہی آگئے تھے مگر مزدوروں کی سستی کی وجہ سے اب تک ڈبے میں ہی پڑے رہے۔“ میں نے جلدی سے پوٹلی کھول کر دیکھی۔ سب کچھ موجود تھا۔

”چائے پیو گے؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ مجھے بے حد بھوک لگی تھی۔

اُس نے پاس رکھی چینک میں سے شیشے کے پتلے گلاس میں چائے انڈیل کر گلاس مجھے

تھما دیا۔

”بسکٹ؟“ اُس نے پلیٹ آگے کر دی۔

میں نے دو بسکٹ یکشت منہ میں ڈال کر نگل لیے۔ بسکٹ میرے خالی پیٹ میں یوں گرے جیسے کسی گہرے کنویں میں پتھر۔ میں نے ہاتھ روک لیا۔ جانے ہوٹل کا مالک میرے بارے میں کیا سوچتا ہوگا۔ میں نے پوٹلی بغل میں دبائی اور اُس کا شکر یہ ادا کر کے اوپر کمرے میں آ گیا۔

دوسری صبح میں ارض روم کے مرکزی بینک کے سامنے چوڑے فٹ پاتھ پر کپڑوں کی دکان سجائے بیٹھا تھا۔ اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ میں نے کل صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا اور پھر مجھے وطن واپس جانے کے لیے کرایہ بھی تو درکار تھا۔ مطلع آج پھر آبرآلود تھا۔ کوہِ دُھند پر بادل گہرے ہو رہے تھے۔ شاید آج شام تک برف گرنی شروع ہو جائے۔ بسوں کے اڈے کی جانب سے نوجوان سیاحوں کی ایک ٹولی برآمد ہوئی۔ اُن میں سے اکثر نے صرف کرتے اور پاجامے پہن رکھے تھے۔ شاید وہ ہندوستان سے واپس آ رہے تھے۔

”یہ سوئٹر بیچو گے؟“ ان میں سے ایک لڑکی میرے پاس فٹ پاتھ پر بیٹھ گئی۔ ”کیوں نہیں۔“ میں نے جلدی سے سوئٹر اٹھا کر لڑکی کے شانوں پر رکھ دیا۔ ”سو فیصد خالص اُون۔ ریجنٹ سٹریٹ لنڈن۔ صرف دس ڈالر۔“

لڑکی نے نرم اور گرم سوئٹر کو گالوں سے رگڑا اور پھر اپنے لمبل کے کرتے پر ہاتھ رکھ کر بولی ”پانچ ڈالر۔“

”منظور۔“ میں نے ہتھیلی آگے کر دی۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے سوئٹر پہن لیا اور جیب سے پانچ ڈالر کا ایک نوٹ نکال کر مجھے تھما دیا۔ اس لڑکی کو وہاں بیٹھے دیکھ کر دوسرے سیاح بھی رُک گئے۔ تھوڑی دیر میں میرے تمام کپڑے بک چکے تھے اور میری جیب میں پورے چالیس ڈالر تھے۔ سب سے پہلے ایک نزدیکی قبوہ خانے میں جا کر شیش کباب روٹی، سوئیاں اور جانے کیا کیا کھایا اور پھر بسوں کے اڈے کا رُخ کیا۔ میں ابھی ایران کی سرحد تک جانے والی بس کے بارے میں دریافت کر رہی رہا تھا کہ ایک جہاز نما یورپی بس اڈے میں داخل ہوئی۔ بس کی پیشانی پر ”پیرس سے کابل“ کے الفاظ لکھے تھے۔ ڈرائیور پٹرول ڈلوآنے کے لیے نیچے اترتا تو میں نے یوں ہی پوچھ لیا ”کوئی نشست خالی ہے؟“

”ہاں ایک نشست خالی ہے۔“ اس نے پٹرول کی ٹینکی کا ڈھکن اتارتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔ ”ایک بوڑھا سیاح انقرہ میں حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گیا تھا۔ چالیس ڈالر۔“

”تیس ڈالر! ہاں!“ میں نے جیب سے نوٹ نکال کر اپنی دونوں ہتھیلیوں پر پھیلا کر

اُسے دکھائے۔ ”میرے پاس صرف چالیس ہی تو ہیں۔“

”میں بھی تو چالیس ہی مانگ رہا ہوں۔“ اس نے اکتاہٹ سے کہا۔

”راستے میں بھوک بھی تو لگے گی نا!“ میں نے لجاجت سے کہا۔

وہ ہنس دیا ”ٹھیک ہے“ اس نے میری ہتھیلی میں سے تیس ڈالر اٹھالیے۔ ”بیٹھ جاؤ۔“

”ابھی آیا“ میں نے چٹکی بجائی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ ہوٹل آ کر کرایہ ادا کیا۔ اپنا سفری

تھیلہ کا ندھے پر اٹھایا اور واپس آ کر بس میں سوار ہو گیا۔ بس کی آرام دہ نشست پر بیٹھتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا سفر ختم ہو گیا ہو۔

ارض روم سے بس چلی۔ نوح کا پہاڑ آرات دُھند میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ رات تبریز میں گزری۔ دوسری شب ہم تہران میں تھے۔ تیسرے روز مشهد میں ایک مرتبہ پھر امام رضا کے روضے کے سنہری گنبد نظر آئے۔ چوتھی صبح ہرات کے باہر بیقارہ مدرسہ کے سربریدہ میناروں نے ہمارا استقبال کیا۔ ہندوکش کا عظیم سلسلہ کوہ سامنے آیا تو ہمیں ارض روم سے روانہ ہوئے پورے پانچ دن ہو چکے تھے اور ہماری بس کابل کے بسوں کے اڈے میں داخل ہو رہی تھی۔ میں اپنا سامان اٹھا کر نیچے اترا تو میرے سامنے ایک جانی پہچانی بس کھڑی تھی۔

”آریو گونگ ٹو پشاور سر؟“ پاکستانی بس کے گورے چٹے کنڈیکٹر نے شستہ انگریزی میں مجھ سے پوچھا۔

”آہوجی“ میں نے بوکھلا کر خالص موچی دروازے کے لہجے میں جواب دیا۔ دریائے کابل کے ساتھ ساتھ پرچہ سڑک پر بس لڑھکتی ہوئی طورخم جا رہی تھی۔ دوسری طرف پاکستان تھا۔